پیغمبر اسلام ﷺ اور تجارت

مؤلّف
جناب حکیم محمود احمد ظفر

بیت العلوم
۲۰- نابھہ روڈ، پرانی انارکلی لاہور۔ فون: ۷۳۵۲۴۸۳

پیغمبر اسلام ﷺ
اور
تجارت

پیغمبرِ اسلام ﷺ اور تجارت

مؤلف

جناب حکیم محمود احمد ظفر

بیت العلوم

ہیڈ آفس: ۲۰ - نابھہ روڈ چوک پرانی انار کلی - لاہور فون: 7352483

برانچ: دکان نمبر ۱۴ الحمد مارکیٹ غزنی سٹریٹ ۴۰ اُردو بازار لاہور فون: 7235996

www.baitululoom.com

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم



کتاب

پیغمبرِ اسلام اور تجارت

مؤلف

جناب حکیم محمود احمد ظفر

باہتمام

مولانا محمد ناظم اشرف

ناشر

بیت العلوم

ہیڈ آفس ۲۰ نابھہ روڈ چوک پرانی انارکلی لاہور فون 7352483
برانچ دکان نمبر ۱۰ محمد مارکیٹ غزنی سٹریٹ اردو بازار لاہور فون 7235096
www.baituluioom.com

فہرست

﴿تقدیم﴾

جناب رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

﴿طلب الحلال فريضة بعد الفريضة﴾

[مجمع الزوائد: ۱۰/۳۷۷، معجم کبیر طبرانی رقم ۱۸٦۰۸]

''حلال روزی طلب کرنا فرائض کے بعد ایک فریضہ ہے۔''

حلال روزی کئی طریقوں سے کمائی جاسکتی ہے۔ زراعت سے بھی، محنت مزدوری اور ملازمت سے بھی اور تجارت سے بھی، لیکن سوال یہ ہے کہ ان میں افضل ذریعہ معاش کون سا ہے؟ بعض نے زراعت کو افضل کہا ہے اور بعض نے اجارہ کو اور اکثریت کی رائے یہ ہے جس میں امام شافعیؒ اور فقہائے احناف بھی شامل ہیں، کہ تجارت سب سے افضل ذریعہء معاش ہے۔ سیدنا عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے بھی فرمایا ہے کہ

﴿عليكم بالتجارة، لاتفتنكم هذه الحمراء علىٰ دنياكم﴾ [التراتيب الاداريه: ۳/۲۰]

''تجارت کو اختیار کرو۔ یہ سرخ لوگ یعنی عجمی غلام تمہاری اس دنیا پر تمہارا امتحان نہ بن جائیں۔''

رسول اللہ ﷺ نے خود تجارت فرمائی، شراکت پر بھی مضاربت پر بھی۔ آپ کے خلفاء کی اکثریت تجارت کرتی تھی۔ سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ تو زمانہ جاہلیت میں بھی ایک معروف تاجر تھے۔ رسول اللہ ﷺ کی موجودگی میں آپ (سیدنا ابوبکرؓ) بصریٰ تجارت کے لیے تشریف لے گئے اور رسول اللہ ﷺ کا عاشق زار ہوتے ہوئے بھی تجارت کے لیے گئے اور چند دنوں کے لیے آپ کی جدائی کو مشکل سے برداشت فرمایا۔ ابن سعد نے طبقات میں لکھا ہے کہ سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ خلیفہ ہوئے تو دوسرے روز بجائے امور خلافت نمٹانے کے لیے دربار خلافت میں جاتے، آپ ہاتھ پر کپڑے کے تھان رکھے بازار کی

طرف جانے کے لیے نکلے۔ اتفاقاً سیدنا عمر رضی اللہ عنہ اور سیدنا ابوعبیدہ بن الجراح رضی اللہ عنہ نے دیکھ لیا۔ انہوں نے آپ کو کھڑے کر کے عرض کی کہ آپ کے کاندھوں پر کل خلافت کا بار ڈالا گیا ہے اور آپ بازار تجارت کے لیے تشریف لے جا رہے ہیں، یہ امور خلافت کون نمٹائے گا اور آپ امور خلافت کے بار دوش سے کیسے سبک دوش ہوں گے؟ سوال ان دونوں حضرات کا بھی درست تھا اور ابوبکر رضی اللہ عنہ بھی جس مقصد کے لیے کپڑے کے تھان لے کر بازار جا رہے تھے، وہ بھی صحیح تھا کیوں کہ ان کے کاندھوں پر بھی تو پورے خاندان کی کفالت کا بوجھ پڑا ہوا تھا، اس سے سبک دوش ہونا بھی ایک دینی فریضہ تھا۔ چنانچہ ان دونوں کے سوال کا جواب سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ نے یہی دیا کہ پھر میں اپنے اہل وعیال کو کہاں سے کھلاؤں گا اور ان کی ضروریات زندگی کو کیسے پورا کروں گا؟ ان دونوں حضرات نے یہ جواب دیا کہ آپ امور خلافت کو نمٹائیں اور ہم آپ کے اہل وعیال کے لیے روزینہ مقرر کر دیں گے۔

بعض روایات میں ہے کہ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ بھی تجارت کرتے تھے۔ اگرچہ آپ نے بچپن میں اونٹ بھی چرائے، چنانچہ ایک مرتبہ اپنے زمانہ خلافت میں سیدنا عمر رضی اللہ عنہ ایک ایسی جگہ سے گزرے جہاں درختوں کا جھنڈ تھا اور جسے ضجنان کہتے تھے۔ آپ نے اسے دیکھ کر فرمایا: ”مجھے وہ وقت یاد آ گیا ہے جب میں یہاں اپنے باپ خطاب کے اونٹ چرایا کرتا تھا۔ ان کا دل نہایت سخت تھا۔ میں کام کرتا تو تھکا مارتے اور کوتاہی کرتا تو مجھے سخت سزا دیتے، اور ایک یہ دن ہے کہ میرے اور اللہ کے درمیان کوئی (حاکم) نہیں۔

لیکن آپ نے پھر تجارت بھی کی۔ قریش کے اکثر لوگ تجارت پیشہ تھے۔ تاریخ کے اوراق کی ورق گردانی سے اس بات کا بخوبی پتہ چلتا ہے کہ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ بھی ایک تاجر تھے اور آپ دیبا وحریر اور ریشم کی تجارت کرتے تھے۔ تجارت میں آپ کے شریک کار کعب بن عدی التنوخی تھے۔ آپ نے نہایت غور وفکر کے بعد تجارت میں قدم رکھا تھا۔ آدمی کے کاروبار سے بھی اس کی افتاد طبع اور فطری مذاق کا پتہ چلتا ہے۔ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے ریشمی کپڑوں کی جو تجارت شروع کی، اس سے ان کی طبعی نفاست کا پتہ چلتا ہے۔ ریشم کے پارچہ

جات چونکہ خوب صورت، نفیس اور قیمتی ہوتے ہیں، اسی وجہ سے اہل جنت کا لباس بھی حریر و ریشم کا ہوگا۔ چنانچہ قرآن حکیم میں ہے:

﴿وَ لِبَاسُهُمْ فِيهَا حَرِيرٌ﴾ [حج: ۲۳]

''اہل جنت کا لباس جنت میں حریر اور ریشم کا ہوگا۔''

مکہ میں مختلف لوگ مختلف چیزوں کی تجارت کرتے تھے۔ سیدنا سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ اور سیدنا عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ گوشت اور لوہے کی تجارت کرتے تھے۔ عرب میں کسی بھی کاروبار میں کوئی عار نہ سمجھی جاتی تھی (اور اسلام کا بھی یہی اصول ہے۔) بلکہ ہر کام ان کے نزدیک باعث عز و شرف تھا۔ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کا اس معاشرہ میں دیبا اور ریشم کے کپڑوں کا کام کرنا ان کی طبیعت کی نفاست، ہوش مندی، دور بینی اور احتیاط پسندی کی غمازی کرتا ہے۔ آپ ایک طرف تو صاحب شمشیر و سنان تھے اور جنگی مہارت و قابلیت میں نہایت اعلیٰ تھے، اور دوسری طرف ریشم کی طرح نرمی بھی آپ کی طبیعت میں موجود تھی جس کا اظہار کئی موقعوں پر ہوا۔ چنانچہ جب مسلمانوں کی امارت کی ذمہ داری ان کو سونپی گئی تو آپ نے سب سے پہلی دعا جو بارگاہ رب العزت میں مانگی، وہ کچھ یوں تھی:

''اے اللہ! میں سخت ہوں مجھے نرم کر، اے اللہ! میں کمزور ہوں مجھے طاقت دے، اے اللہ! میں بخیل ہوں مجھے سخی بنا دے۔''

مختصر یہ کہ آپ ایک بہترین تاجر بھی تھے۔ چنانچہ کئی محدثین نے سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کا یہ قول نقل کیا ہے کہ جہاد فی سبیل اللہ کے علاوہ اور کوئی موقع ایسا نہیں جس میں مجھے موت آجانا اس سے زیادہ محبوب ہو کہ میں اپنی محنت اور کوشش سے روزی طلب کر رہا ہوں، یعنی اس موقع پر موت آجانا جہاد کے علاوہ اور تمام مواقع سے بہتر ہے۔

سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ بھی ایک بہت بڑے تاجر تھے۔ ان کے تاجر ہونے کو تو ہر شخص بخوبی جانتا ہے۔ وہ زمانہ جاہلیت اور زمانہ اسلام دونوں میں تاجر تھے۔ (تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو ہماری کتاب سیرت سیدنا عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ)

عشرہ مبشرہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی اکثریت تاجر تھی۔ جس سے پتہ چلتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ اور آپ ﷺ کے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم تجارت کو پسند کرتے تھے اور روزی کمانے کے اس ذریعہ کو افضل اور قابل ترجیح خیال کرتے تھے جس کی تفصیل کتاب میں دی گئی۔

یہاں یہ بات بھی ذہن میں رہے کہ اسلام ایک دین ہے مذہب نہیں ہے، اور دین انسانی زندگی کا پورا ضابطہ حیات (Complete Code of Life) پیش کرتا ہے۔ اس وجہ سے اس کا اپنا ایک نظام اقتصاد و معیشت ہے۔ لیکن موجودہ زمانہ میں سرمایہ دارانہ نظام پوری دنیا پر چھایا ہوا ہے۔ اس نظام معیشت میں سرمایہ داروں کے دلوں میں رحم اور شفقت کے جراثیم مر چکے ہوتے ہیں۔ اس میں سرمایہ دار کی زندگی کا مقصد وحید صرف مال کمانا ہوتا ہے، خواہ وہ ہیروئن فروخت کر کے مال کمائے یا نائٹ کلب کھول کر روپیہ کمائے یا قتل و غارت کا بازار گرم کر کے اپنی حرص کے تنور شکم کو بھرے۔ پھر زر و مال ہر وقت ہر خرابی ساتھ لاتا ہے جو اس کا خاصہ ہے۔ رعونت و نخوت کے جذبات دماغ میں لاتا ہے اور حرص و آز کے خون خوار جذبات کو جنم دیتا ہے تاکہ وہ بے زر لوگوں کا خون چوس کر ان کو مزید بے زر بنا دے۔ اس سرمایہ دارانہ نظام حکومت نے جس کی آج پوری دنیا شیدائی بنی ہوئی ہے اور جمہوریت بھی اسی سرمایہ دارانہ نظام کی ایک فرع ہے جس کو آج عراق اور افغانستان میں رائج کرنے کے لیے گاجر مولی کی طرح انسانوں کو کاٹا جا رہا ہے۔ اس کی ایک خاص خصوصیت یہ ہے کہ اس میں معاشرہ کی ساری دولت اور تمام مال و زر دولت مندوں اور اوپر کی سوسائٹی کے لوگوں کے ہاتھوں میں مرتکز ہو جاتا ہے جس کی وجہ سے عوام الناس، کاشت کار، ہاری، مزدور اور دست کار روز بروز قلاش اور مفلس ہوتے چلے جاتے ہیں اور ان کی جیبوں کی ساری دولت کھینچ کر دولت مندوں اور مال داروں کی تجوریوں میں چلی جاتی ہے، اور غریب امیروں کی عیش و عشرت کے لیے ڈھور ڈنگروں کی طرح سارا دن کام کرتا رہتا ہے لیکن اس کا چولہا صبح سے اور چراغ شام ہی سے بجھا رہتا ہے۔ اور ملک کے کارخانے دن رات کپڑا بنتے ہیں لیکن غریب کی بیٹیاں تار تار کو ترستی رہتی ہیں۔ زمینیں غلہ اگلتی ہیں لیکن

غریب کے بچے رات کو بھوکے پیٹ سوتے ہیں۔

اس نظام معیشت کے مقابلہ میں اسلام نے اپنا ایک نظام معیشت و اقتصاد دیا ہے جس کی تفصیل ہم نے اپنی کتاب ''معیشت و اقتصاد کا اسلامی تصور'' میں دی ہے۔ لیکن مغربی طاقتیں اس نظام کو نافذ نہیں ہونے دے رہیں۔ سرمایہ دارانہ نظام معیشت نے تجارت میں جو خرابیاں پیدا کی ہوئی ہیں، اجمالی طور پر ہم نے ان کو بھی بیان کیا ہے۔

مغربی معاشیات میں انسان دوسرے جانوروں کی طرح ایک جانور اور حیوان ہے جو اپنے جبلی داعیوں کے تحت اعمال حیات انجام دیتا ہے، لہٰذا جو اصول و قوانین دوسرے حیوانات اور جانوروں پر لاگو ہوتے ہیں وہی قوانین ایک انسان کی زندگی پر بھی لاگو ہوتے ہیں۔ اس کے برعکس اسلامی معاشیات میں انسان کے بارے میں یہ تصور نہیں ہے کہ وہ دوسرے حیوانوں کی طرح ایک حیوان ہے بلکہ اسلام کے نظام معیشت میں انسان کے بارے میں تصور یہ ہے کہ انسان اس دنیا میں اللہ کا خلیفہ ہے۔ یہ بندر جیسے حیوان سے ترقی کر کے انسان نہیں بنا بلکہ اللہ تعالیٰ نے خاص اہتمام سے اس کو انسان ہی پیدا کیا اور اس کی فطرت میں اپنی پاکیزہ روح پھونکی۔ اس وجہ سے اس کائنات ارضی میں اس کا مرتبہ اور مقام دوسری تمام مخلوق سے اعلیٰ اور ارفع ہے۔ اسے دنیا میں اپنے خالق کی مرضیات اور احکامات نافذ کرنے کے لیے بھیجا گیا ہے، اس لیے اسے روٹی اور روزی کے لیے ذلیل نہیں کیا جا سکتا اور نہ ہی غلامی کی زنجیروں سے اسے جکڑا جا سکتا ہے۔

اس کے ساتھ ساتھ یہ چیز بھی ذہن میں رہے کہ مغربی اور غیر اسلامی معاشیات میں جس کا موجودہ دنیا میں اکثر و بیشتر بلکہ تمام ممالک میں چلن ہے، حیوانی انسان کے اندر ایک معاشی انسان (Economic Man) کی موجودگی کا تصور دیتی ہے جس کی فطرت کا خمیر خود غرضی، حرص و آز اور خود پرستی سے تیار ہوا ہے۔ اپنی اس جبلت اور فطرت کی وجہ سے یہ معاشی انسان ہر معاملہ میں اپنے ذاتی مفاد کے لیے کوشاں اور اپنے وسائل سے زیادہ سے زیادہ تسکین حاصل کرنے اور زیادہ سے زیادہ منافع کمانے کے لیے سرگرم اور بے قرار رہتا

ہے۔ اس کے قوائے عملیہ جلب منفعت و مسرت اور دفع مضرت والم کے احساسات کے تحت حرکت کرتے ہیں۔ انسانی فطرت کا یہ تصور معاشرہ کے افراد میں خود غرضانہ، مفاد پرستانہ اور زیادہ سے زیادہ جلب منفعت کے احساسات کو جنم دیتا ہے اور ایثار، ہم دردی، رحم دلی اور باہمی معاونت کے جذبات سے ایک انسان کو یک قلم محروم کر دیتا ہے۔ جس نظام کے تحت انسان کے ان جذبات واحساسات اور اس کو معاشی اور حیوانی انسان سمجھتے ہوئے معاملہ کیا جائے، اس نظام کو سرمایہ دارانہ نظام کہا جاتا ہے۔

سرمایہ دارانہ نظام کا بنیادی ستون جس کے ذریعہ یہ نظام غریبوں کا خون نچوڑ رہا ہے، وہ سود ہے جو اسلام میں تو حرام ہے لیکن قریباً ہر مسلمان ملک میں اس کو تجارت کا جزو لاینفک بنا دیا گیا ہے۔ اس پر بھی ہم نے اس کتاب میں اجمالی طور پر بحث کی ہے۔ سمجھا یہ جاتا ہے کہ سودی کاروبار اور تجارت سے ملک کی دولت میں ترقی ہوتی ہے لیکن یہ محض فریب نظر اور دھوکہ ہے۔ اس لیے کہ قرآن حکیم کا فیصلہ ہے:

﴿يَمْحَقُ اللّٰهُ الرِّبَا وَ يُرْبِي الصَّدَقَاتِ﴾ [بقرہ: ۲۷۶]

''اللہ سود کو مٹاتا ہے اور صدقہ کو بڑھاتا ہے۔''

مختصر یہ ہے کہ نگاہِ شریعت میں تجارت سب سے افضل ذریعۂ معاش ہے لیکن اس کی راہ میں بہت سے خطرات ہیں۔ اس لیے ایک تاجر کے لیے شریعت کے مسائل کا جاننا ضروری ہے۔ چنانچہ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ فرماتے تھے کہ جو خرید و فروخت کے مسائل کو نہ جانتا ہو وہ ہمارے بازار میں نہ بیٹھے۔ چنانچہ ایک مرتبہ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے ایک شخص کو یہ کہہ کر بازار بھیجا کہ جو خرید و فروخت کے احکام کو نہ جانتا ہو اس کو بازار سے نکال دے۔

حضرت امام مالکؒ نے بھی اس شخص کو بازار سے نکلوا دینے کا حکم فرمایا تھا جو احکام نہ جانتا ہوتا کہ مسائل نہ جاننے کی وجہ سے لوگوں کو سود نہ کھلا وے۔ اور کنز العمال میں مرفوعاً نقل ہے کہ ہمارے بازاروں میں صرف وہی آدمی خرید و فروخت کیا کرے جو دینی مسائل جانتا ہو۔

تاتارخانیہ میں فتاویٰ سراجیہ سے نقل کیا گیا ہے کہ کسی شخص کا تجارت میں مشغول

ہونا اس وقت تک جائز نہیں جب تک کہ وہ بیع وشراء کے احکام کو نہ جان لے کہ کیا جائز ہے اور کیا ناجائز ہے؟

امام محمدؒ سے ایک مرتبہ لوگوں نے عرض کیا کہ آپ تقویٰ کے بارے میں ایک کتاب لکھ دیں۔ انہوں نے فرمایا کہ میں نے ''بیوع'' (خرید وفروخت) کے بارے میں ایک کتاب لکھ دی ہے۔ اس کتاب کے مسائل کو ذہن میں رکھتے ہوئے جب کوئی شخص خرید وفروخت کرے گا اور ناجائز اور حرام سے بچے گا تو متقی ہوگا۔ اس کا کسب حلال ہوگا اور عمل اچھا ہوگا۔ [بلوغ الامانی ص۸۲]

مختصر یہ کہ تجارت کے افضل ہونے میں تو کوئی شک نہیں لیکن تجارت کے مسائل کا جاننا بھی ضروری ہے تاکہ صحیح طریقے سے تجارت کر سکے۔ جھوٹ نہ بولے، قسمیں نہ کھائے، کسی کو خرید وفروخت میں دھوکہ نہ دے۔ اگر وہ ان ہدایات پر عمل کرے گا تو قیامت کے روز انبیاء، صدیقین اور شہداء کے ساتھ اٹھے گا جیسا کہ بتایا گیا ہے، لیکن حدیث میں یہ بھی آتا ہے کہ قرب قیامت میں مال ودولت کی حرص کی وجہ سے لوگوں میں حرام وحلال کی تمیز ختم ہو جائے گی اور ہر شخص کا مقصدِ زندگی صرف مال اکٹھا کرنا رہ جائے گا خواہ حلال طریقہ سے اکھٹا ہو یا حرام طریقہ سے، جب کہ اسلام نے مال کے کمانے اور خرچ کرنے دونوں پر پابندی لگائی ہے۔ [ترمذی]

ایک حدیث میں ہے کہ

﴿لیاتین علی الناس زمان، لایبالی المرء بما اخذ المال، أمن حلال أم من حرام﴾ [البخاری: ۳۱۳/۴]

''لوگوں پر ایک زمانہ ایسا آئے گا کہ آدمی اس بات کی کوئی پروا نہیں کرے گا کہ وہ حلال طریقے سے مال کما رہا ہے یا حرام طریقے سے۔''

بہر حال اس کتاب میں پیغمبر اسلام ﷺ کی تعلیمات کی روشنی میں تجارت پر

بحث کی گئی ہے اور موجودہ زمانے میں تجارت میں جو خرابیاں پیدا ہوگئی ہیں، ان پر بھی کچھ تبصرہ کیا گیا ہے۔ شریعت اسلامیہ میں جو خرید و فروخت ناجائز ہے اس کے بارے میں بھی اجمالی طور پر کچھ بیان کیا گیا ہے۔ سود جو اس وقت تمام دنیا کی تجارت پر چھایا ہوا ہے اس پر بھی سیر حاصل تبصرہ کیا گیا ہے۔

امید ہے کہ قارئین کرام اس کتاب کو پڑھ کر ضرور محظوظ ہوں گے اور تجارت کے بارے میں پیغمبر اسلام ﷺ کی تعلیمات کی روشنی میں بہت سے مسائل سے آشنا ہوں گے۔

محتاج دعا: (حکیم) محمود احمد ظفر۔ سیالکوٹ
۲۳ مئی ۲۰۰۷ء / ۶ جمادی الاولی ۱۴۲۸ھ
فون: ۶۱۰۶۹۶۸_۰۳۰۰

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

دور جاہلیت

رسول اللہ ﷺ کی بعثت سے قبل کے دور کو جاہلیت کے دور سے تعبیر کیا جاتا ہے، لیکن دور جاہلیت سے مراد وحشت وحیوانیت کا دور نہیں ہے اور نہ ہی اس سے مراد یہ ہے کہ سرکار دوعالم ﷺ کی بعثت سے قبل عرب قوم وحشی تھی جو تہذیب وتمدن سے ناآشنا اور علم وہنر سے بے بہرہ تھی، نہ اس میں کوئی شرافت تھی نہ سنجیدگی۔ نہ ان کا کوئی خاص ادب تھا اور نہ سلیقہ۔ یہ بات بدوی قبائل کے بارے میں تو کہی جاسکتی ہے اور ایسے پس ماندہ قبائل کسی ملک اور قوم کی تہذیب کا معیار نہیں مانے جاتے۔ بدوی قبائل کے علاوہ مکہ، طائف، تیما اور دومتہ الجندل جیسے شہروں کے متعلق یہ تصور اور یہ خیال سراسر زیادتی ہے۔

اس زمانہ میں دو سپر پاورز (Super Powers) تھیں۔ ایک ایرانی سلطنت اور دوسری بازنطینی حکومت، لیکن تاریخ کے رپورٹر بتاتے ہیں کہ اگرچہ عربوں کے پاس ان کی طرح مضبوط قلعے اور سونے چاندی کے ڈھیر نہ تھے، لیکن صبر واستقلال، پامردی اور استقامت، جفاکشی اور سخت کوشی اور سب سے بڑھ کر گھوڑوں کی پیٹھ اور تلوار ان کا بہترین سرمایہ تھا۔ ان کی اپنی ایک تہذیب تھی، ایک تمدن تھا، ایک ادب تھا اور ایک ثقافت تھی جس کی وجہ سے وہ تمام دنیا میں اپنا ایک مقام رکھتے تھے۔ صرف انہی کو پوری دنیا میں یہ حق حاصل تھا کہ وہ خالص النسل اور محفوظ النسب ہونے کا دعویٰ کریں۔ ان کی عورتیں باعصمت تھیں۔ ان کے نہ صرف اپنے نسب محفوظ تھے بلکہ انہیں اپنے گھوڑوں اور اونٹوں تک کے نسب بھی ازبر تھے۔ نظم ونثر اور خطابت وتقریر میں انہیں تمام دنیا میں ایک امتیاز حاصل تھا، اور دنیا کی کوئی قوم اس بارے میں ان کا مقابلہ نہیں کرسکتی تھی۔ ان کے اونٹ ان کے صحرا کے جہاز تھے اور ریت کے سمندر کے سینہ پر ان کے یہ جہاز رینگتے اور مشرق کی آخری

سرحدوں تک ان کو پہنچاتے تھے۔ ان لوگوں میں اور بھی بہت خوبیاں تھیں جن کا ذکر ہم نے اپنی کتاب ''سیرۃ خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم'' میں کیا ہے۔

حاتم طائی عرب ہی تھا اور اسی معاشرہ کا ایک فرد تھا جس کی جود وسخا آج تک زبان زد خاص وعام ہے۔ حاتم طائی کے علاوہ اور بہت سے لوگ بھی سخاوت میں اپنی مثال نہ رکھتے تھے بلکہ ہر عرب بخل کو سخت ناپسند کرتا تھا۔ چنانچہ عبداللہ بن جدعان سیدنا صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے والد سیدنا ابوقحافہ کا چچازاد بھائی تھا۔ اس کے پاس کھانے کا ایک بہت بڑا برتن ہوتا تھا جو ہر وقت کھانے سے بھرا رہتا تھا۔ وہ اتنا بڑا تھا کہ ایک شترسوار اپنے اونٹ پر بیٹھ کر اس میں سے کھانا کھا سکتا تھا۔ ایک مرتبہ ایک بچہ اس میں گر پڑا اور ڈوب گیا۔ خود سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرمایا کرتے تھے کہ میں عبداللہ بن جدعان کے جفنہ اور کڑاہا کے سایہ میں دوپہر کے وقت بیٹھ جاتا تھا۔ جنگ بدر میں جب ابوجہل قتل ہوا تو جنگ کے اختتام پر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے فرمایا کہ ابوجہل کی لاش کو تلاش کرو۔ فرمایا: ''اس کی نشانی یہ ہے کہ اس کے گھٹنے پر زخم کا نشان ہے کیوں کہ میں اور وہ ابن جدعان کی ایک دعوت میں مزاحم ہوئے تھے۔ میں نے اسے دھکیلا تو وہ گھٹنے کے بل گرا اور اس کا گھٹنہ زخمی ہو گیا۔ اس زخم کا نشان اس کے گھٹنے پر موجود ہے۔

ایک مرتبہ عبداللہ بن جدعان نے دو ہزار بار بردار بھیج کر شام سے گندم، شہد، اور گھی منگوایا، اور ہر رات کعبہ کی چھت پر چڑھ کر اعلان کیا جاتا کہ عبداللہ بن جدعان کی دعوت میں چلے آؤ۔ چنانچہ امیہ بن ابی الصلت نے ایک مرتبہ اس کے بارے میں کہا تھا۔ ان شعروں کا ترجمہ یہ ہے:

> ''اس کا ایک تیز اور تازہ دم اعلان کرنے والا مکہ میں ہے اور دوسرا کعبہ کی چھت پر ہے، آواز دیتا ہے اور بلاتا ہے حوض نما لبریز پیالہ کی طرف جس میں گندم کا آٹا شہد میں مخلوط ہے۔''

[السیرۃ النبویہ لابن ہشام: ۱/۱۱۷]

مہمان نوازی کی ایسی ہی ضیافتوں کے بارے میں ایک عورت فخریہ طور پر اپنے

شوہر کی یہ خصوصیت بیان کرتی ہے:

''اس کے اونٹ ہر وقت اصطبل ہی میں موجود رہتے ہیں، صرف تھوڑے سے اونٹ چراگاہوں میں چرنے کے لیے بھیج دیئے جاتے ہیں۔ یہ اونٹ جیسے ہی باجے کی آواز سنتے ہیں تو انہیں یقین ہو جاتا ہے کہ اب ذبح ہو جائیں گے۔'' [بخاری:۲/۷۸۰]

مطلب اس کا یہ ہے کہ مہمانوں کی ضیافت اور مہمان داری کے لیے ہر وقت اونٹ اصطبل میں بندھے رہتے ہیں تاکہ جب بھی مہمان کے آنے کی دستک ہوتی ہے اور وہ باجے کی آواز سنتے ہیں تو انہیں یقین ہو جاتا ہے کہ انہیں ضرور ذبح کر دیا جائے گا اور مہمانوں کی مہمان داری میں ذرا بھی دیر نہیں ہوتی اور اونٹ چراگاہ سے منگوانے نہیں پڑتے بلکہ گھر کے قریب اصطبل ہی سے پکڑ کر انہیں ذبح کر دیا جاتا ہے۔

عربوں کے ہاں یہ تصور مدتوں سے چلا آرہا تھا کہ اگر زندہ اونٹ کا کوہان پہلے کاٹ لیا جائے تو وہ بہت زیادہ لذیذ ہوتا ہے۔ چنانچہ جونہی ان کے ہاں کوئی مہمان آتا، وہ فوری طور پر اپنے زندہ اونٹ کا کوہان کاٹ کر مہمانوں کے لیے اس کے پارچے یا کباب بنا لیتے۔ بعد میں پھر اس اونٹ کو ذبح کر کے یا تو مہمان کو کھلا دیا جاتا یا پھر اس کا گوشت فقراء میں تقسیم کر دیا جاتا۔ مختصر یہ کہ کوہان کے یہ پارچے اور کباب عربوں کے ہاں بہت مشہور تھے۔ چنانچہ جنگ بدر میں قریش کے جو بڑے بڑے سردار مارے گئے اور بعد میں انہیں بدر کے کنویں میں پھینکا گیا، ایک شاعر نے ان کے مرثیہ میں ان کی اس مہمان داری کی بہت تعریف کی ہے کہ یہ لوگ دعوت کے موقع پر اپنے مہمان کو کوہان کے پارچے اور کباب آبنوس کی کشتیوں میں سجا کر پیش کرتے تھے۔ [بخاری:۱/۵۵۷]

ابو بکر بن شعوب نے ان کے بارے میں کہا ۔

و ماذا بالقلیب قلیب بدر

من الشیزی تتزین بالسنام

وماذا بالقلیب قلیب بدر

من القينات والشرب الكرام

''یعنی بدر کے اس کنویں میں وہ سردار پڑے ہوئے ہیں جن کے ہاں آبنوس کے کشتیاں نما طشت دعوت کے موقع پر مہمانوں کو پیش کیے جاتے تھے جو اونٹوں کے کوہانوں کے گوشت سے آراستہ ہوتے تھے۔

اس بدر کے کنویں میں وہ سردار پڑے ہوئے ہیں جن کے ہاں معززین کے اجتماع میں گانے والیاں اپنے فن کا مظاہرہ کرتیں اور شراب کا دور چلتا تھا۔''

اس قسم کے سینکڑوں اشعار جاہلی شاعری میں موجود ہیں جن سے عربوں کے وصف ضیافت وسخاوت پر روشنی پڑتی ہے۔ اسی طرح کبشہ نامی ایک عورت اپنے خاوند کی تعریف میں کہتی ہے:

﴿زوجی رفيع العماد، طويل النجاد. عظيم الرماد، قريب البيت من الناد﴾ [بخاری: ۲/۷۸۱]

''میرے شوہر کے محل کے ستون بہت بلند و بالا ہیں، وہ بہادر ہے، باوجاہت اور تلوار کا دھنی ہے۔ (مہمانوں کی کثرت آمد کی وجہ سے اس کے چولہوں کی) راکھ کے ڈھیر لگے رہتے ہیں اور قبیلہ کی پنچایت اس کے گھر کے قریب ہی ہے (تاکہ لوگ آسانی کے ساتھ اسے مل سکیں)۔''

اس قسم کے اور کئی واقعات تاریخ کے سینہ میں محفوظ ہیں جن سے صاف پتہ چلتا ہے کہ ان کے ہاں گوشت کے ٹکڑے اور کباب اور کوہان کی چربی دار بوٹیاں کثرت سے مہمانوں کو دی جاتی تھیں۔ چنانچہ دیوان حماسہ میں حجر بن خالد نے اپنی مہمان نوازی کی صورت بیان کرتے ہوئے یہ کہا ہے۔

ندهد بضع اللّحم للباع والندیٰ

و بعضهم تغلی بذم مناقعه

''یعنی ہم سخاوت کی وجہ سے (مہمانوں کے لیے) گوشت کے ٹکڑے کاٹتے ہیں اور بعض لوگوں کی دیگچیاں مذمت کے ساتھ جوش مار رہی ہیں (بخل کی وجہ سے)۔''

و یحلب ضرس الضیف فینا اذا شتا

سدیف السنام تستریه اصابعه

''یعنی جب مہمان موسم سرما میں ہمارے پاس آجائے تو اس کی ڈاڑھ کوہان کی چربی کو نکالتی ہے جس کو اس کی انگلیاں چنتی اور اختیار کرتی ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ ہم مہمان کی خاطر مدارات اس طرح کرتے ہیں کہ کوہان کے پارچے اس کے سامنے رکھ دیتے ہیں، اور جب وہ کھاتا ہے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس کی ڈاڑھیں دودھ دھو رہی ہیں اور کوہان کی اس بوٹی سے دودھ کی دھاریں پھوٹ رہی ہیں۔''

عربوں کے ہاں سب سے بڑی بیماری بخل اور کنجوسی تصور کی جاتی تھیں۔ چنانچہ مقولہ ہے

﴿ایّ داء ادواء عن البخل﴾ [بخاری: ۱/۴۴۲]

''بخل سے زیادہ خراب اور کوئی بیماری نہیں ہے۔''

بعثت نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے قبل دنیا کا نظام معیشت

یہ تو جزیرہ نما عرب کی چند خوبیوں کا ذکر کیا ہے، لیکن اس کے علاوہ آپ کی بعثت سے قبل دنیا کے ہر ملک پر ''جاہلیت اولیٰ'' کے بادل چھائے ہوئے تھے، اور چھٹی صدی عیسوی تاریخ انسانی کا ایک سیاہ ترین اور پست ترین دور تھا۔ انسانیت روز بروز پستی اور نشیب کی طرف جا رہی تھی اور ساری دنیا میں کوئی ایسی طاقت نہ تھی جو انسانیت کی اس گرتی ہوئی دیوار کو سہارا دیتی اور اسے ذلت و پستی کے گڑھے میں گرنے سے روکتی۔ اس خدا نا آشنا اور خدا فراموش معاشرہ میں ہر انسان مکمل طور پر خود فراموش تھا۔ اسی وجہ سے تمام

انسانی قدروں کی جگہ حیوانی قدروں نے لے لی تھی۔ ایک انسان دیکھنے میں تو انسان نظر آتا تھا لیکن اس کے عادات واطوار اور اس کے اخلاق واحوال میں اگر خوردبین لگا کر بھی دیکھا جاتا تو انسانیت کا کوئی جراثیم نظر نہ آتا تھا۔

انبیاء اور رسولوں کی دعوت کی آواز عرصہ سے دب چکی تھی، ان کی تعلیمات ایک مدت سے یا تو محرف ہو چکی تھیں یا انسانی ذہن انہیں کلیتاً فراموش کر چکے تھے۔ جن چراغوں کو ان حضرات نے اپنے خون دل سے روشن کیا تھا وہ اس جاہلیت کی آندھی میں تو بجھ چکے تھے یا اس طرح ٹمٹما رہے تھے کہ ان کی روشنی سے چند ایسے خدا شناس دل روشن تھے جو آبادی کو چھوڑ کر ویرانوں میں اور دیر وکلیسا کو چھوڑ کر صحراؤں اور ریگستانوں کی تنہائیوں میں یا پہاڑوں کی غاروں میں خلوتوں میں پناہ گزیں ہو گئے تھے۔ کچھ ایسے بھی تھے جو دین کا نام تو لیتے تھے لیکن انہوں نے وقت کے سلطانوں اور بادشاہوں اور اہل دنیا سے ساز باز کر لی تھی، اور جبر واستبداد، اور ظالمانہ نظام سلطنت اور ناجائز خواہشات میں ان کے دست راست بن کر ناجائز فائدہ اٹھانے میں ان کے شریک وسہیم بن گئے تھے۔

اس زمانہ میں دو سپر پاورز (Super Powers) تھیں۔ ایک رومی سلطنت اور دوسری ایرانی سلطنت۔ ان میں سے ایک مشرق کی اور دوسری مغرب کی قیادت کی اجارہ داری سنبھالے ہوئے تھی، لیکن دونوں سلطنتیں اجتماعی اور اخلاقی امراض کا آشیانہ بنی ہوئی تھیں۔ ان کی رعایا اور اعیان حکومت تعیش وتکلفات کے بحر بیکراں میں غرق تھے اور دونوں پر سیاسی اور اخلاقی زوال طاری تھا۔ حکیم الامت حضرت شاہ ولی اللہؒ نے اپنی مشہور کتاب میں ان کا ایک سرسری نقشہ ان الفاظ میں کھینچا ہے:

> ''جب ایرانیوں اور رومیوں کو مختلف اقوام پر حکومت کرتے صدیاں گزر گئیں اور انہوں نے دنیوی تعیش ہی کو اپنا مقصد زندگی اور مطمح نظر بنا لیا اور وہ عیش وعشرت کے اسباب میں منہمک ہو گئے اور ان میں کا ہر شخص مال ودولت، سرمایہ داری اور تموّل پر فخر کرنے لگا اور آخرت کے تصور اور محاسبہ کو یک قلم فراموش کر دیا۔ یہ دیکھ کر دنیا کے مختلف

گوشوں سے وہاں ایسے ماہرین اکٹھے ہو گئے جو بے جا عیش پسندوں کو داد عیش دینے کے لیے عیش پسندی کے نت نئے طریقے ایجاد کرنے اور ان کے لیے سامان عیش مہیا کرنے کے لیے عجیب و غریب نکتہ آفرینیوں اور دقیقہ سنجیوں میں مصروف نظر آنے لگے۔ اور قوم کے بڑے لوگ اس جدوجہد میں منہمک رہنے لگے کہ اسباب تعیش میں کس طرح وہ دوسروں پر سبقت لے جا سکیں، اور ایک دوسرے پر فخر و مباہات کر سکیں۔ سرمایہ پرست علماء کا یہ حال ہو گیا تھا کہ جس کسی کے پاس ایک لاکھ درہم سے کم قیمت کا پٹکا ہوتا یا کلاہ ہوتا تو اسے بخیلی اور کنجوسی سے متہم کیا جاتا۔

ایسے ہی لوگوں نے عالی شان اور سر بفلک محل، اعلیٰ درجہ کے آبزن، نفیس حمام، نظر افروز پائیں باغ، سواری کے نمائشی جانور، خدمت کے لیے خوبصورت غلام اور حسین باندیاں اور کنیزیں اپنی زندگی کے لوازم بنا لیے، اور مقصد حیات یہ سمجھ لیا کہ شام و پگاہ عیش و نشاط کی محفلیں ہوں جن میں طرح طرح کے کھانے، وسیع دستر خوان پر چنے ہوں اور وہ لباس فاخرہ پہنے ان پر بیٹھے ہوں۔

بادشاہوں اور امیروں کی ان عیاشانہ زندگی سے بہت ہی خطرناک معاشی اور معاشرتی امراض تھے نہ تو کوئی شہری محفوظ رہا اور نہ کوئی دیہاتی، نہ امیر اور نہ غریب۔ اس ہمہ گیر مصیبت کا سبب یہ تھا کہ یہ سامان تعیش کثیر زر و مال صرف کیے بغیر حاصل نہیں ہو سکتا تھا۔ اور ظاہر ہے کہ یہ مال کثیر کاشت کاروں اور تاجروں پر نئے ٹیکس لگانے اور پہلے سے لگے ہوئے ٹیکسوں میں معتد بہ اضافہ کیے بغیر حاصل نہ ہو سکتا تھا۔ پھر دوسری مصیبت یہ کہ گراں بار ٹیکس ادا کرنے یا ٹیکس ادا نہ کرنے سے انکار کرنے پر ان کے خلاف فوجی

کارروائی کی جاتی۔ اس معاشی اور اقتصادی بدحالی کا نتیجہ یہ نکلتا کہ ٹیکس ادا کرنے اور اپنا اور اپنے بال بچوں کا پیٹ پالنے کے سوا لوگ کسی اور بات کی طرف متوجہ نہیں ہو سکتے تھے چہ جائیکہ سعادت اخروی اور اپنی نجات کے بارے میں کچھ غور وفکر اور سوچ و بچار کریں۔ بسا اوقات پورے ملک میں ایک فرد بشر بھی ایسا نہ ملتا جس کو اپنے دین کی فکر ہوتی۔ اس ''فاسد معاشی نظام'' کا ایک مکروہ پہلو یہ بھی تھا کہ جن صنعتوں پر نظام عالم کی بنیاد قائم ہے وہ اکثر و بیشتر یک قلم متروک ہوگئیں اور امراء اور رؤساء کی مرضیات وخواہشات کی تکمیل ہی سب سے بڑی خدمت اور سب سے بہتر حرفہ شمار ہونے لگا۔''

''جمہور کی یہ حالت تھی (جیسا کہ آج کل کی جمہوریت میں جمہور کی ہے) کہ ان کی تمام زندگی بداخلاقیوں کا نمونہ بن گئی۔ اوران میں سے اکثر و بیشتر کا گذارہ بادشاہوں کے خزانوں سے کسی نہ کسی طرح وابستہ ہو گیا تھا۔

''خلاصہ یہ کہ اس معاشرہ میں کسب معاش کے بہترین طریقوں کا فقدان تھا اور ایک بہت بڑی جماعت چاپلوسی، خوشامد، چرب زبانی اور درباداری کو ذریعہ معاش بنانے پر مجبور ہوگئی تھی، اور یہ ایک ایسا فن بن گیا تھا جس نے ان کے افکار عالیہ اور ذہنی نشو ونما کی تمام خوبیاں مٹا کر پست وارذل زندگی گزارنے پر قانع کر دیا تھا۔ جب یہ فاسد مواد وبا کی طرح پھیل گیا اور لوگوں کے دلوں میں سرایت کر گیا تو ان کے نفوس دنایت وخست سے بھر گئے اوران کی طبائع اخلاق صالحہ سے نفرت کرنے لگیں .... یہ سب کچھ اس معاشی اور اقتصادی نظام کی وجہ سے پیش آیا جو عجم وروم حکومتوں میں کار

فرماتھا۔'' [حجۃ اللہ البالغہ، باب اقامۃ الارتفاقات واصلاح الرسوم: ۱/۱۰۴]

حضرت شاہ ولی اللہؒ کی اس عبارت سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانہ میں ان دونوں سپر پاور میں سرمایہ دارانہ نظام معیشت تھا کیوں کہ یہ عیاشی اور سر بفلک محلات اور نفیس سواریاں اسی نظام معیشت کے برگ و بار ہیں۔ اس وقت جزیرہ نمائے عرب ہی ایک ایسا مقام تھا جو اس نظام سے عاری تھا کیوں کہ ان لوگوں کی خصلتیں سرمایہ دارانہ نظام کے بالکل خلاف تھیں کیوں کہ سرمایہ دارانہ نظام کی ایک خصوصیت یہ بھی ہوتی ہے کہ اس میں بخل اور شح ہوتا ہے جو عربوں میں نہیں تھا۔ ان کے ہاں تو یہ دستور تھا کہ رات کے وقت وہ اونچے اونچے ٹیلوں پر آگ جلا دیا کرتے تھے تاکہ اگر رات کے وقت کسی مسافر کا وہاں سے گزر ہو تو وہ اس آگ کو دیکھ کر یہاں کے لوگوں کے خیموں تک پہنچ سکے، اور جب کوئی بھولا بھٹکا مسافر رات کے وقت ان کے ہاں پہنچ جاتا تو وہ اس کی خاطر و مدارات میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ رکھتے۔ علامہ سید محمود بغدادی نے اس بارے میں دو شعر نقل کیے ہیں جن کا ترجمہ یہ ہے:

''ایک آقا اپنے مالک سے کہتا ہے!'' اے واقد! اونچے ٹیلے پر آگ جلا کیوں کہ رات نہایت سرد ہے اور ہوائیں بھی ٹھنڈی اور خنک چل رہی ہیں۔ ممکن ہے کہ کوئی بھٹکا ہوا مسافر تیری آگ کو دیکھ لے۔ اگر تیری اس جلائی ہوئی آگ نے کسی مہمان کو اپنی طرف کھینچ لیا تو تو آزاد ہوگا۔'' [بلوغ الارب: ۱/۷۸]

کبھی کبھی یہ لوگ بجائے آگ جلانے کے عود اور دوسری خوشبودار چیزیں جلاتے تاکہ وسیع و عریض صحرا میں ہوا کے جھونکے اس کو دور دور تک پھیلا دیں اور مسافر اس خوشبو کو سونگھ کر ان کے پاس پہنچ جائیں اور وہ اس کی ضیافت کر کے لطف اندوز ہوں۔ بعض لوگوں نے اس مقصد کے لیے کتے پال رکھے تھے جو رات کی خاموشی اور سناٹے میں بھونکتے اور دور دراز تک ان کی آوازیں شب کے صحرا نوردوں اور رات کے مسافروں کو ان کے خیموں تک پہنچا دیتیں، اور وہ ان کی مہمان نوازی کر کے اپنی روح کو سکون بخشتے۔ چنانچہ ایک شاعر اپنے بیٹے کو یوں وصیت کرتا ہے:

''اے میرے بیٹے! میں تجھے اپنے کتے کے بارے میں نصیحت کرتا ہوں کہ اس کے ساتھ اچھا سلوک کرنا کیوں کہ اس میں بعض خوبیاں ایسی ہیں جن کو میں بہت پسند کرتا ہوں۔ ان میں سے ایک خوبی یہ ہے کہ جب رات سیاہ چادر اوڑھ لیتی ہے تو یہ میرے مہمان کو اس وقت میرے پاس لے کر آتا ہے کیوں کہ اس وقت آگ جلانے والے سو جایا کرتے ہیں۔''

ایران کا نظام معیشت اور اس کی حالت زار

عرب میں کوئی حکومت نہ تھی، نہ کوئی فوج اور نہ پولیس۔ ہر قبیلہ اپنی جگہ ایک آزاد مملکت کی حیثیت رکھتا تھا اور وہ اپنی آزادی کا خود محافظ تھا۔ اس کا ہر فرد خود اعتمادی کا پیکر تھا۔ نہ صرف مردوں میں بلکہ عورتوں میں بھی پوری پوری خود اعتمادی تھی۔ اس وجہ سے ان کے ہاں کوئی نظام معیشت نہ تھا، البتہ ان کی زندگی کا انحصار زیادہ تر تجارت پر تھا خصوصی طور پر اہل مکہ کا پیشہ تو تجارت تھا کیوں کہ وہ علاقہ ''وادی غیر ذی زرع'' ہونے کے باعث کھیتی باڑی کے لائق نہ تھا۔ البتہ اہل مدینہ کاشتکار تھے۔ جیسا کہ آئندہ صفحات میں بیان کیا جائے گا۔

مشرقی دنیا کی قیادت کی اجارہ داری ایران کے ہاتھ میں تھی۔ متمدن دنیا کے انتظام میں اگرچہ ایران روم کا شریک وسہیم نہیں تھا لیکن شومئی قسمت سے وہ انسانیت کے دشمن افراد کی سرگرمیوں کی دیرینہ آماجگاہ تھا۔ زمانہ دراز سے اس کی اخلاقی بنیادوں میں دراڑیں پڑی ہوئی تھیں۔ ایرانیوں کو ان فطری اور مقدس رشتوں سے کراہت و نفرت تھی جن رشتوں سے ازدواجی تعلقات کو متمدن علاقوں کے باشندے ہمیشہ ناجائز اور غیر قانونی سمجھتے رہے ہیں۔ پانچویں صدی عیسوی کے وسط میں ایران پر یزدگرد دوم کی حکومت تھی۔ تاریخ کے اوراق سے پتہ چلتا ہے کہ اس نے اپنی حقیقی بیٹی کو اپنی زوجیت میں رکھا اور پھر اسے قتل کر دیا۔ (طبری ۵۰۹/۱) بہرام چوبین ایران کا مشہور حاکم تھا اور ایران پر اس کی

حکومت چھٹی صدی عیسوی میں تھی۔ اس نے اپنی سگی بہن سے اپنا ازدواجی تعلق رکھا۔

[طبری ۱/۵۰۹]

مشہور چینی سیاح ہوئن سیانگ کا بیان ہے کہ ایرانی قانون معاشرت میں ازدواجی تعلقات کے لیے کسی رشتہ کا بھی استثناء نہ تھا گویا کہ ماں، بہن اور بیٹی ان سب سے ازدواجی تعلقات قائم کرنا ایرانی معاشرت کا ایک اصول تھا۔ (ایران بعہد ساسانیاں ص ۴۳۱) پروفیسر آرتھر کرسٹن کے بیان کے مطابق اس قسم کا ازدواجی رشتہ ایران میں کوئی ناجائز یا حرام فعل تصور نہیں کیا جاتا تھا بلکہ ایک کارِثواب سمجھا جاتا تھا۔ گویا ذہن وفکر میں اس قدر انقلاب آچکا تھا کہ حلال وحرام کا تصور ذہنوں سے بالکل ختم ہوگیا تھا۔

محرمات سے نکاح زرتشتیوں کا مذہب تھا لیکن ان کو دیکھ کر عیسائیوں اور دوسرے مذاہب کے پیروکار جو ایرانی سلطنت میں بستے تھے، انہوں نے بھی اس فعل بد کو اپنا لیا۔ چنانچہ پروفیسر آرتھر لکھتا ہے۔

"ایران کے عیسائیوں نے بھی زرتشتیوں کی دیکھا دیکھی محرمات کے ساتھ شادی کرنے کے فعل بد کو اپنا لیا حالانکہ ان کی شریعت میں یہ فعل حرام تھا۔" [ایران بعہد ساسانیاں ص ۵۷۱]

پھر ساسانیوں میں یہ رواج بھی عام ہوگیا کہ وہ اپنی عورتیں دوسروں کو استعمال کے لیے دے دیتے تھے اور ان سے جو اولاد ہوتی وہ اس شوہر کی سمجھی جاتی تھی جو اپنی عورت دوسرے کو دیتا تھا۔ [تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو ایران بعہد ساسانیاں ص ۴۳۶۔۴۳۸]

تیسری صدی عیسوی میں ایک شخص مانی ایران کی سرزمین میں پیدا ہوا۔ اس نے ملک میں شدید شہوانی رجحانات کے ردعمل کے طور پر ایک تحریک چلائی اور اس نے دنیا کو تجرد کی زندگی اختیار کرنے کی دعوت دی تاکہ دنیا سے شر وفساد اور جنسیات کے جراثیم یک قلم ختم ہو جائیں۔ چنانچہ اس نے نکاح کو حرام قرار دیا بہرام نے ۲۷۶ء میں مانی کو یہ کہتے ہوئے موت کے گھاٹ اتار دیا کہ یہ شخص دنیا کو تباہی کی دعوت دیتا ہے۔ لہٰذا قبل اس کے کہ یہ دنیا ختم ہو خود اس شخص کو ختم ہو جانا چاہیے۔

پھر ۴۸۷ء میں مزدک پیدا ہوا۔ اس نے یہ دعوت دی کہ تمام انسان یکساں پیدا ہوئے ہیں۔ ان میں تفریق نہیں، لہٰذا زن، زر اور زمین سب کی مشترک ہے۔ گویا یہ دنیا میں سب سے پہلا (یوٹو پیائی) سوشلسٹ تھا جس نے ان تینوں کو ہر ایک کے لیے مشترک قرار دیا۔ اس نے یہ بھی کہا کہ چونکہ مال اور عورت ہی دو ایسے عنصر ہیں جن کی حفاظت ونگرانی کا انسان اہتمام کرتا ہے۔ لہٰذا ان دونوں میں اشتراک اور مساوات سب سے زیادہ ضروری ہے۔ چنانچہ علامہ شہرستانی نے لکھا ہے۔

> ''مزدک نے تمام عورتوں کو سب کے لیے حلال قرار دے دیا اور مال وزن کو آگ، پانی اور چارہ کی طرح سب کے لیے مشترک قرار دیا۔'' [الملل والنحل ص ۸۶]

مزدک کی اس دعوت میں بڑی جاذبیت تھی کیوں کہ سرمایہ دارانہ نظام میں جنسیات کو فری کرنا نوجوان نسل کے لیے ایک نعمت ہوتی ہے، لہٰذا مزدک کی اس دعوت کو نوجوان نسل اور تعیش پسند امراء اور اعیان سلطنت نے بھرپور طریقہ سے قبول کیا اور اس تحریک کا پرجوش اور بھرپور خیر مقدم کیا، اور یہ تحریک چند سالوں میں جنگل کی آگ کی طرح پورے ملک میں پھیل گئی۔ اس پر طرفہ تماشا یہ ہوا کہ ایرانی بادشاہ قباد نے اس تحریک کی سرپرستی کی بلکہ اس کی اشاعت میں بڑی سرگرمی دکھائی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ چند ہی سالوں میں پورا ملک آج کل کے یورپ اور امریکہ کی طرح جنسی انارکی اور شہوانی بحران میں ڈوب گیا۔

علامہ طبری نے لکھا ہے:

> ''آوارہ مزاج اور اوباش طبع لوگوں نے اس تحریک کی بڑی پذیرائی کی اور اس موقع کو غنیمت سمجھا اور مزدک اور مزدکیوں کے پرجوش ساتھی بن گئے۔ عام شہری اس بلائے ناگہانی کا شکار تھے کیوں کہ ان میں سے کسی کی بھی عزت محفوظ نہ تھی۔ اس تحریک نے اس قدر زور پکڑا کہ جو چاہتا اور جس کے گھر میں چاہتا گھس کر اس کے مال وزن پر قبضہ کر لیتا اور صاحب خانہ منہ دیکھتا رہ جاتا۔ ان مزدکیوں نے قباد

کو معزولی کی دھمکی دے کر اس تحریک کا سرپرست بنالیا۔ بادشاہ کی سرپرستی سے اس تحریک میں اور زور وشور پیدا ہوگیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ دیکھتے ہی دیکھتے یہ حالت ہوگئی کہ نہ باپ اپنی لڑکیوں کو پہچان سکتا تھا اور نہ لڑکا اپنے باپ کو، کسی کا بھی اپنی کسی ملکیت اور عورت پر اختیار اور قبضہ نہ تھا۔'' [طبری ۱/۵۲۰]

یہ تو ایرانی اخلاقیات کا ایک سرسری نقشہ تھا۔ عقیدہ کے لحاظ سے بھی ایران کی حالت روم سے زیادہ بدتر تھی۔ ایرانیوں کی کبھی یہ حالت تھی کہ جوش بت شکنی میں انہوں نے مصریوں کے متبرک بیل اپسو (Apis) کو ذبح کرڈالا تھا اور اس کے استھان کی اینٹ سے اینٹ بجادی تھی، لیکن انہوں نے بہت جلد خود ہرمز کی پرستش میں اپنے محکوم ملکوں کے سامی خداؤں کو داخل کرلیا۔ پرانی مجوسی عناصر پرستی از سرنو تازہ ہوگئی اور دارایوش کے ایک قریبی جانشین اردشیر نیمون (ARTOXERXCES MNEMON) نے زرتشتیوں میں مخنث دیوتا متھرا کی پوجا رائج کردی۔ یہ کلدانی دیوتا ملتا یا انائی ٹیس کا مثنیٰ تھا۔ اس کے ساتھ لنگ پوجا بھی وابستہ تھی۔

ایران کے بادشاہ اس بات کے دعویدار تھے کہ ان کی رگوں میں خدائی خون ہے، لہٰذا ایران کے باشندے بھی انہیں اسی نظر سے دیکھتے اور ان کے آگے سربسجود ہوتے اور انہیں قانون سے، تنقید سے اور بشریت سے بالاتر تصور کرتے۔ ان کا یہ بھی عقیدہ تھا کہ بادشاہت ان کا آسمانی حق ہے۔(Divine Right of Kings) تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو ڈاکٹر براؤن کی کتاب (Literary History of Persia Vol. iv) ان سلاطین کا ہر انسان پر پیدائشی حق تھا، لیکن کسی دوسرے انسان کا ان پر کوئی حق نہ تھا۔ حکومت کے لیے صرف ایک خاص خاندان یعنی کیانی خاندان مخصوص تھا۔ لہٰذا سمجھا یہ جاتا تھا کہ اسی خاندان کے افراد تاج وتخت کے مالک ہوسکتے ہیں، اور بادشاہت کا یہ حق ان کا موروثی اور الٰہی ہے۔ اگر انہیں خاندان میں بادشاہت کے لیے کوئی سن رسیدہ شخص نہ ملتا تو کسی عورت یا بچے ہی کو تاج شاہی پہنادیتے۔ چنانچہ کسریٰ کی لڑکی پوران اور دوسری بیٹی آذری دخت

تخت نشین ہوئیں اور شیرویہ کے بعد اس کے ہفت سالہ بچے کو تخت شاہی پر بٹھایا گیا۔ اور خسرو پرویز کے بیٹے فرخ زاد خسرو کو بادشاہ تسلیم کیا گیا حالانکہ ان زمانوں میں کئی سپہ سالار اور سردار موجود تھے لیکن زمام حکومت ان کے سپرد صرف اس لیے نہ کی گئی کہ ان کا نسبی تعلق شاہی خاندان سے نہ تھا کیونکہ سمجھا یہ جاتا تھا بلکہ پبلک کو سمجھایا جاتا تھا کہ ان کے دل و دماغ دوسرے انسانوں سے بہت مختلف ہیں۔ اس وجہ سے فوکاس (Phocas) نے جب سنہ ٦ھ میں رومی بادشاہ مارلیس (MAURICE) کے خلاف بغاوت کر کے اس کو تخت شاہی سے محروم کر دیا اور خود اس پر قابض ہو گیا تو فوکاس نے ایک سفیر کے ذریعہ ایران کی حکومت کو اپنی تخت نشینی کی اطلاع دی۔ اس وقت ایران کے تخت پر نوشیرواں عادل کا لڑکا خسرو پرویز تھا۔ خسرو پرویز کو سنہ ۹۱-۵۹۰ء میں اندرونی بغاوت کی وجہ سے ملک سے فرار ہونا پڑا تو مقتول رومی بادشاہ مارلیس نے اس کو اپنے علاقہ میں پناہ دی تھی اور تخت شاہی کے دوبارہ حصول میں اس کی بھرپور مدد بھی کی۔ انہی دنوں خسرو پرویز نے مارلیس کی لڑکی سے شادی بھی کر لی اور اس رشتہ کی وجہ سے وہ مارلیس کو باپ کہتا تھا۔ سنہ ۶۰۳ء میں خسرو پرویز دریائے فرات کو پار کر کے شام کے شہروں میں داخل ہو گیا اور رومی سلطنت پر بڑھتا گیا۔ ایرانی فوجیں انطاکیہ کو فتح کر کے یروشلم پر قابض ہو گئیں۔ خسرو پرویز کی اس کامیابی میں نسطوری اور یعقوبی فرقے کے عیسائیوں اور یہودیوں کا بہت بڑا ہاتھ تھا کیونکہ وہ رومی سلطنت کے سخت خلاف تھے۔

رومی سلطنت کو بچانے کے لئے اعیان حکومت نے افریقی مقبوضہ کے رومی گورنر کو خاموش پیغام بھیجا۔ اس نے اپنے لڑکے ہرقل (HERACLIUS) کو اس مہم پر بھیجا۔ ہرقل نہایت راز داری سے آیا اور معمولی لڑائی کے بعد سلطنت پر قابض ہو گیا اور فوکاس کو قتل کر دیا۔ لیکن ہرقل ایرانی فوجوں کے سیلاب کو نہ روک سکا۔ سنہ ۶۱۶ء تک رومی دارالسلطنت سے باہر عام مشرقی اور جنوبی حصہ کھو چکے تھے، اور عراق، شام، فلسطین، مصر اور ایشیائے کوچک وغیرہ پر صلیبی پرچم کے بجائے درفش کاویانی لہرا رہا تھا۔ ایرانی حکومت نے رومی علاقہ پر قبضہ کرنے کے بعد عیسائیت کو نیست و نابود کرنے کے لئے ان پر شدید ترین

مظالم شروع کر دیے۔ ان کے مذہبی شعائر کی توہین کی گئی۔ ایک لاکھ عیسائیوں کو بے گناہ قتل کیا گیا۔ کلیساؤں کو مسمار اور آتش کدوں کو تعمیر کیا گیا اور ان کی مقدس صلیب کی اصل لکڑی جن کے بارہ میں عیسائیوں کا عقیدہ تھا کہ سیدنا مسیح علیہ السلام نے اس پر جان دی تھی، چھین کر ایرانی دارالسلطنت مدائن پہنچا دی گئی۔

اس وقت ایرانی فاتح اپنے آپ کو کیا سمجھتا تھا، اس کا اندازہ خسرو پرویز کے اس خط سے ہوتا ہے جو اس نے بیت المقدس سے ہرقل کو لکھا تھا:

Khusru greatest of gods Master of the whole earth to Heraclius. His vile and insensate slave. You say that you trust in your god. Why then has he not delivered Jerusalen out of my hand.

سب خداؤں سے بڑے خدا اور تمام روئے زمین کے مالک خسرو کی طرف سے اس کے کمینہ اور بے شعور بندے ہرقل کے نام۔ تو کہتا ہے کہ تجھے اپنے خدا پر بھروسہ ہے کیوں نہ تیرے خدا نے یروشلم کو میرے ہاتھوں سے بچالیا۔

اس خط کے ایک ایک لفظ سے ایرانی بادشاہ کی رعونت، تکبر اور غرور و جاہ ٹپکتا ہے۔ اسی دوران ایرانی جنرل سین (SAIN) نے تجویز کیا کہ ہرقل صلح کا ایک قاصد شاہِ ایران کی خدمت میں روانہ کرے۔ اس کو ہرقل اور اس کے مشیروں نے بڑی خوشی سے قبول کیا، لیکن شاہِ ایران نے کہا:

''مجھ کو یہ قبول نہیں بلکہ خود ہرقل زنجیروں میں بندھا ہوا میرے تخت کے نیچے چاہیے۔ رومی حکمران سے اس وقت تک صلح نہیں کروں گا جب تک وہ اپنے صلیبی خدا کو چھوڑ کر سورج دیوتا کی پرستش نہ کرے۔''

The History of the Defline and Fall of the Roman Empire, vol 5, P.75, By Edward Gibbon)

خسرو کے اس خط کو نہ صرف گبن نے اپنی کتاب میں نقل کیا ہے بلکہ ول ڈیوران

نے بھی اپنی مشہور کتاب ,The Age of Faith کے صفحہ 147 اور جنرل پرسی نے اپنی کتاب History of Persia کے صفحہ 482 پر بھی نقل کیا ہے۔

حکومت کی طرف سے عوام الناس کو ممانعت تھی کہ وہ امراء کے طبقہ میں سے کسی کی جائیداد خرید سکیں۔ سوسائٹی میں مختلف طبقات میں ناقابل عبور فاصلہ تھا۔ ذات پات کا تصور عام تھا۔ کوئی بڑا کام نچلی ذات کے آدمی کے سپرد نہیں کرتے تھے اور سوسائٹی میں ہر شخص کی ایک معین جگہ تھی۔ اس وجہ سے کوئی شخص ترقی کر کے اوپر نہیں جا سکتا تھا۔

[ملاحظہ ہو ایران بعہد ساسانیاں]

وطن پرستی اور قوم پرستی ایرانیوں کی گھٹی میں تھی۔ وہ ایرانی قومیت کو نہایت مقدس اور باعظمت سمجھتے تھے۔ گویا ''غلام پارسی ایران پرستد'' ان کا عقیدہ تھا اس عقیدے کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ اپنے گرد و پیش کی قوموں کو ذلت اور حقارت کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ خسرو پرویز نے سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے نامہ مبارک کو پھاڑ کر ٹکڑے ٹکڑے کر دیا تھا جو کہ توہین و تمسخر کی ایک بھونڈی مثال ہے۔

جب عقیدے کی یہ حالت ہو تو اس معاشرے میں ایک جامع دین کیسے راہ پا سکتا ہے۔ اسی وجہ سے ایرانی دین الٰہی سے محروم تھے جو ان کے باطن کی اصلاح کرتا۔ یہ تھے مختصر سے حالات اس سلطنت کے جس کا بادشاہ اپنے آپ کو سب خداؤں سے بڑا خدا اور تمام روئے زمین کا مالک سمجھتا تھا۔ اگرچہ اس کی سلطنت میں اس زمانہ کی تہذیب و تمدن کی ہر شی موجود تھی لیکن سلطنت کا پورا نظام جاہلی بنیادوں پر قائم تھا، اور اسلام نے اسی کو ''جاہلیت'' کہا ہے وگرنہ ایرانی سلطنت کے پاس جدید سے جدید اسلحہ اور ہر قسم کا سامان تعیش موجود تھا لیکن وہ انسانی اقدار موجود نہ تھی جن پر انسانیت کی بنیاد رکھی جاتی ہے اور جن کے سایہ دار درخت کے نیچے انسان سکھ کا سانس لیتے ہیں۔

ایران کے معاشرتی حالات بھی نہایت خراب تھے۔ ایرانی معاشرہ مختلف طبقات میں منقسم تھا۔ سوسائٹی میں چھوٹے بڑے کا امتیاز اس قدر تھا کہ چھوٹے لوگ معاشرہ میں کوئی اونچا مقام حاصل کر لیں تو یہ بہت بڑی بات تھی۔ وہ اپنا پیشہ تک تبدیل نہیں کر سکتے

تھے۔ ان کے ذہنوں میں مذہبی طبقہ کی طرف سے یہ بات ڈالی جاتی تھی کہ تمہارے آباؤ اجداد نے جو پیشہ اختیار کیا تھا وہ خدا کے حکم کے تحت کیا تھا، لہٰذا اب انہیں پیشہ تبدیل کرنے کا کوئی حکم نہیں ہے۔ ایران کی اعلیٰ سوسائٹی کی عمارت دو ستونوں پر قائم تھی۔ ایک نسب اور دوسرا مال و دولت۔ چنانچہ عوام اور خواص کے مابین لباس، سواری، مکان، باغ، عورتوں اور نوکروں کے لحاظ سے امتیاز تھا۔ خواص کی سواری کی شان وشوکت، لباس کی چمک دمک، عورتوں کے فیشن اور میک اپ، سر بفلک محلات، کلاہ (ٹوپیاں) اور امیرانہ ٹھاٹھ باٹھ ان کی اعلیٰ نسبی کا پتہ دیتے تھے۔ [ایران بعہد ساسانیاں ص ۴۱۷]

تعدد ازدواج کا عام رواج تھا۔ ایک شخص کے لیے بیویوں کی تعداد کی کوئی حد نہ تھی ہر شخص اپنی آمدنی کے مطابق بیویاں رکھ سکتا تھا، البتہ غریب آدمی کو صرف ایک بیوی پر قناعت کرنا پڑتی۔ جن لوگوں کی زیادہ بیویاں ہوتیں، ان میں ایک بڑی بیوی ہوتی جن کو، زن پادشاہی ہا کہتے۔ دوسری سب بیویاں اس کے ماتحت ہوتیں، اور ان کے حقوق بڑی بیوی سے مختلف ہوتے اور یہ سب ''خدمت گار بیویاں'' کہلاتیں ان کی طرف اولاد نرینہ کو خاندان میں داخلہ کا حق مل سکتا تھا۔ [ایران بعہد ساسانیاں ص ۴۲۷۔ ۴۲۸]

خود خسرو پرویز کے بارہ میں علامہ طبری نے لکھا ہے کہ اس کی تین ہزار بیویاں تھیں۔ ان کے علاوہ ہزار ہا لونڈیاں تھیں جو بادشاہ کی ہر طرح کی خدمت کرتی تھیں، اور رقص وسرود کی محفلوں کو زینت بخشتیں۔ تین ہزار خدمت گار، آٹھ ہزار پانچ سو گھوڑے (ابن اثیر نے پچاس ہزار لکھے ہیں) سات سو ساٹھ ہاتھی، بارہ ہزار خچر اور جواہرات اور سونے چاندی کے برتنوں کا کوئی حساب نہیں تھا۔ [طبری ۱/ ۵۶۰، ابن اثیر ۱/ ۴۹۲]

کسریٰ کے تاج کے بارہ میں مختلف کتابوں میں رقم ہے کہ اس کا وزن کئی من تھا۔ یہ تاج طلائی تھا، یاقوت وزبرجد اور دوسرے قیمتی جواہرات سے آراستہ تھا۔ وزنی ہونے کی وجہ سے بادشاہ اسے سر پر اٹھا نہ سکتا تھا لہٰذا وہ تخت کے اوپر ایک طلائی زنجیر سے معلق تھا۔ کسریٰ تخت پر پردے میں جلوہ افروز ہو کر اس میں اپنا سر داخل کر دیتا۔ بعد میں وہ پردہ ہٹا دیا جاتا تو حاضرین اس کی ہیبت اور دہشت سے سجدہ ریز ہو جاتے۔ [السیرۃ النبویہ ابن کثیر ۱/ ۴۳]

حافظ ابن کثیرؒ نے لکھا ہے کہ سنہ ۱۶ھ میں مدائن کی فتح کے بعد سیدنا فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے یہ تاج سراقہ بن مالک رضی اللہ عنہ کو پہنایا۔ [البدایہ والنہایہ ۷/۶۷]

''خسرو کے آذربائیجان کے گورنر کے پاس جو پراپرٹی تھی، اس کی تفصیل کچھ یوں ہے: ''ضرورت سے زائد بیس لاکھ دینار، پانچ لاکھ دینار کا سونے چاندی کا سامان، چھ لاکھ دینار کے جواہرات، خراسان، عراق، فارس اور آذربائیجان کا کوئی ضلع اور شہر ایسا نہیں تھا جس میں اس کی جاگیریں، مکانات، سرائیں اور زمینیں نہ ہوں۔ تیس (۳۰) ہزار خچر اور گھوڑے تھے۔ دو لاکھ بھیڑیں، سترہ سو ترک یونانی اور حبشی غلام اور چودہ سو لونڈیاں''۔ [ایران بعہد ساسانیاں ص۵۰۳۔۵۰۴]

اس گورنر کی جائیداد اور دولت وثروت سے دوسرے گورنروں کے مال ودولت کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ ''قیاس کن زگلستان من بہار مرا۔''

ان معاشرتی حالات سے ایران کے معاشی اور اقتصادی حالات کا بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے کیوں کہ جب معاشرے کی ساری دولت پر اوپر کی سوسائٹی کے لوگ اکھٹے ہو جائیں تو عوام الناس، کاشت کار، مزدور اور دست کار قلاش اور مفلس ہو جاتے ہیں۔ یہ سرمایہ دارانہ نظام معیشت کا خاصہ ہے۔ پھر وہی حالت ہوتی ہے۔:

ملّیں اس لیے ریشم کے ڈھیر بنتی ہیں
کہ دختران وطن تار تار کو ترسیں

جب دولت چند ہاتھوں میں رک جائے تو معاشرہ کی معاشی صحت روز بروز بگڑتی چلی جاتی ہے اور عوام کا کام صرف یہی رہ جاتا ہے کہ اپنا خون پسینہ بہا کر بڑے لوگوں کی تجوریاں بھرتے رہیں۔ اور ان کی عیش وعشرت کے لیے انہیں سامان بہم پہنچاتے رہیں۔ اس قسم کے نظام میں امیر روز بروز امیر تر اور غریب غریب تر ہوتا جاتا ہے۔ چنانچہ ایرانی معاشرہ میں بھی یہی صورت حال تھی۔ کاشت کار، مزدور، ہاری، دست کار اور دوسرے لوگوں کے مقدر میں مفلسی، قلاشی اور محرومی کے سوا اور کچھ نہ تھا، اور ان کا کام صرف یہ رہ گیا تھا کہ

امراء، رؤساء، جاگیرداروں اور مراعات یافتہ فوجی جرنیلوں کے لیے ڈھور ڈنگروں کی طرح دن رات کام کریں اور جو کچھ حاصل ہو وہ ان کے عیش و آرام کے لیے انہیں مہیا کریں۔ غریب عوام جو کچھ کماتے تھے وہ ٹیکسوں کی صورت میں ان سے چھین لیا جاتا تھا۔ ملک میں سات خاندان جن میں شاہی خاندان بھی شامل تھا، ہر قسم کے ٹیکس سے مستثنیٰ تھے۔ امراء جن کو "العظماء" کہا جاتا تھا، وہ بھی ہر قسم کے ٹیکس کی ادائیگی سے بری تھے۔ جو لوگ وسیع وعریض جاگیروں کے مالک تھے اور جن کے پاس دولت کے انبار تھے، انہیں ہر قسم کے ٹیکس کی مراعات حاصل تھیں، اور ٹیکسوں کا سارا بوجھ نادار، اور مفلوک الحال عوام پر ڈال دیا گیا تھا اور وہ شام وپگاہ جانوروں کی طرح کام کر کے حکومت کے خزانہ کو بھرتے تا کہ یہ بڑے بڑے اعیان حکومت اس خزانہ عامرہ سے دادِ عیش دے سکیں۔

ان ٹیکسوں سے جمع شدہ رقم سے رفاہِ عامہ پر بہت کم خرچ کیا جاتا۔ ملک کی آمدنی کا زیادہ تر حصہ بادشاہ کے ذاتی خزانہ میں جاتا جو اس کی ذاتی ملکیت ہوتا۔ مالِ غنیمت کا سارا روپیہ بادشاہ کا ذاتی شمار ہوتا۔ ملک کی جاگیروں کی ساری آمدنی بھی اس کے ذاتی خزانہ میں جاتی۔ عید نوروز اور مہرگان کے موقع پر جبراً قیمتی تحائف لیے جاتے جو سارے کے سارے بادشاہ کے ذاتی خزانہ میں جمع ہوتے۔ اس بے پناہ آمدنی سے بادشاہ تکلفاتِ زندگی تعیّشات اور سامان وآرائش کی وہ بہتات اپنے گرد جمع کرتا کہ عقل اس کو دیکھ کر دنگ رہ جاتی۔ [تفصیل کیلئے ملاحظہ ہو۔ The Age of Faith, P.145]

دولت کے اس ارتکاز نے ملک کو اخلاقی طور پر دیوالیہ بنا دیا۔ جس معاشرہ میں بیٹی اور بہن اور دوسرے محرمات سے نکاح نہ صرف جائز بلکہ عین عبادت وثواب سمجھا جاتا ہو اور اپنی بیوی دوسرے کو مستعار دینا ایک پسندیدہ فعل تصور کیا جاتا ہو۔ وہاں پھر دوسرے گناہوں کو کھلی چھٹی مل جاتی ہے۔ چنانچہ ایران کی اس سوسائٹی میں بھی زنا اور بدکاری کا عام رواج تھا۔ شراب کھلے بندوں پی جاتی تھی اور ہر قسم کی بے راہ روی اس معاشرہ میں رحمت آسمانی سمجھی جاتی تھی۔

مزدک کی تحریک نے جب مال وزر اور زن کے مشترک ہونے کا اعلان کیا تو اس

نے ملک کی اخلاقی حالت کو اور زیادہ تباہ و برباد کر دیا اور ملک کا نوجوان طبقہ عورتوں سے متمتع اور لطف اندوزی کے لیے کھلے عام میدان میں آ گیا اور ملک میں عریانی اور بے باکی کا دور دورہ ہو گیا۔ جاگیر دار اور امراء کا طبقہ تعیّشات زندگی حاصل کر کے غریب عوام کو ان کی غربت کا احساس دلاتا۔ چنانچہ ملک کے مفلس و نادار عوام ہر رات امراء کی بزم عیش و طرب کا سن کر حسرت کی آہ بھر کر رہ جاتے۔ ان کے زر و جواہر اور اشرفیوں کے انبار دیکھ کر آنکھوں میں یاس اور ناامیدی کے آنسو بھر لاتے۔ ان کے فلک بوس محلات اور شاندار بنگلے اور کوٹھیاں دیکھ کر دل مسوس ہو کر رہ جاتے چنانچہ جب مزدک تحریک نے ان کے سامنے جنسی زندگی کی ساری پابندی بالائے طاق رکھ کر زن اور زر کو مشترک کر دیا تو اب ایران کی ہر عورت ہر مرد کی ہوس کا نشانہ بننے لگی اور ملک اخلاقی انارکی اور بے راہ روی کا کلی طور پر شکار ہو گیا۔

ملک کی اخلاقی انارکی اور عوام کی بے عزتی کا اندازہ اس واقعہ سے بھی لگایا جا سکتا ہے۔ ایک روز مزدک نے کیقباد "نوشیروان کا باپ" سے کہا (جو اس کا پیرو کار ہو چکا تھا) کہ آج تیری بیوی جو نوشیرواں عادل کی ماں تھی، میرے پاس رات بسر کرے گی۔ کیقباد ایران کا کلی حکمران تھا، لیکن مزدک کی صحبت نے اسے اتنا بے غیرت اور دیوث بنا دیا تھا کہ اس نے مزدک کی اس حیا سوز تجویز کو فوری طور پر قبول کر لیا اور اپنی بیوی ایک رات کے لیے مزدک کے پاس بھیجنے کے لیے تیار ہو گیا۔ جب نوشیرواں کو اپنے باپ کی اس بے غیرتی کا پتہ چلا تو وہ بے چین ہو گیا، مگر وہ کر کچھ نہیں سکتا تھا۔ وہ نہایت نیازمندی کے ساتھ مزدک کی خدمت میں حاضر ہوا، اپنے ہاتھوں سے اس کے جوتے اتارے، پھر اس کے پاؤں کو بوسے دیے، پھر نہایت لجاجت سے مزدک کی خدمت میں ہاتھ جوڑ کر عرض کیا کہ "اہل ایران کی مادر ملکہ اور ایران کی خاتون اول کی آبرو ریزی نہ کرے، اور اس مہربانی کے عوض وہ جو کچھ چاہتا ہے میں دینے کے لیے تیار ہوں۔ نوشیرواں کی اس لجاجت آمیز عرض داشت کو مزدک نے قبول کر لیا اور اس نے اس کی ماں کو چھوڑ دیا۔ [ابن اثیر ۱/۱۴۳]

(مزدک نے ایران کے لوگوں کی جائیدادیں اور عورتوں کی عصمتیں لوٹنے کا جو

مظاہرہ کیا اس کی تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو۔(The Age of Faith, P.144)

ابن اثیر نے اپنی تاریخ الکامل میں لکھا ہے کہ بادشاہ کیقباد جب مزدک کا پیرو کار ہوگیا تو اس نے اپنی سلطنت کے تمام گورنروں کو بھی اس تحریک میں شمولیت کی دعوت دی۔ حیرہ کے گورنر منذر نے بادشاہ کی دعوت کو ٹھکرا دیا۔ چنانچہ بادشاہ نے اس کو گورنری سے معزول کر دیا۔ کچھ عرصہ کے بعد جب کیقباد مر گیا تو اس کا بیٹا نوشیرواں تخت نشین ہوا۔ نوشیرواں اپنے باپ کے عقیدہ کے سخت مخالف تھا۔ نوشیرواں نے اپنے دربار میں لوگوں کو حاضری کا اذن عام دیا۔ اتفاق سے دو ممتاز شخصیتیں بھی اکٹھی دربار میں حاضر ہوگئیں پہلے مزدک حاضر ہوا پھر معزول شدہ گورنر حیرہ منذر بن ماء السماء۔ نوشیرواں ان دونوں کو دیکھ کر اچھل پڑا اور کہا:

''میری زندگی کی دو آرزوئیں تھیں مجھے امید ہے کہ یہ دونوں پوری ہو گئی ہیں۔''

مزدک نے پوچھا! شہنشاہ! وہ کون سی دو آرزوئیں تھیں؟

نوشیرواں نے جواب دیا:

''میری ایک آرزو یہ تھی کہ ایک باغیرت شخص المنذر کو اپنے عہدہ پر بحال کر دوں جس نے تیری دعوت کو ٹھکرا دیا تھا۔ اور دوسری آرزو یہ تھی کہ ان زندیقوں کو موت کے گھاٹ اتار دوں جنھوں نے ملک میں اخلاقی بے راہ روی پھیلا دی اور زن وزر کو سب کی مشترکہ چیز بنا دیا ہے۔''

مزدک کو پتہ تھا کہ ملک میں میرے ماننے والوں کی اکثریت ہے اور بادشاہ اس اشتراکی تحریک کو ختم نہیں کر سکتا۔ لہٰذا اس نے کہا: ''کیا تیرے بس میں ہے کہ ان تمام انسانوں کو موت کے گھاٹ اتار دے جو اس تحریک کے رکن ہیں؟'' یہ جواب سن کر نوشیرواں ایک دم غصے میں اچھل پڑا اور بے قابو ہو کر کہنے لگا:

''او زانیہ کے بچے! تو ابھی تک یہاں موجود ہے۔ بخدا تیری جرابوں کی بدبو ابھی تک میری ناک میں موجود ہے جب میں نے اپنی ماں

کی عصمت بچانے کے لئے تیرے بدبودار اور متعفن پاؤں کو بوسہ دیا تھا۔''

چنانچہ نوشیرواں نے اسی وقت حکم دیا کہ اس کا سر قلم کر دیا جائے اور اس کی لاش کو سولی پر لٹکا دیا جائے تاکہ لوگ اس کے انجام سے عبرت حاصل کریں۔ اس کے قتل کے بعد مزدکیوں نے ملک میں شورش برپا کرنے کی کوشش کی، لیکن نوشیرواں کے حکم سے ایک دن میں ایک لاکھ مزدکیوں کو قتل کر دیا گیا۔

مزدک اور اس کے پیروکاروں نے لوگوں کی جو جائیدادیں اور مال ودولت چھینی تھیں، وہ اصلی مالکوں کو واپس کی گئیں۔ اس طرح سے یہ فتنہ نوشیرواں کی جرأت اور دلیری سے اپنے انجام کو پہنچا اور لوگوں نے آرام کا سانس لیا۔ اس روز اس کو ''نوشیرواں'' کے لقب سے ملقب کیا گیا۔

یہ تھی مختصر سی داستان اس ملک کی جس کا بادشاہ اپنے کو ''سب خداؤں سے بڑا خدا اور تمام روئے زمین کا مالک'' کہتا تھا اور جس کے بادشاہ خسرو پرویز نے اپنے القابات کو یہاں تک بلند کیا کہ:

''خداؤں میں انسان غیر فانی اور انسانوں میں خدائے لاثانی، اس کے نام کا بول بالا، آفتاب کے ساتھ طلوع کرنے والا ہے، سب کی آنکھوں کا اجالا'' [ایران بعہد ساسانیاں ص ۳۴۸]

وہ بادشاہ اپنے کو من جانب خدا اور اپنی ذات کو جملہ اختیارات کا سرچشمہ کہتے تھے۔ چنانچہ ان کو یہاں تک اختیار تھا کہ بادشاہ اس کی ماں اور بڑی ملکہ کو یہ کلی اختیار تھا کہ جس شخص کے بارہ میں چاہیں بغیر کوئی جرم ثابت کیے تختہ دار پر لٹکا دیں۔ ان کے اس ظالمانہ فعل پر کسی شخص کو صدائے احتجاج بلند کرنے کی قطعاً کوئی اجازت نہ تھی۔ چنانچہ ایک مرتبہ ایک باپ نے اپنے چار لڑکے میدان جنگ میں بھیجے۔ ان میں سے ایک بھائی نے بادشاہ سے درخواست کی کہ ان کے پانچویں بھائی کو یہ اجازت دے دی جائے کہ امور زراعت کی نگرانی کرے اور بوڑھے والدین کی خدمت کرے، لیکن ''نازک مزاج شاہان تاب سخن

ندارد' بادشاہ کی طبع نازک پر یہ بات نہایت گراں گذری۔ قصر شاہی سے فوراً حکم صادر ہوا کہ اس پانچویں بھائی کو دو حصوں میں کاٹ دیا جائے اور جس راستہ سے لشکر شاہی گذرنا ہے، اس کے ایک طرف اس کے اوپر والا حصہ اور دوسری طرف اس کا نیچے والا حصہ لوگوں کی عبرت کے لیے رکھ دیا جائے۔ چنانچہ حکم کی تعمیل ہوئی اور تمام لشکر اس نوجوان کی لاش کے ٹکڑوں کے درمیان سے گذر گیا اور کسی کو حرف شکایت واحتجاج زبان پر لانے کی جرأت نہ ہوئی۔

رومی سلطنت کی حالت

دوسری طرف رومی سلطنت تھی، اس کو بازنطینی حکومت بھی کہتے تھے۔ اس کا درالسلطنت قسطنطنیہ تھا۔ اس میں بھی خاص آمرانہ (Dictatorhship) حکومت تھی جیسا کہ ایران کی ساسانی حکومت کے بارہ میں ایرانیوں کا عقیدہ تھا کہ حکومت ان کا موروثی حق ہے۔ اہل چین اپنے بادشاہ کو "شہنشاہ فرزند آسمان" کہتے تھے کیونکہ ان کا عقیدہ تھا کہ آسمان نر ہے اور زمین مادہ، اور تمام کائنات کو انہوں نے جنم دیا ہے۔ اور شہنشاہ زمین وآسمان کے جوڑے کی سب سے پہلی اولاد ہے۔ اسی وجہ سے بادشاہ کو تمام قوم کا تنہا باپ تصور کیا جاتا تھا۔ اسی طرح سلطنت روما میں رومی وطن اور رومی قومیت کی عظمت بنیادی قانون تھا۔ دوسری اقوام اور دوسرے ممالک اس کی قومیت کے غلام تھے۔ ان کی اسٹیٹ (State) میں حیثیت ان رگوں اور شرائین کی سی تھی جن کے ذریعہ خون اپنے مرکز کو پہنچتا ہے۔ رومی حکومت کو یہ حق حاصل تھا کہ وہ ہر قانون اور ہر ایک کے حق کو نظر انداز کر سکے، اور جس شخص کی عزت وناموس کو پامال کرنا چاہیے، پامال کر سکے۔ علاوہ ازیں قومی تعصّبات اور بے قید سیاست نے انہیں پستی کی انتہائی حد تک پہنچا دیا تھا۔ اور انکی معاشرت ظالمانہ اور انسانیت کش قوانین پر مبنی تھی۔ سلطنت روما اس وقت دو بازوؤں میں تقسیم ہو چکی تھی۔ مغربی بازو اور مشرقی بازو، مغربی بازو اخلاقی طور پر تنزل وانحطاط کے انتہائی نقطہ پر پہنچ چکا تھا۔ چنانچہ ایڈورڈ گبن نے لکھا ہے:

''اگر اس وقت روم کے تمام بیرونی وحشی مخالفین فنا بھی ہو جاتے تو ان کی تباہی سلطنت کے مغربی بازو کو زوال اور تباہی سے نہیں بچا سکتی تھی۔''

ایک اور مقام پر ایڈورڈ گبن نے اپنی کتاب ''تاریخ زوال وانحطاط روما'' میں لکھا ہے:

''رومن حکومت مخالفین کی نظر میں روز بروز زیادہ کمزور اور خود اپنی رعایا کی نظر میں زیادہ ظالم اور ناقابل برداشت ہوتی جا رہی تھی۔ کفایت شعاری جتنی ہوتی جا رہی تھی اس قدر اس کی جانب سے بے اعتنائی بڑھتی جا رہی تھی۔ اور جس نسبت سے رعایا کے مصائب روز افزوں تھے اسی نسبت سے ٹیکسوں میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔''

(The History of Dechine and Fall of Roman Empire, Voa.I,P.124)

اس سیاسی انارکی اور اخلاقی انحطاط اور پستی کا نتیجہ یہ ہوا کہ جرمنی کی وحشی اقوام نے سلطنت روما کے مغربی بازو کو کچل کر رکھ دیا اور اپنے سفاکانہ اور وحشیانہ مظالم کی وجہ سے رعایا کو پیس کر رکھ دیا۔

سلطنت روما کے مشرقی بازو کی حالت بھی کچھ مختلف نہ تھی۔ چونکہ اس بازو کی سرحدیں سلطنت ایران سے ملتی تھیں، اس لیے یہ ہمیشہ ایران کی حکومت سے الجھا رہا، اور پے بہ پے جنگوں نے اس کو نچوڑ کر رکھ دیا۔ رومیوں اور ایرانیوں کی باہمی کش مکش اور جنگوں میں جو چیز سب سے زیادہ افسوس ناک تھی، وہ ان دونوں کی قومی عصبیت اور مذہبی جنون تھا جو اس حد تک پہنچ گیا تھا کہ انسانیت اور شرافت کی کوئی قدر ان کی نگاہ میں احترام کی مستحق نہ رہی تھی اور مذہب واخلاق کی پامالی کا خوفناک سے خوفناک منظر بھی ان کے دلوں کو پسیجنے کے لیے کافی نہ تھا۔ چنانچہ ایرانی بادشاہ خسرو پرویز نے جب فلسطین پر حملہ کیا تو اس نے عیسائیوں کی عبادت گاہوں کو نذر آتش کر دیا اور انتہائی بے دردی سے عیسائی رعایا کو تہ تیغ کیا۔ اسی طرح رومی سلطنت کے حکمران ہرقل نے جب شمال کی طرف سے ایران پر حملہ کیا

تو اس نے عیسائیوں کی عبادت گاہوں کو نذر آتش کر دیا اور نہایت بے دردی سے عیسائی رعایا کو تہ تیغ کیا۔ اسی طرح رومی سلطنت کے حکمران ہرقل نے جب شمال کی طرف سے ایران پر حملہ کیا تو اس نے بھی جوابی کاروائی کے طور پر مجوسیوں کے آتش کدوں کو برباد کیا اور لاکھوں ایرانیوں کا خون بہایا۔ رومیوں کی انہی سفاکانہ اور ظالمانہ پالیسوں کی وجہ سے مشہور یورپی دانشور رابرٹ بریفالٹ (Robert Briffault) نے لکھا ہے:

''رومی مملکت کی تباہی کا سبب وہاں کی روز افزوں خرابیاں (مثلاً کرپشن، رشوت، جبر واستبداد وغیرہ) نہ تھیں بلکہ اصلی اور بنیادی سبب فساد وشر اور حقائق سے گریز کی عادت تھی جو اس سلطنت کے قیام اور اس کی نشو ونما میں پہلے ہی روز سے موجود تھی۔ یہ ایک بہت بڑی خرابی تھی اور یہ سلطنت کے اندر جڑ پکڑ چکی تھی۔ کسی انسانی جماعت کی تعمیر جب کبھی اس طرح کی کمزور اور کج بنیاد پر استوار کی جائے گی تو اس کو گرنے سے کسی دانشور کی ذہانت اور کسی کارکن کی سرگرمی نہیں بچا سکتی۔ چونکہ اس مملکت کی بنیاد ہی خرابیوں اور ظلم واستبداد پر استوار تھی، اس لیے اس کا زوال وانحطاط اور خاتمہ ایک لازمی امر تھا کیونکہ یہ بات ہر شخص جانتا ہے کہ رومی مملکت ایک چھوٹے سے طبقہ کے عیش وآرام اور راحت رسانی کا ذریعہ تھی، اور جمہور عوام سے ناجائز منفعت اندوزی اور رعایا کا خون چوس کر شاہی قومیت کے پودے کی آبیاری کرتی تھی۔ اس بات میں کوئی شک وشبہ نہیں کہ روم میں تجارت، امانت داری اور عدل وانصاف سے ہو رہی تھی، اور یہ بات حکومت کی بنیادی خصوصیات میں سے سمجھی جاتی تھی، اور اس سے بھی انکار نہیں کہ حکومت اپنی طاقت، اہلیت اور قابلیت میں نیز اپنے عدالتی نظام میں ممتاز تھی۔ لیکن یہ تمام خوبیاں اور اچھائیاں حکومت کو تباہی کے گڑھے میں جانے سے نہیں بچا سکتی

تھیں اور نہ ہی اساسی بنیادی غلطیوں کے انجام بد سے محفوظ رکھ سکتی تھیں۔"

(Robert Briffault: The Making of Humanity, P.159)

رومی حکومت کا اپنی رعایا کے ساتھ کوئی اچھا برتاؤ نہ تھا۔ ہر طرف لوٹ کھسوٹ کا بازار گرم تھا۔ رعایا کے وسائل ترقی پر پابندی اور بندش تھی۔ ہر شخص حکومت کے ظلم وستم کے آہنی شکنجہ کے نیچے کراہ رہا تھا۔ اس سلسلہ میں الفرڈ بٹلر کا بیان رومی حکومت کے رعایا کے ساتھ معاملات پر ان الفاظ میں روشنی ڈالتا ہے:۔

"مصر میں رومی حکومت کا صرف ایک ہی مقصد تھا اور وہ یہ کہ جس طرح ہو سکے رعایا سے مال لوٹ کر حکام کو فائدہ پہنچایا جائے۔ رعایا کی بہتری، خوش حالی اور ان کے معیار زندگی کو بہتر بنانے کا خیال کبھی ان کے حاشیہ خیال میں بھی نہیں آتا تھا۔ رعایا کے اخلاق کی درستی اور تہذیب کی بہتری اور ان کی مالی حالت کو بہتر کرنے کی انہیں کوئی فکر نہ تھی۔ مصر میں ان کی حکومت ان پردیسیوں کی سی تھی جو صرف اپنی طاقت پر بھروسہ کرتے ہیں اور محکوم قوم کے ساتھ اظہار ہمدردی کرنے تک کی بھی ضرورت نہیں سمجھتے۔"

(Alfred Butler:Arabs Conquest of Egypt and the last thirty years of the Roman Dominion,P.42)

مختلف کتابوں کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ رومی حکومت کا برتاؤ اپنی رعایا کے ساتھ نہایت سفاکانہ تھا۔ ان کے شہری اور انسانی حقوق غصب تھے۔ اکثر سرکاری ٹیکس ادا کرنے کے لیے وہ اپنی اولاد تک کو فروخت کرنے پر مجبور ہو جاتے تھے۔ غلام بنانے اور بیگار لینے کا ان میں عام رواج تھا۔ اسی بیگار سے رومی حکومت نے وہ ادارے اور کارخانے تعمیر کیے جو رومیوں کا کارنامہ سمجھے جاتے ہیں۔ مختصر لفظوں میں یہ کہ رومی رعایا کے لیے ان کی حکومت بدترین نحوست اور سخت ترین عذاب تھی۔

ان دونوں حکومتوں کے اعلیٰ حکام کے سروں پر عیش پرستی اور شہوانی خیالات کا بھوت سوار تھا۔ ان دونوں حکومتوں میں مصنوعی تہذیب اور پرفریب زندگی کا ایک سیلاب امڈ آیا تھا۔ جس میں ہر شخص گلے تک غرق تھا۔ عیش وعشرت کے سوا ان حکومتوں کے امراء ورؤساء کو اور کوئی فکر نہ تھی۔ تکلفات زندگی اور سامان آرائش اور تعیّشات کی ان کے ہاں وہ بہتات تھی جس کی قلم کو تاب نگارش نہیں۔ کسریٰ پرویز کے ہاں بارہ ہزار عورتیں تھیں۔ پچاس ہزار اصیل گھوڑے، محلات، اور نقد وجواہر کا اندازہ کرنا بہت مشکل ہے۔ کسریٰ کا قصر ابیض (White House) جو نوشیرواں نے بنوایا تھا۔ اس کی تعمیر میں رومی، یونانی اور اس زمانے کے دوسرے متمدن ممالک کے فن تعمیر کی تمام رعنائیاں اور نزاکتیں صرف کر دی تھیں وہ پانچ دالانوں اور بڑے بڑے گنبدوں پر مشتمل اپنی عظمت وجلال کی تصویر پیش کرتا تھا۔ اس کے سامنے کا حصہ ایک سو پچاس میٹر سے بھی چوڑا اور بلندی پچاس میٹر تھی۔ اس قصر ابیض پر کتنی رقم خرچ ہوئی، اس کا اندازہ کرنا مشکل ہے۔ مسلمانوں نے جب کسریٰ کے دارالسلطنت مدائن پر قبضہ کیا تو اگرچہ یزدگرد اپنا بہت سا خزانہ، غلام، کنیزیں اور مختلف سامان تعیش اپنے ساتھ حلوان لیے گیا تھا، پھر بھی اس کے شاہی خزانہ سے مسلمانوں کو تیس کھرب دینار ملے تھے۔ اس کے علاوہ اور بہت سا قیمتی سامان ملا جس کا اندازہ مؤرخین نے بیس کھرب دینار سے زیادہ لگایا ہے۔ تاریخ کے اوراق اس بات کی شہادت پیش کرتے ہیں کہ یزدگرد جب اپنے دارالسلطنت سے بھاگا تو وہ اس عجلت اور پریشانی میں اپنے ساتھ جو کچھ لے گیا اس سے اس کی عیش وعشرت کا پتہ چلتا ہے لکھا ہے کہ:

> ''یزدگرد اپنے ساتھ ایک ہزار باورچی، ایک ہزار گویے، ایک ہزار چیتوں کے محافظ، ایک ہزار باز دار اور بہت سے دوسرے لوگ تھے۔
> اور یہ تعداد اس کے نزدیک ابھی بہت کم تھی۔'' (ایران بعہد ساسانیاں ص ۸۱)

(تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو احقر کی کتاب ''سیرۃ عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ'')

روپیہ اپنے ساتھ وہ کس قدر لے کر گیا اس کی تفصیل تو نہیں ملی۔ لیکن اس کے ان ہمراہیوں سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ وہ کتنے کھرب روپیہ لے کر گیا ہوگا۔ اور اسی روپے

سے وہ اپنے ہی ملک میں کئی سال تک بھاگتا رہا۔ آخر سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ کے عہد خلافت میں ایک چکی والے کے ہاتھ سے قتل ہوا۔ اس وقت اس کی جیب میں تین درہم بھی نہ تھے۔

(تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو احقر کی کتاب سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ شخصیت اور کردار)

مؤرخین نے کسریٰ کے اس فرش بہار جس پر بیٹھ کر امرائے ایران موسم خزاں میں شراب پیتے تھے، کی تفصیل بیان کرتے ہوئے لکھا ہے:

> ''یہ ساٹھ گز مربع تھا، قریباً ایک ایکٹر زمین کو گھیر لیتا تھا۔ اس کی زمین سونے کی تھی جس میں جابجا جواہرات اور موتیوں کی گل کاری تھی جس میں پھول دار اور پھل دار درخت لگے ہوئے تھے۔ درختوں کی لکڑی سونے کی، پتے حریر کے، کلیاں سونے چاندی کی اور پھل جواہرات کے بنائے گئے تھے۔ گرد ہیرے کی جدول تھی۔ درمیان میں روشیں اور نہریں بنائی گئی تھیں، اور یہ سب جواہرات کی تھیں۔ موسم خزاں میں تاجداران آل ساسان اس گلشن بے خزاں میں بیٹھ کر شراب پیا کرتے تھے، اور دولت کا ایک حیرت انگیز کرشمہ نظر آتا جو زمانہ نے کبھی اور کہیں نہ دیکھا تھا۔''

(تاریخ اسلام، مولانا عبدالحلیم شرر/۳۵۴، The Age of Faith pk 149)

طبری نے نقل کیا ہے کہ ایرانی سروں پر جو کلاہ رکھتے تھے وہ کئی کئی لاکھ کی ہوتی تھی انہوں نے اپنے خیال میں اپنا معیار زندگی اتنا زیادہ اونچا کرلیا تھا کہ ایک شخص اپنی ذات اور اپنے لباس کے کسی ایک حصہ پر اتنا روپیہ صرف کرتا جس سے پوری بستی پرورش پاسکتی تھی۔ چنانچہ ہرمز کی ایک کلاہ کی قیمت ایک لاکھ تھی جس میں مختلف قسم کے جواہرات جڑے ہوئے تھے شاہ حیرا کسریٰ کا ایک عزیز تھا اس کی کلاہ کی قیمت پچاس ہزار اور رستم جو کہ کسریٰ کا وزیر دفاع تھا، اس کی کلاہ کی قیمت بھی ایک لاکھ تھی۔

اصل میں بات یہ ہے کہ ان دونوں حکومتوں میں بہیمانہ، طبقاتی نزاع، خودغرضانہ گروہ بندی، ملت کش مفاد پرستی، ظالمانہ سیاست، معاشی عدم مساوات اور جبر واستبداد اپنے

پورے عروج پر تھا اور ہر طرف وحشت اور بہیمیت کا دور دورہ تھا۔

مشرق خراب، مغرب ازاں بیشتر خراب
عالم تمام مردہ و بے ذوق جستجو

یہ دونوں حکومتیں اگر چہ اپنے آپ کو متمدن اور مہذب کہتیں لیکن یہ تمدن اور تہذیب جنگل کے درندوں کی تھی نہ کہ شہروں اور دیہاتوں میں بسنے والے انسانوں کی۔ اسی وجہ سے قرآن نے اس دور کو "جاہلیت" کا دور کہا ہے اور جس دور میں انسان نہ تو اپنے رب کو پہچانے اور نہ ہی دوسرے انسانوں کو اور نہ ہی اپنے آپ کو تو وہ یقیناً جاہلیت کا دور ہے۔

تاریخ کے اوراق سے پتہ چلتا ہے کہ رومی سلطنت کے معاشی حالات بھی ایران سے مختلف نہ تھے۔ یہاں بھی سلطنت کی آبادی دو طبقوں میں منقسم تھی۔ ایک امراء اور جاگیر داروں کا طبقہ اور دوسرے عوام اور غربا کا طبقہ اور ان دونوں طبقات میں کش مکش (Tension) تھی امراء اور روساء اقتصادی طور پر عام طبقہ سے بلند و بالا اور زرعی زمینوں کے وسیع وعریض قطعات کے مالک تھے، لہٰذا ان کے افراد کی اکثریت عیش وعشرت کی زندگی بسر کرتی تھی۔ ان کو عیش وعشرت کے تمام اسباب مہیا کرنے کے لیے غرباء کو ڈھور ڈنگروں کی طرح دن رات کھیتوں اور باغات میں کام کرنا پڑتا تھا، اس وجہ سے وہ کئی نسلوں سے غربت اور ناداری کی زندگی بسر کر رہے تھے۔ وسائل رزق پر امراء کے طبقہ کا قبضہ تھا، اس وجہ سے وہ دن بدن غریب سے غریب تر ہو رہے تھے۔ کوئی اس طبقہ کا پرسان حال نہ تھا۔

اگر چہ ایران کے مقابلہ میں یہاں علم کی کچھ روشنی تھی، کچھ درس گاہیں اور اسکول بھی تھے، بعض لوگ کسی فن میں ماہر بھی تھے، جیسے ایک خاتون ہپاٹیا (Hypatia) فن ریاضی میں ماہر تھی۔ علم فلکیات میں پٹولیمی (Potolemy) نے افلاطون اور پلوٹینس کے خطوط پر اپنا ایک مستقل نظام فکر تعمیر کیا۔ اس کے علاوہ یونانیوں اور عیسائی پادریوں کے معاشرہ پر اچھے خاصے اثرات تھے، لیکن ایک سرمایہ دارانہ نظام معاشرت میں لوگوں کو سونے چاندی کے ترازو میں تولا جاتا ہے۔ علم وفن کی اس معاشرہ میں کوئی قدر و قیمت نہیں ہوتی۔ امراء اور خوش حال طبقہ کو زندگی کی ہر قسم کی سہولیات میسر تھیں جب کہ کاشتکار، دست

کار اور عام مزدوران تمام سہولیات سے یک قلم محروم تھے۔ اس وجہ سے امراء اور غرباء کے درمیان ایک وسیع خلیج حائل تھی۔ البتہ غریبوں کا دل بہلانے کے لئے ملک میں جگہ جگہ سرکس، جنگی رتھوں کی دوڑ، اور جنگی مقابلے ہوتے تھے جن میں شرطیں بھی لگتی تھیں۔ اس وقتی خوشی میں غریب اپنا دل بہلا لیتا اور ہفتہ بھر کی معاشی دوڑ دھوپ کے رنج و غم کو کچھ وقت کے لیے بھول جاتا۔

معاشرتی نظام کا گہرا تعلق ملک کے معاشی نظام سے ہوتا ہے۔ جب معاشرتی نظام مختلف طبقات میں منقسم ہو تو معاشی نظام میں بھی نشیب و فراز ہوتے ہیں۔ اگرچہ ملک کا معاشی نظام مخلوط قسم کا تھا لیکن بڑی بڑی صنعتیں اور جاگیریں حکومت کے کنٹرول میں تھیں جس کی وجہ سے کاشت کار اور مزدور حکومت اور جاگیرداروں کی غلامی میں جکڑے ہوئے تھے۔ ملک میں نجی کاروبار کی بھی اجازت تھی لیکن نجی کاروبار کرنے والے بھی مختلف قسم کے ٹیکسوں میں اس طرح جکڑے ہوئے تھے کہ حکومت کے ٹیکس ادا کرنے کے بعد ان کی حالت میں خوش حالی کی کوئی نوید نہیں ہوتی تھی۔ چنانچہ انسائیکلو پیڈیا بریٹانیکا میں ہے کہ:

> ''سلطنت کا مالیاتی نظام انتہائی حد تک خراب تھا۔ اگر حکومت عوامی اقتصادیات کے اصولوں سے آشنا ہوتی تو اپنی رعایا کی خوش حالی کو مجروح کیے بغیر اپنی آمدنی میں بہت اضافہ کر سکتی تھی۔ جو ٹیکس لگائے جاتے تھے ان کی شرح بہت زیادہ تھی۔ پھر ان کی وصولی کے لیے نہایت جبر و تشدد سے کام لیا جاتا تھا۔ حکومت تاجر پیشہ لوگوں کو للچائی ہوئی نظروں سے دیکھتی۔ اس کا جی چاہتا کہ وہ لوگوں سے زیادہ سے زیادہ بلکہ سارا مال ہی چھین کر اپنا خزانہ بھر لے۔ زراعت آمدنی کا ایک اہم ذریعہ تھا۔ بازنطینی حکومت کے عہد میں زمین کے مالکوں پر اتنا بوجھ ڈالا جاتا رہا جو نہایت نامناسب تھا۔ زمین کا لگان زرعی پیداوار کے حساب کے مطابق نہیں لیا جاتا تھا بلکہ زمین کی مالیت اور مالک کی حیثیت کے مطابق لیا جاتا تھا۔......

ٹیکس وصول کرنے کی ذمہ داری مجلس نمائندگان کے ارکان پر عائد تھی۔ ساتویں صدی تک یہی دستور رہا کہ مجلس نمائندگان کے ارکان ٹیکسوں کی وصولی کرتے اور پھر اس کو حکومت کے خزانہ میں جمع کراتے۔ جو لوگ لگان نہیں دیتے تھے ان کے حصے کا لگان اور ٹیکس ان نمائندگان کو اپنی جیب سے ادا کرنا پڑتا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ مجلس نمائندگان کے کئی ارکان بری طرح زیر بار ہو جاتے۔ کاشت کاروں پر اور بھی طرح طرح کی ذمہ داریاں ڈالی گئی تھیں جن میں سب سے زیادہ اہم ذمہ داری یہ تھی کہ حکومت کے ڈاک خانوں کے لیے گھوڑے، بگھیاں اور لڑکے مہیا کرنا تھا۔ چوتھی، پانچویں اور چھٹی صدی میں کاشت کاروں کو زمین کے ساتھ وابستہ کر دیا جاتا تھا۔ اگر پہلا مالک زمین فروخت کر دیتا تو خریدنے والے کو زمین کے ساتھ وہ کاشت کار بھی منتقل کر دیے جاتے جو پہلے مالک کے وقت زمین میں کھیتی باڑی کرتے تھے۔ (گویا زمین کے ساتھ مزارع بھی فروخت ہو جاتے) [انسائیکلو پیڈیا بریٹانیکا ۱۹/۴۴۲]

ایک اور جگہ پر مقالہ نگار نے لکھا ہے:

''اگر کبھی ناگوار موسموں کے باعث فصلیں تباہ و برباد ہو جاتیں تو اس کے باوجود لگانوں اور زرعی ٹیکسوں میں کمی نہیں کی جاتی تھی، اور جو شخص مالی تنگی کی وجہ سے لگان اور زرعی ٹیکس ادا نہیں کرتا تھا تو اس کی غیر منقولہ جائیداد بحق سرکار ضبط کر لی جاتی تھی۔ ان مالی مجبوریوں اور مالی مظالم کے باعث کبھی کبھی لوگ بغاوت کرنے پر مجبور ہو جاتے تھے۔ چنانچہ اس سلسلہ میں ایک بغاوت ۳۲ء میں ہوئی اس میں صرف دار السلطنت میں تیس (۳۰) ہزار نفوس کام آئے۔''

[انسائیکلوپیڈیا بریٹانیکا ۱۹/۴۴۲]

یہ تو عوام الناس کی خستہ حالی اور ناداری کی ایک نامکمل سی تصویر ہے، لیکن اس کے برعکس شاہی خاندان اور ملک کی بیوروکریسی (Bureoucracy) اور جاگیرداری اور رؤسا کی عیش کوشی اور لذت آفرینی کی داستانیں پڑھ کر ایک انسان کی عقل دنگ رہ جاتی ہے۔ انکے عالی شان اور سر بفلک محلات، دیوان خانے، شراب نوشی کی مجالس، عیش وعشرت کے سازوسامان کی کوئی انتہاء نہ تھی۔ جبلہ بن الایہم غسانی کے بارہ میں کتابوں میں مرقوم ہے کہ وہ جب شراب نوشی کے لیے مجلس جماتا تو اس کے نیچے فرش پر ہر قسم کے پھول چنبیلی، گلاب وغیرہ بچھا دیے جاتے اور سونے چاندی کے ظروف میں مشک وعنبر لگائے جاتے اور چاندی کی طشتریوں میں مشک خالص لایا جاتا۔ اگر سرما کا موسم ہوتا تو عود جلایا جاتا اور اگر گرمیوں کا موسم ہوتا تو برف بچھائی جاتی اور اس کے ہم نشینوں کے لئے گرمیوں کے لئے گرمیوں کا لباس فراہم کیا جاتا جس کو وہ اپنے اوپر ڈال لیتے۔ جاڑوں کے موسم میں سمور، قیمتی کھالیں اور دوسرے گرم لباس حاضر کیے جاتے۔

جب معاشرتی اور معاشی حالات ایسے ہوں تو اخلاقی حالت یقیناً زوال پذیر ہوتی ہے۔ چنانچہ سلطنت روما کی اخلاقی حالت بھی نہایت ابتر (Deteriorated) تھی۔ یورپ کے ایک دانش نے لکھا ہے:۔

> ''اخلاقی، جنسی اور کاروباری لحاظ سے رومی سلطنت کے باشندوں کی حالت قابل رشک نہ تھی۔ ایک طرف تو رقص وسرود کی زبانی طور پر مذمت کی جاتی تھی لیکن دوسری طرف قسطنطنیہ اور دوسرے بڑے بڑے شہروں میں بے شمار رقص گاہیں، اور ڈانسنگ کلب موجود تھے۔ اگرچہ کلیسا نے اس کی مخالفت کی اور اعلان کر دیا کہ ایکٹروں کو مسیحی مذہب قبول کرنے کی اجازت نہیں دیں گے لیکن اس کے باوجود بازنطینی سٹیج پر ایکٹروں کی بھرمار تھی، اور ان کے رقص وسرود کو عوام وخواص کی طرف سے بڑی پذیرائی بخشی جاتی تھی۔ قانونی طور پر ان پر یہ قدغن تھی کہ وہ ایک سے زیادہ شادی نہیں کر سکتے تھے۔ لیکن

دوسری طرف سے ان کی جنسی خواہشات کی تسکین کا سامان کر دیا گیا تھا۔''

ول ڈیوران نے اس بارہ میں مزید یہ لکھا کہ:

''اس زمانہ میں عملی طور پر تمام عورتیں بدکار تھیں۔ ضبط تولید (Birth Control) کے وسائل پر بڑی مستقل مزاجی سے تحقیق جاری رہتی تھی۔ اس زمانہ کے اطباء اور ڈاکٹر اپنی قرابادینوں میں اس موضوع کا بڑی اہمیت سے ذکر کرتے .... قحبہ خانے عام تھے۔ عصمت فروشی کا دھندا اپنے پورے عروج پر تھا۔ جسٹینین (Justinian) اور اس کی ملکہ نے عصمت فروشی کو ختم کرنا چاہا۔ انہوں نے ملک میں عصمت فروشی کا دھندا کرنے والے مرد و زن کو قسطنطنیہ سے نکل جانے کا حکم دیا لیکن انہیں کوئی خاطر خواہ کامیابی نہ ہوئی۔'' (The Age of Faith,P.120)

دنیا کا عمومی جائزہ:

یہ حالت جس کا سطور بالا میں ذکر کیا گیا ہے۔ اس زمانہ کی دو سپر پاورز کی تھی۔ یہ دونوں حکومتیں جزیرہ نما عرب کے ساتھ ملحق تھیں۔ ان دونوں کے علاوہ دنیا کے دوسرے ممالک کی حالت بھی ان سے مختلف نہ تھی۔ ہندوستان میں تو اصنام پرستی زوروں پر تھی۔ ہر کنکر شنکر بنا ہوا تھا۔ ان کے دیوتاؤں کی قربان گاہوں پر گوشت جلایا جاتا، پھر بڑی عیاری کے ساتھ یہ عقیدہ لوگوں کے ذہن نشین کرایا گیا کہ قربانی کے آداب سے صرف برہمن آشنا ہیں، لہٰذا قربانی دینے کا اختیار صرف اور صرف برہمنوں کو ہے۔ اس عقیدے نے برہمنوں کے لیے خوش حالی کے دروازے کھول دیے۔ ہندو مذہب میں دیوتاؤں کی تعداد بھی لامحدود تھی اور یہ تعداد بڑھتی رہتی تھی۔ بہر حال تین دیوتاؤں کو خاص فوقیت حاصل تھی:

(1) وشنو (2) برہما (3) شیوا

(1) وشنو: یہ نظام شمسی کا دیوتا تھا۔ یہ جنگ کے خلاف سمجھا جاتا تھا، اس وجہ سے اس کے لئے جانوروں کی قربانی کے بجائے پھولوں کے ہار پیش کیئے جاتے تھے۔

(2) برہما: وشنو اور شیوا سے کم تر درجے کا دیوتا ہے، اس لیے اس کا بت چھوٹا بنایا جاتا تھا۔

(3) شیوا: یہ دیوتا وشنو دیوتا کے بالکل برعکس تھا۔ اس کی تصویر میں اس کے پانچ چہرے اور چار ہاتھ دکھائی دیتے ہیں۔

اہل مغرب کے نزدیک تو ہندوازم کو مذہب نہیں کہا جاسکتا کیوں کہ یہ ہر قسم کے عقیدہ کو اپنانے کے لیے تیار ہوتا ہے۔ (ملاحظہ ہو World Civilization P.88) عورت کا ہندو مذہب میں کوئی مرتبہ نہیں تھا۔ عورت اگر بیوہ ہو جاتی تو اس کو یہ بتایا جاتا کہ اس کا خاوند اس کے کسی گناہ کی وجہ سے مرا ہے، چنانچہ بیوہ ہونے کے بعد اس کو کسی صورت بھی شادی کی اجازت نہیں ہوتی تھی خواہ وہ ابھی عنفوان شباب ہی میں کیوں نہ ہوتی۔ جب کسی عورت کا شوہر مر جاتا تو اس عورت کو مجبور کیا جاتا کہ وہ اپنے خاوند کی لاش کے ساتھ جل کر خاکستر ہو جائے۔ اس کو ''ستی ہونا'' کہا جاتا تھا۔ عورتوں کے علاوہ شودر جاتی کے ساتھ بھی نہایت غیر انسانی سلوک کیا جاتا تھا۔ ان کو آبادی کے باہر جھونپڑیوں میں رہنے پر مجبور کیا جاتا، بلکہ اگر غور کیا جائے تو ان کو حیوانوں سے بھی بدتر سمجھا جاتا تھا۔ برہمن اگر وید پڑھ رہا ہوتا اور اس کے پاس سے کوئی شودر گذر جاتا اور اس کے کان میں وید پڑھنے کی آواز پڑ جاتی تو اس کے کان میں سیسہ پگھلا کر ڈالا جاتا۔ وہ اس وجہ سے کہ اس کے ناپاک کان میں پاک وید کی آواز کیوں پڑی؟ علاوہ ازیں اگر کسی شودر کا سایہ کنویں پر پڑ جاتا تو وہ کنواں ناپاک ہو جاتا۔ [تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو ورلڈ سولائزیشن ص ۹۱]

دیوتاؤں میں بھی مونث مذکر کا معاملہ زیر بحث آتا۔ مونث کو ماتا دیوی کہا جاتا اور اس کی پوجا کی جاتی جس کا نام شیوا تھا۔ اس کے آلہ تناسل کی بھی پوجا ہوتی تھی۔ جس کا نشان عورت اور مرد اپنے گلے میں لٹکائے رکھتے۔

(Excylopedia of Living Faiths. P.218)

اسی ہندوستان میں بدھ مت نے جنم لیا تھا جو کہ دراصل ہندوستان میں پھیلے ہوئے رسم ورواج کے خلاف ایک صدائے احتجاج تھی جس نے ویدوں کو مسترد کیا اور ہندو مذہب کی طبقاتی تقسیم کو ماننے سے انکار کر دیا۔ ویدوں میں مذکور تمام دیوتاؤں کی خدائی کے خلاف علم بغاوت بلند کر دیا اور ان سب چیزوں سے نجات کا ایک آزادانہ طریقہ لوگوں کے سامنے پیش کیا۔ [ملاحظہ ہو انسائیکلوپیڈیا بریٹانیکا ۴/۲۷۳]

بدھ مت کی خوش قسمتی تھی کہ اسے اشوک، کنشک اور ہرش جیسے عالی ہمت مہاراجوں کی سرپرستی حاصل ہوگئی جنہوں نے اس مذہب کی اشاعت میں بڑا اہم کردار ادا کیا اور جلد ہی یہ مذہب پورے ہندوستان میں پھیل گیا، لیکن بدقسمتی سے بدھ مت کے ماننے والے بہت جلد اٹھارہ فرقوں میں منقسم ہوگئے۔ اگرچہ ان سب فرقوں کی عقیدت کا مرکز گوتم بدھ کی شخصیت تھی۔ لیکن پھر بھی ہر فرقہ نے اپنی اپنی خانقاہیں اور عبادت گاہیں الگ الگ بنالیں۔

بدھ مت کے اس تشتت وافتراق سے برہمنوں نے بدھ مت کے خلاف ایک قسم کی بغاوت کر دی اور اپنا کھویا ہوا وقار واپس لے لیا اور ملک میں پھر ذات پات کا نظام نافذ ہوگیا، اور برہمنوں نے پھر شودروں کو اپنے ظلم وستم کا نشانہ بنانا شروع کر دیا۔ چنانچہ مولانا عبدالمجید سالک نے لکھا ہے کہ شودروں کو تنگ کرنے اور ان کی زندگی اجیرن بنانے کے لئے یہ لائحہ عمل بنایا گیا۔

> ''شودر برہمن کا پس خوردہ کھائے۔ شودر مہینہ میں صرف ایک دفعہ حجامت بنوائے، شودر کسی برہمن کو چور کہے تو اس کے جسم کا کوئی عضو کاٹ دینا چاہیے۔ شودر کسی برہمن، کھشتری اور ویش کے ساتھ تلخ کلامی کرے تو اس کی زبان میں سوراخ کر دیا جائے۔ اگر شودر کسی برہمن کا نام لے کر کہے کہ فلاں برہمن نیچ ہے تو اس شودر کے منہ میں بارہ انگلی کی آہنی سیخ آگ میں سرخ کر کے ڈال دی جائے۔ اگر چھوٹی ذات کا آدمی بڑی ذات کے آدمی کے ساتھ ایک آسن پر بیٹھے

تو اس کا چوتڑ کاٹ دیا جائے اس طرح کہ وہ مرے نہیں۔ شودر کسی برہمن کے بال یا پاؤں یا ڈاڑھی پکڑے تو اس کا ہاتھ کاٹ دیا جائے۔ شودر کو کوئی صلاح مشورہ نہ دو۔ دھرم اور بھرت کی تلقین بھی نہ کرو۔ جو شودر کو دھرم کی تلقین کرتا ہے، وہ بدترین دوزخ میں جاتا ہے۔'' [مسلم ثقافت ص ۳۸/۳۹]

بعض کتابوں میں ہے کہ شودر مندروں میں جا کر پوجا پاٹ نہیں کر سکتے تھے۔ نہ ان کے کنوؤں سے پانی پی سکتے تھے بلکہ ان کی آبادیاں شہروں سے الگ تھلگ ہوتی تھیں۔ گویا سوسائٹی کا عضو معطل سمجھ کر شودروں کو کاٹ کر الگ کر دیا گیا تھا۔

ان حالات میں ہندو معاشرہ کی اخلاقی حالت بھی نہایت ناگفتہ بہ تھی۔ بڑے بڑے مندروں میں دیوداسیوں کے طائفے ہوتے تھے جو دیوتاؤں کی مورتیوں کے سامنے رقص کیا کرتیں اور گیت گایا کرتیں۔ مندر کے پروہیت کو اس بات کا پورا اختیار تھا کہ وہ کسی پجاری کو شادکام اور اس کا دل خوش کرنے کے لیے کسی دیوداسی کو اس کے پاس رات گذارنے کے لئے بھیج دے۔ مولانا سالک نے سوامی دیانند کے حوالہ سے ہندو سوسائٹی کی اخلاقی حالت کے بارہ میں لکھا ہے۔:

''اب ان خود غرض مذہبی پیشواؤں نے ایسے باطل مذہبوں کی تلقین شروع کی جس سے کوئی بداخلاقی گناہ نہ رہی۔ زنا کاری کی نہ صرف عام اجازت دے دی گئی بلکہ ایک خاص موقع ''بھیرویں چکر'' پر شراب خوری اور زنا کاری مذہباً فرض قرار دی گئی اور اس موقع پر مرد اور عورت سب ایک جگہ جمع ہوتے۔ مرد ایک ایک عورت کو مادرزاد برہنہ کر کے پوجا کرتے اور عورتیں مرد کو ننگا کر کے پوجتیں اس موقع پر شراب پی جاتی اور بدمست ہو کر کوئی کسی عورت کو، کوئی اپنی یا کسی دوسرے کی لڑکی کو، کوئی کسی اور کی یا اپنی ماں بہن یا بہو وغیرہ کو جو وہاں موجود ہوتی پکڑ لیتا اور جس کے ساتھ چاہتا بدفعلی کر سکتا تھا۔

اس مذہبی تقریب کے علاوہ عام طور پر زنا کاری کے لیے ایک خاص فقرہ مقرر کیا گیا تھا جس کو پڑھ کر ہر مرد وعورت ''سماگم'' ہم بستری کرتے تھے اور ایسی بدکاری میں کسی رشتہ کے لحاظ کی ضرورت باقی نہ رہتی تھی۔'' [مسلم ثقافت ص ۱۴۱]

یہ سب حکومتیں جن کے بارہ میں سطور بالا میں بتایا گیا ہے، جزیرہ نما عرب کے ارد گرد کی حکومتیں تھیں یہ سب سیاسی، اقتصادی، معاشی، معاشرتی، اور اخلاقی طور پر انحطاط اور تنزل کے انتہائی نقطہ پر پہنچ چکی تھیں۔ اگر چہ ان میں ایران اور روما کی حکومتیں سپر پاورز کہلاتی تھیں، لیکن ان دونوں سلطنتوں کی اخلاقی بنیادیں بالکل کھوکھلی ہو چکی تھیں اور وہ زیادہ دیر تک کھڑی نہیں رہ سکتی تھیں۔ ان دونوں سلطنتوں کے علاوہ اور بھی جتنی حکومتیں تھیں ان کی حالت بھی ناگفتہ بہ تھی۔ چنانچہ ایک مغربی سیرت نگار مسٹر بوڈ (R.V.C Bodley) نے اپنی مشہور کتاب ''پیغامبر'' (The Messenger) میں جناب رسول اللہ ﷺ کی بعثت کے وقت کی دنیا کا عمومی جائزہ لیتے ہوئے اس وقت کے قابل ذکر ممالک اور اقوام کا تذکرہ ان الفاظ میں کیا ہے:

''قدیم روایات کے باوجود چھٹی صدی عیسوی کی اس دنیا میں عربوں کو کوئی اہمیت حاصل نہ تھی۔ حقیقت میں تو کسی کو بھی کوئی اہمیت نہ تھی۔ یہ ایک نزاع کا دور تھا۔ جب کہ مشرقی یورپ اور مغربی ایشیاء کی عظیم سلطنتیں پہلے ہی تباہ و برباد ہو چکی تھیں۔ یا اپنے شاہی دور کے اختتام پر تھیں۔ یہ ایک ایسی دنیا تھی جو اب بھی یونان کی فصاحت، ایران کی عظمت اور روما کی شوکت وجلال سے متحیر تھی اور کوئی ایسا ایک نظریہ یا کوئی ایسا ایک مذہب بھی نہ تھا جو ان میں سے کسی کی جگہ لیتا۔''

''یہودی تمام دنیا میں مارے مارے پھر رہے تھے۔ ان کو کوئی مرکزی راہ نمائی حاصل نہ تھی۔ حالات کے مطابق یا تو ان کو

محض برداشت کیا جاتا یا اذیتیں دی جاتیں۔ کوئی ملک ان کا اپنا ذاتی نہ تھا جس میں وہ پناہ لے سکیں، اور ان کا مستقبل اسی قدر غیر یقینی تھا جس طرح کہ آج ہے۔

''پوپ گریگری اعظم (Grigory The Great) کے حلقہ اثر سے باہر مسیحی اپنے سہل عقائد کے ہر قسم کے پیچیدہ معانی ایجاد کر رہے تھے، اور اس سلسلہ میں ایک دوسرے کا گلا کاٹنے میں مصروف تھے۔''

''ایران میں تعمیر سلطنت کی صرف ایک کرن رہ گئی تھی۔ خسرو ثانی اپنی سلطنت کی توسیع میں مصروف تھا۔ اس نے روما کو شکست دے کر کیپدوشیا (Coppadocia) مصر اور شام پر قبضہ کر لیا تھا۔ اس نے ۶۲۰ عیسوی میں (جب کہ محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بحیثیت رہنما ظاہر ہونے والے تھے) بیت المقدس کو تاخت و تاراج کر کے مقدس صلیب کو چرا لیا تھا اور دارا اول کی زبردست عظمت و شوکت کو دوبارہ قائم کر دیا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ گویا مشرق وسطیٰ کی عظمت کو زندگی کی ایک نئی قسط مل گئی ہے لیکن یہی نہ تھا، بازنطینی رومی اب بھی اپنی گزری ہوئی چستی رکھتے تھے۔ جب خسرو اپنی فوج کو قسطنطنیہ کی فصیلوں پر لایا تو انہوں نے ایک آخری کوشش کر دکھائی۔''

''مشرق بعید میں بھی حالات کوئی نمایاں اثرات نہیں چھوڑ رہے تھے۔ ہندوستان اب بھی چھوٹی چھوٹی غیر اہم ریاستوں پر مشتمل تھا جو سیاسی اور حربی حیثیت سے ایک دوسرے پر فوقیت کے لیے جدوجہد میں مصروف تھیں۔''

''چینی ہمیشہ کی طرح آپس میں نبرد آزما تھے۔ خاندان سوئی آیا اور گیا اور اس کی جگہ ٹینگ نے لے لی جو تین صدیوں تک

حکمران رہا۔“

”اسپین اور انگلستان غیر اہم چھوٹے چھوٹے ملک تھے۔ اسپین وسی گوتھوں (Visigoths) کے زیر اثر تھا جو کچھ عرصہ پہلے ہی فرانس سے جس پر انہوں نے لوائر (Loire) تک قبضہ کر رکھا تھا، نکالے گئے تھے، وہ ان یہودیوں پر مظالم ڈھا رہے تھے جن کو اس مسلم حملہ کے لیے جو ابھی سو برس بعد ہونے والا تھا، آسانیاں پیدا کرنی تھیں۔

”جزائر برطانیہ آزاد ریاستوں میں منقسم تھا۔ ڈیڑھ سو سال رومیوں کو روانہ ہوئے ہو چکے تھے جن کی جگہ نارڈک لوگوں کی آمد نے لے لی تھی۔ خود انگلستان سات مختلف بادشاہتوں پر مشتمل تھا۔“ [باختصار ترجمہ سید قاسم حسنی]

یہ تو اردگرد کی حکومتوں کا ذکر تھا، لیکن خود جزیرہ نما عرب بھی اس سے مختلف نہ تھا کیوں کہ اس میں تو کچھ اور زیادہ خرابیاں تھیں۔ اگرچہ بہت سی خصوصیات بھی تھیں لیکن ان خرابیوں نے ان کی خوبیوں اور خصوصیتوں کو ڈھانپ رکھا تھا اور بیرونی دنیا کو وہ خوبیاں بہت کم نظر آرہی تھیں۔

جزیرہ نما عرب

خود جزیرہ نما عرب جہاں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پیدا ہوئے۔ ہر قسم کی جاہلیت سے اٹا پڑا تھا۔ اگرچہ اس قوم میں ذہانت و فراست، شجاعت و بسالت، جود و سخاوت، حمیت و غیرت، فصاحت و بلاغت اور ایفائے عہد جیسی خصوصیات تھیں، لیکن اس قسم کی گوناگوں خوبیوں کے باوجود ان کی زندگی کے کئی تاریک پہلو بھی تھے۔ سب سے بڑا تاریک پہلو تو یہی تھا کہ نور نبوت سے ان کا رشتہ یک قلم منقطع ہو چکا تھا۔ اس وجہ سے ان کی یہ ساری خوبیاں، خصلتیں، مقاصد دیگر ذلیل کاموں کے لیے وقف ہو کر رہ گئیں۔ حق کے راستہ سے

ان کے قدم کچھ اس طرح پھسلے کہ پھر کئی سو سالوں سے وہ قعر مذلت میں گرتے ہی چلے گئے۔ وہ اگرچہ بلا کے ذہین تھے کہ پاؤں دیکھ کر حسب ونسب کو پہچان لیتے تھے کہ وہ یہ بات نہ جان سکے کہ اپنے ہاتھوں سے تراشے ہوئے بت پرستش کے قابل کس طرح ہو سکتے ہیں؟ یہاں ہمیں یہ بتانا مقصود نہیں کہ عرب کا جغرافیہ کیا تھا؟ وہاں کتنے قبائل سکونت پذیر تھے؟ آس پاس کے ملکوں کے ساتھ ان کے تعلقات کیسے تھے؟ بلکہ یہ بتانا ہے کہ جاہلیت کے وہ کون سے اندھیرے ان پر چھائے ہوئے تھے۔ جن کو دور کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے ایک ''سراج منیر'' ان میں بھیجا جس کے آنے سے نہ صرف جزیرہ نما عرب روشن ہوا بلکہ تمام کائنات ارضی چمک دمک اٹھی، اور اس سے پہلے کے تمام ستاروں کی روشنی ماند پڑ گئی اور پوری دنیا میں فیضان الٰہی کا آفتاب عالم تاب طلوع ہو گیا۔ بہرحال جس معاشرہ میں آپ کا ظہور ہوا اس معاشرہ میں اگرچہ بعض خوبیاں بھی تھیں لیکن ان میں برائیاں بھی کچھ ایسی تھیں جنہوں نے ان کی فکری، نظری اور عملی زندگی کے تمام گوشوں کو تاریک کر رکھا تھا۔

بت پرستی

ان برائیوں میں جنہوں نے ان کی روحانی اور فکری زندگی کو نہ صرف مفلوج بلکہ تباہ و برباد کر کے رکھ دیا تھا اور جس کو ان کی زندگی کا سب سے تاریک گوشہ بھی کہا جا سکتا ہے، وہ یہ تھا کہ عربوں کی پوری سوسائٹی بت پرستی جیسے گھناؤنے گناہ میں مبتلا ہو چکی تھی۔ عرب کا ہر قبیلہ اس شرک میں مبتلا تھا اور شرک ہی ایک ایسا گناہ ہے جس کی قرآن حکیم نے سب سے زیادہ مذمت کی ہے۔ حق تعالیٰ شانہ نے مثبت طور پر جس عقیدے پر سب سے زیادہ زور دیا ہے، وہ توحید ہے اور جس باطل خیال کا پوری شدت کے ساتھ ابطال کیا ہے وہ شرک ہے اور بت پرستی شرک کی سب سے زیادہ گھناؤنی شکل ہے کہ ایک شخص اپنے ہی ہاتھوں سے ایک بت تراش کر پھر اس کی پوجا شروع کر دے اور بت بھی کسی انسان کا۔ جب کہ شاعر مشرق علامہ اقبالؒ فرماتے ہیں کہ

من ندیدم کہ سگے پیش سگے سرخم کرد

یعنی جب ایک کتا دوسرے کتے کے سامنے سر نہیں جھکاتا تو انسان کس قدر علم و دانش سے کورا اور عقل و خرد سے خالی ہے جو نہ صرف ایک انسان کے سامنے بلکہ ایک انسان کے تراشے ہوئے بت کے زمانے اپنا سر جھکاتا ہے۔ شہر مکہ اور بیت اللہ کی بنیاد خود اللہ کے خلیل وحنیف سیدنا ابراہیم علی نبینا وعلیہ الصلوٰۃ والسلام نے اپنے ہاتھوں رکھی۔ اس کی تعمیر کا مقصد خالص اللہ تعالیٰ کی عبادت تھا لیکن جونہی سیدنا ابراہیم علیہ السلام کی تعلیمات کی روشنی مدہم ہوئی او جہالت اور نفس پرستی نے اپنے پنجے گاڑھے تو احکام الٰہی کے بجائے وہ اپنی نفسانی خواہشات کے بندے بن گئے اور اصنام پرستی اور باطل عقائد کو پذیرائی حاصل ہوئی۔ یہاں تک کہ عمرو بن لحی نے بت پرستی کو رواج دیا۔ چنانچہ اصحاب السیر نے لکھا ہے کہ

> ''علمائے کرام کی اس بارہ میں بکثرت تصریحات ہیں کہ سیدنا ابراہیم علیہ السلام کے زمانہ سے لے کر عمرو بن لحی کے زمانہ تک اہل عرب آپ کے عقائد پر ہی ثابت قدم رہے۔ یہ پہلا شخص تھا جس نے دین ابراہیمی کو تبدیل کیا (**فھو اول من غیر دین ابراھیم**) اور اہل عرب کے لیے گوناگوں گمراہیاں شروع کیں اور بتوں کی عبادت کا سلسلہ شروع کیا۔'' [سیرۃ حلبیہ ۱/۱۰]

یہی کچھ علامہ ابن خلدون نے اپنی تاریخ میں لکھا ہے۔ [ابن خلدون ۱/۶۵۱]

بتوں کے بارے میں عربوں کا عقیدہ

ان بتوں کے بارہ میں عربوں کا کیا عقیدہ تھا؟ قرآن حکیم نے اس کو بیان فرمایا ہے۔ عرب ان بتوں کو وسیلہ مانتے تھے اور کہتے تھے کہ یہ ہماری سنتے ہیں، ہماری گواہی دیتے ہیں۔ وہ بتوں کی قسمیں بھی کھاتے تھے اور ان کے سامنے حلف بھی اٹھاتے تھے اور ان کی عبادت بھی کرتے تھے۔ ان کے سامنے سجدہ ریز بھی ہوتے تھے۔ ان کے ناموں پر جانور ذبح کرتے تھے۔ اور اگر کوئی جانور بوڑھا ہو جاتا تو وہ اس کو بت کے نام پر چھوڑ دیتے تھے۔ چنانچہ بت کے نام پر چھوڑے ہوئے بوڑھے اونٹ کو ''حام'' اور اونٹنی کو ''بحیرہ'' کہتے تھے۔

ان بت پرستوں کی کوئی مذہبی شریعت یا دینی احکامات نہیں تھے جو فرد کو سوسائٹی سے وابستہ کرتے ہوں یا فرد پر کچھ فرائض یا حقوق عائد کرتے ہوں، بلکہ اکثر بتوں کو اپنی ضروریات کیلئے استعمال کرتے تھے۔

(The Historians History of the World Vol VII P. 292)

ہر کام کے لیے ان کا الگ الگ بت تھا اور جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے توحید کی دعوت دی تو انہوں نے نہایت حیرت واستعجاب سے کہا: ''کیا اس نے بہت سے خداؤں کی جگہ ایک خدا بنا دیا ہے۔ بے شک یہ بڑی عجیب وغریب بات ہے۔

ملعون عمرو بن لحی نے مال مویشی کی مصلحت وشفقت کی خاطر چند بدعات اور شرکیہ رسومات ایجاد کیں جو محض کذب وافترا کا پلندا تھیں۔قوم نے اندھادھند ان کی تقلید کی اور ملت ابراہیمی جو توحید و وحدانیتِ خداوندی، ردِشرک اور تردیدِ بت پرستی کا مجموعہ تھی، اسے یکسر بدل دیا۔ بغیر دلیل وحجت اور علم ودانش کے سابقہ اقوام کی مشرکانہ راہ ورسم کو پسند کیا اور سیدنا نوح علیہ السلام کی قوم کی شرکیہ اختراع کو اختیار کیا۔[السیرۃ النبویہ بن کثیر ۱/ ۶۷]

اگر چہ اہل عرب بتوں کی پرستش کرتے تھے لیکن پھر بھی ان کے دلوں میں بتوں کی زیادہ عزت نہیں ہوتی تھی، بلکہ کبھی کبھی وہ ان کا مذاق بھی اڑاتے تھے۔اس کا اندازہ اس قصہ سے ہوتا ہے جو ''بلوغ الارب'' میں نقل کیا گیا ہے۔ کہ مالک اور ملکان کنانہ کے دو بیٹے تھے۔ ساحل جدہ پر ان کا ایک بت تھا جس کا نام ''سعد'' تھا۔ وہ ایک لمبی چٹان پر واقع تھا۔ بنی ملکان کا ایک شخص اپنے بہت سے اونٹ لے کر وہاں آیا تا کہ اس بت سے برکت حاصل کرے۔ جب اس نے اپنے اونٹوں کو اس چٹان کے قریب کیا تو وہ چٹان ان جانوروں کے خون سے لت پت تھی جو وہاں اس بت کے تقرب کے لیے ذبح کیے گئے تھے۔اونٹ اس خون کو دیکھ کر کچھ ایسے بدکے کہ اپنی مہار تڑوا کر ادھر ادھر بھاگ گئے۔اپنے اونٹوں کو یوں منتشر ہوتا دیکھ کر وہ غضبناک ہو گیا۔فوراً زمین سے پتھر اٹھایا اور سعد بت کو دے مارا اور غصے میں کہنے لگا۔

''اے جھوٹے خدا! تجھ کو اللہ تعالیٰ کبھی برکت نہ دے، تو نے میرے اونٹوں کو بھگا دیا اور انہیں تتر بتر کر دیا۔''

پھر اس نے بڑی مشکل سے اپنے اونٹوں کو اکٹھا کیا۔ جب وہ وہاں سے روانہ ہوا تو وہ دو شعر پڑھ رہا تھا جن کا ترجمہ یہ ہے:

(۱) ''ہم سعد بت کے پاس آئے تاکہ وہ ہمارے پراگندہ شیرازہ کو منظم کر دے، لیکن ہوا یہ کہ سعد (بت) نے ہماری جمعیت کو تتر بتر کر دیا۔ اب سعد سے ہمارا کوئی تعلق نہیں۔''

(۲) ''سعد کیا ہے؟ لق و دق صحرا میں ایک چٹان ہے۔ نہ وہ گمراہی کی دعوت دے سکتا ہے اور نہ ہی جادۂ حق پر ہمیں رکھ سکتا ہے اور نہ کوئی نفع نقصان ہمیں پہنچا سکتا ہے۔'' [بلوغ الارب:۲/۲۰۸]

اسی طرح کا ایک اور واقعہ پروفیسر ہٹی (Hitti) نے بھی الاغانی کے حوالہ سے نقل کیا ہے کہ امراء القیس اپنے باپ کا انتقام لینے کے لیے روانہ ہوا تو ذوالخلصہ کے مندر میں ٹھہرا تاکہ تیروں سے فال نکلوائے کہ وہ اس انتقام لینے میں کامیاب ہوگا بھی یا نہیں؟ تین دفعہ فال نکالی تینوں دفعہ یہی نکلا کہ ارادہ چھوڑ دو۔ اس نے ٹوٹے ہوئے تیر دیوتا کے منہ پر دے مارے اور زور سے چلایا: ''ملعون! اگر تیرا اپنا باپ مارا گیا ہوتا تو پھر مجھے انتقام لینے سے ہرگز منع نہ کرتا۔'' [الاغانی:۸/۷۰]

کلبی نے لکھا ہے کہ قبیلہ خزاعہ کی ایک شاخ جنوں کی پوجا کرتی تھی۔

[کتاب الاصنام ص۲۴]

قبیلہ حمیر آفتاب کی پرستش کرتا تھا۔ کنانہ چاند کا پرستار تھا۔ بنو تمیم وبران کی لخم اور جذام مشتری کی، قبیلہ طے سہیل کی، بنو قیس شعریٰ کی اور بنو اسد عطارد کی پرستش کرتا تھا۔

[ملاحظہ ہو طبقات الامم ص۴۳۰]

دین ابراہیمی میں تبدیلی

اہل عرب نے بت پرستی کی وجہ سے دین ابراہیمی میں تبدیلی کر دی ہوئی تھی لیکن

اس تبدیلی کے باوجود وہ اپنے آپ کو دین ابراہیمی پر سمجھتے تھے کیوں کہ دین ابراہیمی کی بہت سی عبادات ظاہری شکل میں ان کے اندر موجود تھیں اگر چہ انہوں نے اس کی روح مسخ کر دی ہوئی تھی۔ چنانچہ وہ دین ابراہیمی کے مطابق اپنے مردوں کو غسل دیتے اور ان کی تجہیز و تکفین کر کے نماز جنازہ بھی پڑھتے تھے، لیکن اس کی اصلی روح ان کے ہاں مفقود تھی۔

اسی طرح اگر چہ وہ حج اور عمرہ بھی کرتے اور تلبیہ بھی کہتے تھے لیکن تلبیہ میں بھی اپنی طرف سے کچھ الفاظ بڑھا کر اس کو شرکیہ بنا دیا اور اس سے عقیدہ توحید مسخ ہو کر رہ گیا۔ سیدنا ابراہیم علیہ السلام کے تلبیہ سے توحید کی مہک آتی تھی جب کہ ان مدعیان دین ابراہیمی کے تلبیہ سے شرک کے تعفن سے دماغ پھٹنے لگتے تھے۔ وہ کہتے:

﴿لبیک اللّٰھم لبیک، لاشریک لک الاّ شریکاً هو لک، تملکه و ما ملک﴾ [السیرۃ النبویۃ لابن کثیر: ۱/۶۳]

''حاضر ہیں اے اللہ! ہم حاضر ہیں، تیرا کوئی شریک نہیں ہے بجز اس شریک کے جس کا تو مالک ہے اور اس کی ہر چیز تیری ملکیت میں ہے۔''

وہ یہ بھی کہتے کہ ہم سیدنا ابراہیم علیہ السلام کی اولاد ہیں۔ حرم کے باشندے ہیں، بیت اللہ کے متولی ہیں، اسی لیے جو اختیارات حقوق اور امتیازات ہمیں حاصل ہیں وہ دوسرے عربوں کو حاصل نہیں ہیں۔ ہم صرف ان چیزوں کی تعظیم و تکریم بجالائیں گے جو حرم کے اندر ہیں، لیکن جو مواقف و مشاعر حرم سے باہر ہیں، ان کی تعظیم دوسرے عربوں پر تو لازم ہے لیکن ہم پر لازم نہیں ہے ورنہ ہم میں اور ان میں کیا امتیاز باقی رہے گا؟ چنانچہ اس وجہ سے اہل مکہ نے قیام عرفہ کو ترک کر دیا تھا اور طواف افاضہ کو بھی انہوں نے چھوڑ دیا تھا۔ اہل حرم میں ہونے کی وجہ سے انہوں نے اپنے اوپر یہ پابندی لگا دی تھی کہ وہ گھی اور پنیر نہیں کھائیں گے۔ ان کے علاوہ انہوں نے اور بھی کئی پابندیاں اپنے اوپر لگائی ہوئی تھیں۔

جاہلی معاشرہ میں عورت کے ساتھ ظلم و زیادتی اور بدسلوکی عام طور سے روا سمجھی جاتی تھی، اس کے حقوق پامال کیے جاتے تھے بلکہ حقوق کچھ تھے ہی نہیں۔ اس کے مال کو مرد

اپنا مال سمجھتے تھے اور اس کو مال میں سے کچھ حصہ نہ دیتے تھے۔ شوہر کے مرنے یا طلاق دینے کے بعد اس کو اجازت نہیں تھی کہ اپنی پسند سے دوسرا نکاح کر سکے۔

مختصر یہ کہ صنف نازک مردوں کے ظلم وستم کا شکار بنی ہوئی تھی۔ مرد مرد نہیں بلکہ صنف نازک کے لیے جنگل کا درندہ تھا۔ عورت کا مقصد صرف نسل انسانی کی ترقی اور مرد کی خدمت کرنا رہ گیا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ لڑکیوں کی پیدائش باعث ننگ و عار تھی۔ پیدا ہونے کے ساتھ ہی ان کو زندہ درگور کر دینا لوگوں نے اپنا وطیرہ افتخار و شرافت سمجھ رکھا تھا۔ چنانچہ قرآن حکیم میں مختلف سورتوں میں اس کو بیان کیا گیا ہے۔ [ملاحظہ ہو النحل: ۷، زخرف: ۲، تکویر: ۱۰ وغیرہ]

ہیثم بن عدی نے ذکر کیا ہے کہ لڑکیوں کو زندہ درگور کرنے کا اصول عرب کے تمام ہی قبائل میں پایا جاتا تھا، ایک اس پر عمل کرتا دس چھوڑتے تھے۔ یہ سلسلہ اس وقت تک جاری رہا جب تک کہ اسلام نہیں آیا۔

اس سلسلہ میں سنن دارمی میں ایک روایت ہے کہ ایک شخص نے خدمت نبوی میں آکر عرض کی: ''یارسول اللہ! ہم لوگ جاہلیت والے تھے۔ بتوں کو پوجتے تھے اور اپنی اولاد کو مار دیتے تھے۔ میری ایک لڑکی تھی، جب میں اس کو بلاتا تو وہ دوڑ کر میرے سامنے آتی۔ ایک روز وہ میرے بلانے پر خوشی خوشی دوڑی آئی۔ میں آگے بڑھا اور وہ میرے پیچھے پیچھے چلی آئی۔ میں آگے بڑھتا چلا گیا۔ جب ایک کنویں کے پاس پہنچا جو میرے گھر سے کچھ دور نہ تھا اور لڑکی اس کے قریب پہنچی تو میں نے اس کا ہاتھ پکڑا اور اسے کنویں میں پھینک دیا۔ وہ ابا ابا کہہ کر پکارتی رہی اور یہی اس کی زندگی کی آخری آواز تھی۔'' سرکار دو عالم ﷺ اس کے اس پر درد افسانہ کو سن کر اپنے آنسو ضبط نہ کر سکے۔

لڑکیوں وغیرہ کا یہ قتل بعض لوگ ننگ و عار کی بنا پر کرتے اور بعض مفلسی اور ناداری کے ڈر سے اولاد کو مار دیتے۔ عرب کے بعض شرفاء اور رؤساء ایسے موقع پر بچوں کو خرید لیتے اور ان کی جان بچاتے۔ چنانچہ مشہور شاعر فرزدق کے دادا صعصعہ نے اس میں بڑا نام پیدا کیا۔ اسلام لانے کے بعد وہ سرکار دو عالم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر کہنے لگے: ''یارسول اللہ! میں نے ۳۶۰ لڑکیوں کو موت کے منہ سے بچایا ہے، کیا مجھ کو اس کا

ثواب ہوگا؟'' آپ ﷺ نے فرمایا: ''ہاں، آپ کو ضرور ثواب ملے گا کیوں کہ خدا نے تم کو مسلمان بنا کر تم پر احسان کیا ہے۔'' [ملاحظہ ہو تفسیر در منثور تفسیر اذا الشمس کورت]

سیدنا عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کے چچا زید بن عمرو بن نفیل نے بھی ایسی کئی لڑکیوں کی پرورش کی تھی۔ [بخاری: ۱/۱۵۴۰]

یہ ایک نامکمل سی تصویر ہے اس جاہلیت کی جو سرکار دو عالم ﷺ کی بعثت سے قبل تمام دنیا میں اور بالخصوص عرب میں تھی۔ اسی وجہ سے اس عہد کو ''جاہلیت'' کے نام سے تعبیر کیا گیا ہے۔ جاہلیت عمدہ کھانوں، عالی شان محلات اور بنگلوں، فرنشڈ کمروں، زرق برق لباس کے نہ ہونے کا نام نہیں۔ یہ سب کچھ ہونے کے باوجود بھی جاہلیت ہوسکتی ہے۔ اگر انسانوں میں انسانی اقدار کا فقدان ہو، انسانیت اخلاق کی بلندی اور نجابت وشرافت کا نام ہے۔ سر بفلک محلات، عمدہ اور فرنشڈ بنگلوں، لمبی لمبی کاروں اور مرغن غذاؤں کا نام نہیں۔ سرکار دو عالم ﷺ نے اپنی ۲۳ سالہ نبوت کی زندگی میں ۸۱ جنگیں لڑیں جن میں ۲۷ میں آپ خود شریک ہوئے۔ ان تمام غزوات میں (یعنی ۸۱ غزوات میں) کل ۱۰۱۸ آدمی ہلاک ہوئے جن میں ۲۵۹ مسلمان اور باقی ۷۵۹ غیر مسلم تھے، لیکن دور حاضر کی دو جنگوں میں جو لوگ مارے گئے ان کی تعداد چار کروڑ کے قریب ہے۔

اگر نظر غائر سے دیکھا جائے تو پتہ چلتا ہے کہ سرکار دو عالم ﷺ نے ۲۳ سال کے مختصر عرصہ میں دنیا میں ایک غیر خونی انقلاب برپا کر دیا۔ (اس اعتبار سے آپ ''پیغمبر انقلاب'' ہیں۔) جب کہ موجودہ جاہلیت (جس کو جاہلیت جدیدہ بھی کہا جاسکتا ہے) کے دور میں چار کروڑ انسانوں کو قتل کر کے بھی دنیا میں کوئی انقلاب نہ آیا بلکہ ایک بے مقصد جنگ ہوتی رہی جو کہ جاہلیت کا ایک زندہ ثبوت ہے۔ اسی طرح موجودہ دور میں عراق اور افغانستان میں امریکہ اور اس کے اتحادی جمہوریت کے نام پر جو قتل عام کر رہے ہیں، وہ بھی ایک جاہلیت ہے کیوں کہ جب جمہور ہی موت کے گھاٹ اتار دیئے گئے تو جمہوریت کہاں قائم ہوگی؟

﴿طلوع آفتاب نبوت﴾

جب پوری دنیا گناہوں کی غلاظت اور عصیان و نافرمانی کی گندگی میں اس قدر غلطاں تھی جس کا مختصر تذکرہ گزشتہ صفحات میں کیا گیا ہے تو رحمت خداوندی کو جوش آیا اور سرزمین مکہ میں ایک دعائے خلیل اور نوید مسیحا سیدنا و مولانا محمد ﷺ مبعوث ہوئے۔ مکہ پہاڑوں کے درمیان ایک پتھریلی زمین پر واقع ہے۔ نہایت چھوٹا سا شہر، زمین پتھریلی، راستے مسدود، وسائل حیات نہایت محدود۔ قرآن حکیم میں مکہ کا نام بکہ آیا ہے (۹۶:۴) ابن ہشام نے سیرۃ میں لکھا ہے کہ ''اس کا نام بکہ اس لیے ہوا کہ یہ جابر اور ظالم حکمرانوں کی گردنیں توڑ دیتا ہے۔ جب وہ اس سرزمین پر ظلم کرتے ہیں۔'' [سیرت ابن ہشام: ۷۳/۱]

انبیاء علیہم السلام بڑے عالی نسب ہوتے ہیں۔ خود سرکار دو عالم ﷺ بھی تمام قریش میں اعلیٰ نسب کے مالک تھے۔ چنانچہ ابو سفیان نے بھی حالت کفر میں قیصر روم کے دربار میں یہ اقرار کیا تھا کہ ''ھو فینا ذو نسب'' وہ ہم میں بڑے نسب والا ہے۔

حافظ ابن حجرؒ نے ''فتح الباری'' میں روایت ان الفاظ میں نقل کی ہے۔

﴿هو فى حسب مالا يفضل عليه احد قال: هذه آية﴾

[فتح الباری: ۱۶۲/۸]

''حسب و نسب میں ان سے بڑھ کر کوئی نہیں۔ قیصر نے کہا کہ یہ بھی ایک نشانی ہے کہ وہ اللہ کا رسول ہے۔''

آپ ﷺ کب پیدا ہوئے؟ تاریخ کے اوراق سے پتہ چلتا ہے کہ سیدنا مسیح علیہ السلام کو آسمانوں پر گئے ہوئے قریباً چھ سو سال گزر چکے تھے، اور وہ آنے والے پیغمبر کے لیے ایک نہیں کئی مواقع پر پیش گوئیاں کر چکے تھے۔ لیکن سنہ کے لحاظ سے مورخین لکھتے ہیں کہ ۲۲ اپریل ۵۷۱ء کو آپ عرب کی سرزمین مکہ میں پیدا ہوئے۔ رات کی سیاہی چھٹ رہی تھی اور صبح کا اجالا پھیلنے لگا تھا کہ خانہ کعبہ کے متولی اور مکہ کے سردار خواجہ عبدالمطلب کی

جواں سال بیوہ بہو کے ہاں پہلا بیٹا پیدا ہوا جس نے نہ صرف بیوہ ماں کے بھاگ جگا دیئے بلکہ پوری انسانیت جو صدیوں سے ظلم وستم کی چکی میں پس رہی تھی، اس کے لبوں پر مسکراہٹیں بلکہ خوشی کے ترانے کھیلنے لگے۔ آپ کی پیدائش سے نہ صرف عبداللہ کے کلبہ احزان میں خوشی ومسرت کی روشنی جگمگانے لگی تھی بلکہ ہر حرماں نصیب کے غم خانہ میں امید کی کرنیں روشنی پھیلانے لگیں۔ آپ ﷺ کی پیدائش سے نہ صرف مکہ وحجاز کے خدا فراموش اور خود فراموش باشندے خدا شناس اور خود شناس وخودنگر بنے بلکہ عرب وعجم کے ہر باشندے کے لیے مے خانہ معرفت کے دروازے کھل گئے۔ آپ ﷺ کے آنے سے خزاں کی چیرہ دستیوں سے تباہ حال گلشن انسانیت میں ابدی بہار آ گئی۔ سر بگریباں غنچے خوشی اور مسرت سے پھولے نہیں سما رہے تھے۔ پھولوں کو شگفتگی اور کلیوں کو مسکراہٹ مل گئی۔ علم و آگہی کے بحر ناپیدا کنار میں جو آبدار موتی آغوش صدف میں صدیوں سے بے مصرف پڑے تھے، ان میں شوق نمود انگڑائیاں لینے لگا۔ آپ پیدائش کے وقت عام بچوں کی طرح کمزور نہ تھے بلکہ تندرست اور طاقتور تھے۔ بچپن ہی سے یہ حال تھا کہ جو دیکھتا، پکار اٹھتا: ''انّ لهذا الغلام لشأنا'' اس بچے کی بھی عجیب شان ہے۔

خواجہ عبدالمطلب کو جب آپ ﷺ کی ولادت کی خبر پہنچی تو آپ بیت اللہ میں تشریف لے گئے اور بارگاہ الوہیت میں اللہ تعالیٰ کا شکریہ ادا کیا۔ بعض کتابوں میں ہے کہ اس وقت خواجہ عبدالمطلب کی زبان پر حسب ذیل اشعار جاری ہو گئے

الحمد لله الذی اعطانی هذا الغلام الطیب الاردان

''یعنی سب تعریفیں اس اللہ تعالیٰ کے لیے ہیں جس نے مجھے پاک آستینوں والا یہ بچہ عطا فرمایا۔''

قد ساد فی المهد علی الغلمان اعیذه بالبیت ذی الارکان

''یہ سردار ہے اپنے پنگھوڑے میں سب بچوں کا، اور میں اسے بیت اللہ کی پناہ میں دیتا ہوں۔''

حتی اراه بالغ البنیان اعیذه من شر ذی شنان

من حاسد مضطرب العیان

''حتی کہ میں اسے توانا اور مضبوط دیکھوں، میں اس کو ہر دشمن اور ہر حاسد اور آنکھوں کے گھمانے والے کے شر سے اللہ تعالیٰ کی پناہ میں دیتا ہوں۔'' [السیرۃ النبویہ لابن کثیر:۱/۲۱۱، طبقات ابن سعد:۱/۱۱۷]

بعض روایات میں ہے کہ سرکار دو عالم ﷺ جب پیدا ہوئے تو آپ مختون تھے اور آپ کی ناف کٹی ہوئی تھی۔ آپ کے دادا خواجہ عبدالمطلب کو جب ان باتوں کا پتہ چلا تو آپ کو بڑا تعجب ہوا اور بات بھی تعجب ہونے والی تھی کیوں کہ اس سے قبل نہ کبھی ایسا دیکھا اور نہ سنا۔ اس وجہ سے آپ نے فرمایا:

﴿لیکونن لابنی شان﴾

''میرے اس بچے کی بہت بڑی شان ہوگی۔''

بعض روایات میں ہے کہ آپ مختون پیدا ہوئے تھے، لیکن کچھ روایات میں یہ بھی ہے کہ ساتویں روز خواجہ عبدالمطلب نے تمام قریش کو دعوت دی اور اپنے اس پوتے کا ختنہ اور عقیقہ کیا۔ دعوت میں شمولیت کرنے والوں نے پوچھا کہ آپ نے اس نومولود کا نام کیا رکھا تو خواجہ عبدالمطلب نے فرمایا: ''میں نے اپنے اس پوتے کا نام ''محمد'' رکھا ہے۔ پوچھا گیا کہ یہ نام رکھنے کی کیا وجہ ہے تو آپ نے فرمایا کہ میں نے یہ نام اس لیے رکھا ہے کہ آسمانوں میں اللہ تعالیٰ اور زمین میں اس کی مخلوق اس نومولود کی تعریف کرے چنانچہ لغت عرب میں ''محمد'' کا مطلب ہے: ''کل جامع بصفات الخیر یسمّٰی محمداً'' یعنی جو شخص خیر کی تمام صفات کا جامع ہو اسے محمد کہا جاتا ہے۔

''محمد'' باب تفعیل میں سے ہے۔ اس باب میں استمرار پایا جاتا ہے۔ اس خاصہ کے مطابق اسم ''محمد'' کا مطلب یہ ہوگا کہ وہ ذات جس کی ہر لحہ نو بنو تعریف اور حمد وثناء کی جاتی ہو۔ [خاتم النبیین، الاستاذ محمد ابوزھرہ:۱/۱۱۵]

امام بیہقیؒ نے بھی یہی لکھا ہے کہ لغت عرب میں ''محمد'' اس ہستی کو کہتے ہیں جس کی بار بار تعریف کی جائے کیونکہ اس باب میں فعل کا تکرار پایا جاتا ہے۔ [الروض الانف:۱/۱۸۲]

ایک اور روایت میں ہے کہ آپ ﷺ کی والدہ کو بتایا گیا کہ نومولود کا نام "احمد" رکھنا چنانچہ آپ ﷺ کا نام احمد رکھا گیا۔ بعض روایتوں میں دونوں نام مذکور ہیں۔

احمد اسم تفضیل کا صیغہ ہے اس کا معنی ہے "ہر حمد کرنے والے سے زیادہ اپنے رب کی حمد کرنے والا۔"

سرور کائنات ﷺ کے پورے خاندان میں کبھی کسی نے یہ نام نہیں رکھا تھا۔ اسی وجہ سے تمام قریش نے بڑے تعجب سے یہ نام رکھنے کی وجہ دریافت کی تو خواجہ عبدالمطلب نے کہا کہ میں نے یہ نام اس لیے رکھا ہے کہ حق تعالیٰ شانہ آسمان پر اور اس کی مخلوق زمین پر اس کی تعریف کرے۔ [فتح الباری: ۷/۱۲۴، البدایہ والنہایہ: ۲/۲۲۵]

قاضی عیاض نے ایک روایت اس بارے میں یہ نقل فرمائی ہے کہ سرکار دو عالم ﷺ عالم وجود میں آنے اور "محمد" ہونے سے قبل "احمد" تھے کیوں کہ آپ کا یہ اسم گرامی سابقہ کتب میں مذکور تھا۔ چنانچہ سیدنا مسیح علیہ السلام نے اسی نام سے آپ کو یاد کیا ہے۔

[الشفا: ۱/۳۱۴]

علماء نے لکھا ہے کہ خلقت کے لحاظ سے آپ سب سے پہلے نبی ہیں، چنانچہ اس سلسلہ میں امام ترمذی نے سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کی ہے کہ ایک مرتبہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے آپ سے دریافت کیا:

"یا رسول اللہ! آپ کو نبوت کب ملی؟" آپ ﷺ نے فرمایا: "اس وقت جب کہ آدم علیہ السلام ابھی جسم اور روح کے درمیان تھے۔"

اس مضمون کی اور بہت سی احادیث مختلف کتابوں میں مرقوم ہیں۔ ایک روایت میں ہے:

﴿کنت اول النبیین فی الخلق و آخرھم فی البعث﴾

[تفسیر ابن کثیر: ۸/۸۹، کنز العمال: ۱۱/۴۵۲، الدر المنثور: ۵/۸۴]

"میں خلقت کے لحاظ سے سب سے پہلا نبی ہوں اور بعثت کے لحاظ سے سب سے آخری۔"

اس سلسلہ میں امام سیوطی نے خصائص ۲/ ۱۹۷ اور حافظ ہیثمی نے مجمع الزوائد ۷/ ۲۷ وغیرہ میں بھی روایات نقل کی ہیں:

ان تمام روایات سے ثابت ہوتا ہے کہ

(۱) آپ عالم ارواح میں منصب نبوت سے حقیقتاً سرفراز تھے۔

(۲) اسی طرح صفت وجود میں بھی آپ کی ذات اقدس سب سے مقدم تھی۔

(۳) اسی طرح صفت نبوت میں بھی آپ کا سب سے مقدم ہونا ثابت ہوتا ہے۔

اس بارے میں امام العصر حضرت مولانا سید محمد بدر عالم مہاجر مدنیؒ فرماتے ہیں کہ

''قدرت کی طرف سے کسی کمال کے اضافہ کی دو صورتیں ہوتی ہیں۔ کبھی وہ عالم وجود میں آنے کے بعد کمال کا اضافہ کرتی ہے اور کبھی وجود سے پہلے عالم ارواح ہی میں اس کمال سے نواز دیتی ہے جس کا ظہور قالب انسانی میں مقدر ہو چکا ہے۔ دونوں صورتوں میں اس کمال کا علم اللہ تعالیٰ کی ذات پاک کو یکساں ہوتا ہے۔ ہاں مخلوق کو پہلی صورت کا علم اس وقت حاصل ہوتا ہے جب کہ وہ کمال اس کے مشاہدہ میں آجائے، اور دوسرے کمال کے علم کی اس کے سوا کوئی صورت نہیں کہ کوئی مخبر صادق اس کی خبر دے دے۔ یہاں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد سے ہمیں اس بات کا علم ہو گیا ہے کہ کمال نبوت آپ کو اس وقت حاصل ہو چکا تھا جب کہ آدم علیہ السلام انسانی صورت پر استوار بھی نہ ہونے پائے تھے، اور اسی وقت انبیاء علیہم السلام سے آپ کے لیے ایمان ونصرت کا عہد بھی لے لیا گیا تھا تا کہ معلوم ہو جائے کہ آپ کی رسالت عامہ ان کو بھی شامل ہے۔ اس لحاظ سے سب سے پہلے نبی آپ ہوئے، مگر جسد عنصری کے لحاظ سے آپ کا ظہور سب سے آخر میں ہوا، اس لیے آپ آخر الانبیاء بھی کہلائے، مگر اس معنی میں نہیں کہ آپ کو نبوت سب سے آخر میں ملی ہے بلکہ اس معنی

سے کہ آپ کا ظہور سب سے آخر میں ہوا ہے۔'' [ترجمان السنہ:۱/۳۸۰]

علماء نے لکھا ہے کہ اصل اولیت یعنی باعتبار خلق و اتصاف نبوت سرکار دو عالم ﷺ ہی کو حاصل ہے گو بلحاظ وجود عنصری سیدنا آدم علیہ السلام کی تشریف آوری سب سے اول ہوگئی ہے۔ بعض احادیث میں آپ کو فاتح نبوت اور خاتم نبوت دونوں قرار دیا گیا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ ازل میں آپ کی نبوت اور ختم نبوت دونوں صرف تقدیر کے معنی میں نہ تھے کیونکہ تقدیر تو سب کے لیے یکساں ہے بلکہ اس منصب سے سرفرازی کے لحاظ سے ہے۔

آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بارے میں انبیاء علیہم السلام سے عہد

اللہ تعالیٰ نے آپ کے بارے میں انبیاء علیہم السلام سے عہد لیا جس کا ذکر سورۃ آل عمران میں کیا گیا ہے۔ ارشاد خداوندی ہے:

﴿وَ اِذْ اَخَذَ اللّٰهُ مِيْثَاقَ النَّبِيّٖنَ لَمَا اٰتَيْتُكُمْ مِّنْ كِتٰبٍ وَّ حِكْمَةٍ، ثُمَّ جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ مُّصَدِّقٌ لِّمَا مَعَكُمْ لَتُؤْمِنُنَّ بِهٖ وَ لَتَنْصُرُنَّهٗ﴾ [آل عمران:۸۱]

''(اور وہ وقت یاد کیجئے) جب اللہ نے نبیوں سے عہد لیا تھا کہ ہم جو تمہیں کتاب وحکمت دیں، پھر خدا کا رسول تمہارے پاس آئے اور جو کتاب تمہارے پاس ہو اس کی تصدیق کرے تو ضرور اس پر ایمان لانا اور ضرور اس کی مدد کرنا۔''

حافظ تقی الدین سبکیؒ نے اس بارے میں ایک رسالہ لکھا ہے جس میں لکھا ہے کہ ازل میں اللہ تعالیٰ نے تمام انبیاء علیہم السلام سے سرکار دو عالم ﷺ کے لیے اسی قسم کا عہد لیا تھا، جیسا کہ امتوں سے نبیوں کے لیے اور رعایا سے خلفاء کے لیے اطاعت اور نصرت کا عہد لیا جاتا ہے، لہٰذا انبیاء تو صرف نبی ہیں اور سرکار دو عالم ﷺ نبی الانبیاء ہیں۔ اس حقیقت کا عالم ارواح میں جہاں بھی انبیاء علیہم السلام کا اجتماع ہوا، اظہار کیا گیا۔ پہلے یہ اجتماع شب معراج میں ہوا جب کہ تمام انبیاء علیہم السلام بیت المقدس میں صفیں باندھے بیٹھے تھے اور نماز

کے لیے امام کی تلاش ہو رہی تھی، چنانچہ جبرئیل امین نے آپ کو ہاتھ سے پکڑ کر امامت کے مصلّی پر کھڑا کر دیا، اور اس طرح آپ ہی کی ذات گرامی امامت کی مستحق ٹھہری۔ دوسرا اجتماع قیامت کے روز ہوگا۔ وہاں بھی تمام انبیاء کرام علیہم السلام آپ ہی کے جھنڈے کے نیچے ہوں گے جب کہ ہر امت اپنے اپنے نبی کے جھنڈے کے نیچے ہوگی۔

تیسری بار شفاعت کا مرحلہ ہوگا یہاں بھی سب کا خطیب اور امام آپ ہی کی ذات گرامی ہوگی۔ دوسرے لفظوں میں اسے یوں سمجھئے کہ جو منصب نبوت آپ کو اس امت کے لیے حاصل ہے وہی منصب آپ کو بلحاظ انبیاء بھی حاصل ہے۔ اگر اس دنیا میں بھی کہیں انبیاء علیہم السلام کا آپ کے ساتھ اجتماع ہو جاتا تو یہاں بھی یہی حقیقت عیاں ہو جاتی۔ چنانچہ سیدنا عیسیٰ علیٰ نبینا وعلیہ الصلوٰۃ والسلام جب اس عالم میں دوبارہ تشریف لائیں گے تو ان کا تعلق آپ کی شریعت کے ساتھ وہی ہوگا جو آپ کی تمام امت کا ہے۔

یہ میثاق حدیث کی روایات کے مطابق سیدنا آدم علیہ السلام سے لے کر سیدنا عیسیٰ علیہ السلام تک تمام انبیاء علیہم السلام سے عالم ارواح سے لیا گیا تھا کہ ہر نبی سرکار دو عالم ﷺ پر ایمان لائے گا اور آپ کی رسالت کی تصدیق کرے گا، اور تمام مہمات میں آپ ﷺ کی نصرت کرے گا۔ اللہ تعالیٰ نے یہ عہد لینے کے بعد اس کی تاکید کے لیے ان سے صراحتاً اقرار کروایا اور پھر اس کی مزید تاکید کے لیے فرمایا کہ ''تم اس پر گواہ رہنا اور میں بھی گواہوں میں سے ہوں۔'' پھر اس کے بعد فرمایا کہ ''پھر اس کے بعد جو عہد سے پھرا وہی لوگ نافرمان ہیں۔'' بعض مفسرین نے لکھا ہے کہ یہ کلام انبیاء کرام علیہم السلام کی امتوں کی طرف متوجہ ہے کیوں کہ حق تعالیٰ شانہ سے عہد کرنے کے بعد اس عہد سے پھرنا انبیاء کرام علیہم السلام سے ممکن نہیں ہوسکتا، لیکن علامہ سید محمود آلوسی قدس سرہ نے لکھا ہے کہ یہ بھی جائز ہے کہ یہ کلام انبیاء علیہم السلام کی طرف متوجہ ہو یعنی بفرض محال اگر نبیوں میں سے بھی کوئی اس عہد سے پھرا اور اس نے اس میثاق سے روگردانی کی تو وہ بھی فاسق ہو جائے گا اور اس میں ان کی امتوں سے تعریضاً خطاب ہے یعنی صراحتاً انبیاء علیہم السلام کی طرف اسناد ہے اور کنایۃً ان کی امتوں کی طرف۔ [روح المعانی: ۳/۲۱۴]

یہاں بعض حضرات ایک شبہ بیان کرتے ہیں کہ اس آیت میں ان انبیاء علیہم السلام سے میثاق لینے کا ذکر ہے جن پر کتاب نازل کی گئی ہے، اور وہ صرف ۳۱۳ ہیں۔ اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ تمام انبیاء علیہم السلام سے میثاق لیا گیا۔ اس کا جواب یہ ہے کہ جن نبیوں پر کتاب نازل نہیں کی گئی وہ بھی ان نبیوں کے حکم میں ہیں جن پر کتاب نازل کی گئی ہے کیوں کہ ان کو نبوت اور حکمت دونوں عطا کی گئی ہیں۔ نیز جن انبیاء علیہم السلام کو کتاب نہیں دی گئی ان کو یہ حکم دیا گیا کہ وہ سابق نبی کی کتاب پر عمل کریں۔ دوسری بات یہ ہے کہ آیت میں کتاب اور حکمت سے مراد دین ہے اور تمام انبیاء علیہم السلام کا دین ایک ہی ہے البتہ شریعت ہر ایک کی مختلف ہے۔ چنانچہ امام بخاری نے اپنی کتاب میں روایت نقل کی ہے کہ سرکار دو عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

> ''تمام انبیاء علاتی بھائی ہیں۔ (علاتی بھائی وہ ہوتے ہیں جن کا والد ایک ہو اور والدہ مختلف ہو) ان کی مائیں (شرائع) مختلف ہیں اور ان کا دین واحد ہے۔'' [بخاری:۱/۴۹۰]

اس آیت سے معلوم ہوا کہ تمام انبیاء علیہم السلام رسول اللہ ﷺ کی تقدیراً امت ہیں اور ہم آپ کی تحقیقاً امت ہیں۔ اگر کوئی نبی آپ کی حیات میں مبعوث ہوتا تو آپ پر ایمان لانا اور آپ کی نصرت کرنا اس پر ضروری ہوتا۔ چنانچہ امام احمد بن حنبلؒ سیدنا جابر رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کرتے ہیں کہ

> ''بے شک موسیٰ اگر تمہارے سامنے زندہ ہوتے تو میری اتباع کرنے کے سوا ان کے لیے اور کوئی چارۂ کار نہ تھا۔'' [مسند احمد:۳/۳۳۸]

اس آیت کی تفسیر میں عارفین نے کہا ہے کہ رسول اللہ ﷺ ہی نبی مطلق، رسول حقیقی اور مستقل شارع ہیں اور آپ کے علاوہ دوسرے تمام انبیاء آپ ﷺ کے تابع ہیں۔'' [روح المعانی:۳/۲۱۰]

آپ ربوبیت خداوندی کے شاہد اول ہیں۔ روز الست میں جب اللہ تعالیٰ نے تمام بنی آدم کی پیٹھوں سے ان کی اولاد کو نکالا اور ان کو اپنی جانوں پر گواہ بنایا کہ کیا میں تمہارا

ربّ نہیں ہوں؟ انہوں نے جواب دیا: ''بے شک ہیں، ہم گواہی دیتے ہیں۔'' یہ اس لیے کہا کہ کہیں قیامت کے روز عذر کرنے لگو کہ ہم کو اس کی خبر نہ تھی۔'' [الاعراف: ۱۷۲]

جب اللہ تعالیٰ کی طرف سے تمام مخلوق کو یہ سوال ہوا کہ کیا میں تمہارا رب نہیں ہوں؟ تو ساری مخلوق خاموش تھی اور سب سے پہلے رسول اللہ ﷺ نے جواب دیا: ''بلٰی'' کیوں نہیں، تو ہمارا رب ہے۔'' آپ ﷺ کے جواب کے بعد پھر دوسری مخلوق نے جن میں انبیاء علیہم السلام بھی شامل تھے، اللہ تعالیٰ کی ربوبیت کے اثبات کیا۔

حافظ سید محمود آلوسیؒ نے لکھا ہے کہ

''بعض اہل اللہ نے لکھا ہے کہ جب سیدنا آدم علیہ السلام کی پشت سے ان کی اولاد کے ذروں کو نکالا گیا تو سب سے پہلے سرکار دو عالم ﷺ کے ذرہ نے جواب دیا تھا، اور جب اللہ تعالیٰ نے آسمانوں اور زمین سے یہ فرمایا تھا: ''خوشی یا ناخوشی سے دونوں حاضر ہو جاؤ تو دونوں نے کہا ہم خوشی سے حاضر ہوئے۔'' [حم السجدۃ: ۱۱] اس وقت زمین کے جس ذرہ نے سب سے پہلے جواب دیا تھا وہ نبی کریم ﷺ کا ذرہ تھا۔ اور یہ کعبہ کی مٹی کا ذرہ تھا۔ اور سب سے پہلے زمین کا یہی حصہ بنایا گیا تھا، پھر اسی کو پھیلایا گیا جب کہ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ جب آپ کی تربت (مٹی) کعبہ کی مٹی تھی تو آپ کا مدفن بھی کعبہ میں ہونا چاہیے تھا کیوں کہ روایت ہے کہ جس جگہ کی مٹی سے انسان بنایا جاتا ہے اسی جگہ اس کا مدفن ہوتا ہے، لیکن کہا گیا ہے کہ جب طوفان آیا تو ایک جگہ کی مٹی دوسری جگہ پہنچ گئی تھی، اور مٹی کا وہ پاک ذرہ جو سرکار دو عالم ﷺ کا مبداء تھا اس جگہ پہنچ گیا جہاں اب مدینہ طیبہ میں سرکار دو عالم ﷺ کا مدفن ہے، اور اس سے یہ مستفاد ہوتا ہے کہ سرکار دو عالم ﷺ کی تخلیق اصل ہے اور تمام کائنات آپ ﷺ کی تابع ہے۔ ایک قول یہ ہے

کہ چونکہ آپ کا ذرہ تمام مخلوق کی ام (اصل) ہے اسی وجہ سے آپ کا لقب ''امی'' ہے۔'' [روح المعانی:۹/۱۱۱، سیرت حلبیہ:۱/۱۴۷]

اس عہد اور میثاق کے بارے میں ملاحظہ ہو۔

[ترمذی رقم ۳۰۸۶، سنن ابی داؤد رقم ۴۷۰۳، مسند احمد ۱/۳۱۱، ابن حبان رقم ۶۱۶۶، موطا امام مالک رقم ۱۶۶۱، مستدرک حاکم ۱/۲۷، ۲/۳۲۴، التمہید لابن عبدالبر ۶/۲۰۳]

سیرت کی جامعیت

اس کتاب میں آپ کی مکمل سیرت بیان کرنا مقصود نہیں کیوں کہ اس موضوع پر قبل ازیں ہماری کتاب ''سیرۃ خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم'' موجود ہے۔ اس کتاب میں آپ کی جامعیت کو اجاگر کرنا اور بتانا مقصود ہے کہ آپ نے نہ صرف عبادات کے طریقے بتائے بلکہ دنیا میں اچھے طریقے سے رہنے کے لیے تجارت کے طریقے بھی وضاحت کے ساتھ بتائے بلکہ قیامت تک آنے والے تاجروں کو تجارت کے اصول بھی بتا دیئے جن کی روشنی میں اچھی قسم کی نفع آور تجارت کی جاسکتی ہے۔

آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے تجارت کرنے کے فضائل ومسائل اور اصول جو بتائے ان کو بیان کرنے سے قبل یہ بتانا ضروری ہے کہ پیغمبر دنیا میں کیا لینے کے لیے آتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں اس کو یوں بھی کہا جاسکتا ہے کہ بنیاد نبوت کیا ہے؟

موجودہ زمانے اور اس سے قبل بھی یہ ایک مسلمہ نظریہ ہے کہ آفتاب کی روشنی تو اپنی ذاتی ہے لیکن چاند کی روشنی اپنی ذاتی نہیں بلکہ سورج ہی کی روشنی اس میں سے ہو کر گزرتی ہے۔ سورج کی روشنی گرم اور جلا دینے والی اور چاند کی روشنی ٹھنڈی اور جلا بخشنے والی ہے۔ سورج کی گرم اور تپش والی روشنی جب چاند میں سے ہو کر گزرتی ہے تو اس میں ٹھنڈک پیدا ہو جاتی ہے۔ اسی طرح پاور ہاؤس سے جو بجلی نکلتی ہے وہ نہایت گرم اور ہلاک کر دینے والی ہے۔ کوئی شخص اگر اس کو ہاتھ لگائے تو نہ صرف وہ اس کو اپنی طرف کھینچتی ہے بلکہ جلا دیتی ہے۔ لیکن اسی بجلی کو جب ریفریجریٹر میں سے گزارا جاتا ہے تو اس کی خاصیت بدل جاتی ہے۔ اب وہ جلانے کے بجائے ٹھنڈک اور برودت پہنچاتی ہے، حالانکہ بجلی کا مزاج گرم تھا لیکن اب وہی ٹھنڈی ہو جاتی ہے اور نہ صرف خود ٹھنڈی ہو جاتی ہے بلکہ ریفریجریٹر میں جو چیز بھی آپ رکھیں گے اس کو بھی وہ ٹھنڈا کر دیتی ہے۔ معلوم ہوا کہ ایک چیز آگ ہوتی ہے جو قابل تحمل نہیں ہوتی لیکن وہی چیز جب دوسرے مقام سے گزرتی ہے یا وہاں رکھی جاتی ہے

تو وہ قابل برداشت بھی ہو جاتی ہے اور اس کی خاصیت بھی بدل جاتی ہے۔

بلا کسی تشبیہ کے صرف بات سمجھانے کے لیے حق تعالیٰ شانہٗ کا علم اتنا بلند و بالا ہوتا ہے کہ مخلوق اس کو برداشت نہیں کر سکتی، لیکن جب اسی علم خداوندی کو قلب نبوت میں سے گزارا جاتا ہے تو اس میں اعتدال پیدا ہو جاتا ہے، بجائے گرمی کے اس میں برودت پیدا ہو جاتی ہے اور نا قابل فہم ہونے کے بجائے وہ عام مخلوق کے بھی قابل فہم ہو جاتا ہے۔

چنانچہ سرکار دو عالم ﷺ جب اس دنیا میں تشریف لائے اور آپ ﷺ نے اعلان نبوت فرمایا اور علم الٰہی قلب نبوت میں سے گزرا تو آپ کو ایک تو آفتاب کی طرح روشن کتاب ملی اور ماہتاب کی طرح خلق عظیم ملا۔ گویا آپ ﷺ کے ایک ہاتھ میں آفتاب تھا اور دوسرے میں ماہتاب۔ معلوم ہوا کہ بنیاد نبوت دو چیزیں ہیں۔ ایک علم اور دوسرا اخلاق۔ یہ دو چیزیں آپ اس دنیا میں لے کر آئے۔ اس کو یوں بھی کہا جا سکتا ہے کہ ایک تو آپ کا علمی کمال تھا اور دوسرا عملی کمال۔ اسی وجہ سے قرآن حکیم نے کمال علم اور کمال عمل کے لحاظ سے چار نوعیں بیان کی ہیں۔ فرمایا:

﴿مَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗ فَاُولٰٓئِكَ مَعَ الَّذِيْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِنَ النَّبِيّٖنَ وَالصِّدِّيْقِيْنَ وَالشُّهَدَآءِ وَالصّٰلِحِيْنَ، وَ حَسُنَ اُولٰٓئِكَ رَفِيْقًا﴾ [النساء:٦٩]

”اور جو اللہ اور رسول کی اطاعت کرے تو وہ ان لوگوں کے ساتھ ہوں گے جن پر اللہ نے انعام فرمایا ہے جو انبیاء، صدیقین، شہداء اور صالحین ہیں، اور یہ کیا ہی عمدہ ساتھی ہیں۔“

یہ چاروں علم اور عمل کے لحاظ سے دو قسمیں ہیں۔ نبی اور صدیق بارگاہِ علم کی دو قسمیں ہیں اور شہید اور صالح یہ عمل کی بارگاہ کی دو قسمیں ہیں۔ اس کی تفصیل یہ ہے کہ علم اولاً نبی کے قلب پر آتا ہے کہ نبی علم کے لحاظ سے اصل ہوتا ہے، اور اس کی تصدیق کرنے والے کو صدیق کہتے ہیں۔ تو صدیق اور تصدیق یہ بھی علم ہی کی ایک قسم ہے کیوں کہ تصدیق علم ہی کی قسم ہے۔ البتہ یہ ہے نبی علم میں اصل ہوتا اور صدیق تابع۔ اس لیے یہ دو افراد علم کے

ہیں۔ چنانچہ حافظ ابن قیمؒ فرماتے ہیں:

''صدیق اپنے قلب کو سراً، ظاہراً اور باطناً اپنے آپ کو ہر پہلو سے رسول کے سپرد کر چکا ہوتا ہے۔ علم، عقیدہ، حال، آداب و اخلاق، محبت اور تعلقات، اپنی پسند اور ناپسند غرضیکہ ہر بات میں وہ رسول کے تابع ہوتا ہے۔ اس کو نہ تحدیث کی ضرورت ہوتی ہے کہ باہر سے کچھ ملے اور نہ کشف والہام کا انتظار کہ اندر سے کچھ کھلے۔''

[مدارج السالکین: ۱/۴۰]

اس سلسلہ میں حضرۃ مجدد صاحب نے اپنے ایک مکتوب میں لکھا ہے:

''صدیقیت کے اوپر سوائے نبوت کے اور کوئی مقام نہیں ہے اور صدیقیت اور نبوت کے درمیان کوئی اور مقام ہونا بھی نہیں چاہیے، بلکہ یہ محال ہے کہ کوئی اور مقام ہو اور محالیت کا یہ حکم کشف صریح صحیح سے معلوم ہوا ہے۔'' [مکتوبات جلد مکتوب ۱۸]

گویا کہ رسول اور نبی کو وحی کے ذریعہ جن حقائق کا علم ہوتا ہے اور وہ دوسروں تک پہنچاتا ہے، ایک صدیق اس کی بے چون و چرا تصدیق کرتا ہے۔ نبی کی بیان کی ہوئی حقیقت کیسی ہی بالائے فہم اور مابعد الطبیعی ہو، صدیق کے لیے وہ بدیہی ہوتی ہے، اور جوں ہی صدیق کے کان میں نبی کی آواز پہنچتی ہے، وہ بے چون و چرا اسے قبول کر لیتا ہے۔

حکیم الامت حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ فرماتے ہیں:

''یہ بات اس لیے ہے کہ انوار وحی نبی کی ذات سے صدیق کی ذات پر پے در پے پڑتے ہیں اور پھر جس قدر تاثیر (اثر ڈالنے) اور تاثر (اثر قبول کرنے) کا تکرار ہوتا رہتا ہے، صدیق میں نبی کی ذات میں فنا ہونے اور اس پر فدا ہونے کے جذبات ابھرتے ہیں...... اور صدیق کی یہ علامت ہے کہ اسے خواب کی تعبیر کا علم سب سے زیادہ ہوتا ہے اور اس کی جبلت اور فطرت ہوتی ہے کہ معمولی سے سبب

سے اس پر امور غیبی کھلنے لگیں۔'' [حجۃ اللہ البالغہ: ۲/۹۳]

ان سب اقتباسات کا خلاصہ یہ ہے کہ نبی اور صدیق علم ہی کے دو افراد ہیں۔ فرق یہ ہے کہ نبی اصل اور صدیق تابع ہوتا ہے۔

اسی طرح عمل کے بھی دو ہی افراد ہیں۔ ایک شہید اور ایک صالح۔ ان میں اصل شہید ہے اور صالح اس کا تابع ہوتا ہے کیوں کہ شہید اسے کہتے ہیں جو اللہ کے راستہ میں صرف خواہشات ہی نہیں بلکہ اپنے نفس کو بھی قربان کر دے، اور صالح اس کو کہتے ہیں جو نفس کی خواہشات کو پامال کر کے اللہ تعالیٰ کی مرضی کو اپنے ہر معاملہ میں آگے رکھے۔ اس وجہ سے اعلیٰ ترین عمل شہید کا ہوتا ہے اور صالح اس کے تابع ہوتا ہے۔ تو ایک علم کا کمال ہے ایک عمل کا کمال ہے۔

اس سے یہ پتہ چلا کہ نبوت کی بنیاد دراصل یہی دو چیزیں ہیں۔ ایک علم اور دوسرا عمل۔ لہٰذا انبیاء علیہم السلام دو چیزیں لے کر آتے ہیں ایک علمی کمال اور دوسرا عملی کمال جن کو اخلاق کہا جاتا ہے، اور یہی اخلاق عمل کی بنیاد ہوتے ہیں۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ اگر اندر اخلاق نہ ہوں تو عمل سرزد نہیں ہوسکتا۔ اگر آپ کے اندر شجاعت اور بہادری کے اخلاق موجود ہیں تو ہجوم، حملہ آوری اور اقدام وغیرہ کے افعال آپ سے سرزد ہوں گے۔ گویا اندر کا مادہ فعل کو حرکت دیتا ہے۔ اسی اندرونی مادے کو جو فعل کو حرکت میں لایا اخلاق کے لفظ سے تعبیر کرتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ علم راستہ دکھاتا ہے جب کہ اخلاق چلنے کی قوت پیدا کرتا ہے۔ یہ دونوں چیزیں جب اکٹھی ہو جاتی ہیں تو آدمی کامیاب و کامران ہو جاتا ہے۔

سرکار دو عالم ﷺ کی ذات اقدس ان دونوں کمالات میں نقطۂ عروج پر پہنچی ہوئی تھی اور عروج کے اس مقام پر اور کوئی نہ پہنچا ہوا تھا۔ چنانچہ جہاں تک علم کا کمال ہے سرکار دو عالم ﷺ کا ارشاد ہے:

﴿اوتیت علم الاولین و الآخرین﴾

''مجھے اولین و آخرین کے علوم عطا کر دیے گئے ہیں۔''

یعنی اگلوں اور پچھلوں کے سارے علوم میری ذات میں جمع کر دیئے گئے ہیں۔

آپ ﷺ سے پہلے آنے والے اور آپ کے بعد جتنے بھی علماء اور فضلاء اس دنیا میں آنے والے ہیں، ان سب کے علوم آپ کی ذات اقدس میں جمع کر دیئے گئے۔ پتہ چلا کہ ذات نبوی میں اجتماع علوم ہے۔ اس کی ایک مثال ہر شخص ہر روز مشاہدہ کرتا ہے۔ ہر شخص کے چہرے میں آنکھ ہے۔ آنکھ بھی ایک عالم ہے لیکن یہ صرف دیکھے گی، صورت کو پہچانے گی۔ آوازوں کو پہچاننا آنکھ کا کام نہیں ہے یہ صرف کان کا کام ہے، کان کو جو علم حاصل ہے وہ مختلف آوازوں کو سننا ہے۔ آواز اچھی ہے یا بری، زوردار ہے یا پست۔ گویا کان آوازوں کا عالم ہے اس کا کام صورتوں کو دیکھنا نہیں۔ اسی چہرے پر ایک اور عالم جلوہ نشین ہے اور وہ ہے ناک۔ ناک کا کام خوشبو اور بدبو کو جاننا ہے۔ وہ سونگھ کر بتادے گی کہ کس چیز کی خوشبو یا بدبو ہے، لیکن ناک کوئی شکل نہیں دیکھ سکتی یہاں تک کہ جن چیزوں کی وہ خوشبو سونگھتا ہے ان کو دیکھ نہیں سکتا۔ دیکھنا کام آنکھ کا ہے ناک کا نہیں ہے۔ لیکن اگر کسی شے کا ذائقہ چکھنا ہو تو وہ زبان کا کام ہے ناک اور کان کسی شے کو چکھ نہیں سکتے۔ ہمارے اس چہرہ پر علماء کی ایک بستی ہے اور ہر فن کا ایک ایک عالم ہے۔ صورتوں کا عالم آنکھ، آوازوں کا عالم کان، سونگھنے کا عالم ناک، چکھنے اور ذائقہ کا عالم زبان۔ ان میں سے ہر ایک عالم اپنے اپنے موضوع کا علم رکھتے ہیں۔ یہ اللہ تعالیٰ کی حکمت ہے کہ ایک چھوٹے سے چہرے پر اتنے علماء کی ایک بستی بسادی جو دو دو انچ کے فاصلہ پر بیٹھے ہیں لیکن کوئی کسی کے کام میں دخل نہیں دیتا۔ نہ آنکھ کان کے کام میں اور نہ ناک زبان کے کام میں بلکہ ہر ایک اپنے اپنے کام میں مشغول ہے۔ لیکن ان سارے علماء کے علوم اللہ تعالیٰ نے دماغ کے ایک چھوٹے سے حصہ ''حس مشترک'' جس کو ''ام الدماغ'' بھی کہتے ہیں، جمع کر دیئے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جب آپ آنکھ سے دیکھتے ہیں تو آنکھ تو دیکھ کر فارغ ہو جاتی ہے لیکن دماغ میں اس کی صورت مرتسم ہو جاتی ہے جو دماغ میں ہمیشہ محفوظ رہتی ہے اگر آنکھ میں صورت رہتی تو آنکھ نے جب اپنا دیکھنے کا کام ختم کیا تھا تو آنکھ پر پردہ آجاتا اور صورت ماند پڑ جاتی، لیکن جس شے کو آپ نے ایک بار دیکھ لیا ہے تو دیکھنے کے بعد آنکھ بند بھی کر لیں تو وہ صورت پھر بھی آپ کے سامنے موجود ہے۔ یہ

صورت دماغ کے خزانہ میں جمع ہوگئی۔ اب آنکھ نہ بھی دیکھے صورت تب بھی آپ کے دماغ میں موجود ہے۔

آپ نے ایک مرتبہ کہیں قورما کھالیا جو نہایت لذیذ تھا۔ لیکن جب کھانے پینے کا کام ختم ہوگیا تب بھی اس کا ذائقہ آپ کے دماغ میں محفوظ ہے۔ اسی وجہ سے کہا جاتا ہے کہ فلاں شخص کے ہاں کھانا کھایا تھا جس کا ذائقہ اب بھی زبان میں موجود ہے۔ زبان تو آپ کی صاف ہوگئی۔ مدت ہوئی آپ نے وہ قورما کھایا تھا۔ اس کے بعد آپ نے اور کئی کھانے کھائے، لیکن اس کا ذائقہ آپ کو اب تک کیسے یاد ہے۔ ذائقہ کا یادرہنا اس بات کی علامت ہے کہ ذائقہ موجود ہے لیکن زبان میں نہیں بلکہ آپ کے دماغ کی حس مشترک میں ہے جو قورمے کا لفظ سن کر آپ کی زبان پر آجاتا ہے۔ گویا آپ کے چہرے کے یہ سارے علوم آپ کے دماغ کی حس مشترک میں موجود ہیں۔ معلوم ہوا کہ اصل خزانہ تو دماغ ہے آنکھ، کان اور ناک نہیں ہے۔ اصل دماغ ہے آنکھ، کان، ناک اور زبان اصل نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اگر آپ بازار میں سے گزریں اور اپنی آنکھوں سے ہر شے دیکھیں لیکن آپ کا ذہن اس طرف متوجہ نہ ہو تو سب کچھ دیکھنے کے بعد بھی آپ نے کچھ نہیں دیکھا۔ اور اگر کوئی پوچھے کہ آپ بازار گئے تھے آپ نے وہاں کیا کیا دیکھا تو آپ کچھ نہیں بتاسکیں گے۔ پوچھنے والا پوچھے کہ آپ کی آنکھ کھلی ہوئی تھی پھر آپ نے وہ سب کچھ کیوں نہیں دیکھا جو بازار میں تھا۔ آپ اس کا یہی جواب دیں گے کہ میں اپنے دھیان میں غرق تھا مجھے پتہ نہیں چلا کہ بازار میں کیا کیا تھا۔ معلوم ہوا کہ اصل دیکھنے والی آنکھ نہیں بلکہ دماغ اور دل ہے۔ اگر دماغ اس طرف متوجہ نہ ہو تو سب کچھ دیکھنے کے بعد بھی آپ نے کچھ نہیں دیکھا۔

یہی وجہ ہے کہ اگر آپ کی آنکھ پھوڑ دی جائے تو اس سے دماغ میں کچھ خلل نہیں آتا، لیکن اگر دماغ پر کوئی کاری ضرب لگ جائے تو پھر آنکھ بھی بے کار، ناک بھی بے کار، کان بھی بے کار یہاں تک کہ ہاتھ پاؤں بھی بے کار ہو کر رہ جاتے ہیں۔ معلوم ہوا کہ اصل خزانہ دماغ ہے۔

جب یہ مثال آپ کی سمجھ میں آگئی تو یہ بھی جان لیجئے کہ اس دنیا میں ایک لاکھ

چوبیس ہزار کے قریب انبیاء علیہم السلام تشریف لائے۔ان میں سے ہر نبی کا ایک مخصوص علم تھا۔ بعض کو خصوصی علوم دیئے گئے جیسے سیدنا آدم علیہ السلام کو اسماء وصفات کا علم دیا گیا، سیدنا یوسف علیہ السلام کو تعبیر خواب کا علم عطا فرمایا گیا، سیدنا سلیمان علیہ السلام کو منطق الطیر یعنی پرندوں کی بولیاں سمجھنے کا علم دیا گیا، سیدنا خضر علیہ السلام کو علم لدنی عطا فرمایا گیا۔تو سارے انبیاء علیہم السلام ایسے ہیں جیسے کان، آنکھ، ناک اور زبان وغیرہ یعنی مختلف علوم کے حامل اور رسول اللہ ﷺ کی مثال ام الدماغ کی ہے کہ سارے حواس کا علم اس میں جمع کر دیا گیا ہے۔اسی طرح تمام انبیاء علیہم السلام کے علوم ''خزانہ ءمحمدی'' جس کی حیثیت ام الدماغ کی ہے، جمع کر دیئے گئے ہیں۔اصل نکتہ ءخیر اللہ تعالیٰ کی طرف سے رسول اللہ ﷺ ہیں، اور آپ کے فیضان سے انبیاء میں نبوتوں کے علوم آئے یعنی سبب آپ بنائے گئے اور سب انبیاء کو آپ ﷺ کے سبب سے علوم عطا فرمائے گئے۔گویا

آنچہ خوباں ہمہ دارند تو تنہا داری

اسی وجہ سے تمام انبیاء علیہم السلام کو آپ پر ایمان لانے کے لیے کہا گیا اور خود رسول اللہ ﷺ نے حدیث میں فرمایا:

﴿انا نبی الانبیاء﴾ [خصائص کبریٰ للسیوطی: ۱/۱۹۷]

''اور انبیاء تو اپنی امتوں کے نبی تھے اور میں نبیوں کا نبی ہوں۔''

چنانچہ قرآن حکیم میں اللہ تعالیٰ نے تمام نبیوں سے یہ عہد لیا کہ تم نبی اکرم ﷺ پر ایمان لاؤ گے۔چنانچہ ارشاد خداوندی ہے:

﴿وَ اِذْ اَخَذَ اللّٰهُ مِيْثَاقَ النَّبِيّٖنَ لَمَآ اٰتَيْتُكُمْ مِّنْ كِتٰبٍ وَّ حِكْمَةٍ ثُمَّ جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ مُّصَدِّقٌ لِّمَا مَعَكُمْ لَتُؤْمِنُنَّ بِهٖ وَ لَتَنْصُرُنَّهٗ﴾ [آل عمران: ۸۱]

یعنی ''اور جب اللہ نے نبیوں سے عہد لیا کہ جب میں تمہیں کتاب اور حکمت دوں، پھر وہ (عظیم الشان) رسول جو تم سب کی تصدیق کرے اور ان سب علوم کی تصدیق کرے جو میں نے تمہیں دیئے

ہیں، تو تم اس پر ضرور ایمان لانا اور اس کی ضرور مدد کرنا۔ اگر تم اس رسول کا زمانہ پاؤ تو اس پر ایمان لانا، اور اگر اس کا زمانہ نہ پاؤ تو اپنی قوموں کو ہدایت کرنا کہ اس پر ایمان لائیں۔ یہ بھی تمہارا ایمان لانا ہے۔''

اس سے پتہ چلا کہ آپ پر ایمان لانے کا نبیوں کو پابند کیا گیا ہے۔ اس وجہ سے اگر کوئی نبی آپ کا زمانہ پالے تو اس پر آپ کی اتباع واجب ہے جیسا کہ حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

﴿لو كان موسٰی حيًا ما وسعه الا اتباعی﴾

[المصنف لابن ابی شیبه: ۹/۴۷]

''اگر آج موسیٰ (علیہ السلام) زندہ ہوتے تو انہیں بھی میری اتباع کے سوا اور کوئی چارۂ کار نہ ہوتا۔''

اس اتباع کا ایک مظاہرہ شب معراج میں بیت المقدس میں ہوا جب تمام انبیاء علیہم السلام نے آپ کی اقتداء میں نماز پڑھی اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان کی امامت کرائی۔

[زرقانی: ۶/۴۴، خصائص کبریٰ: ۱/۱۵۴]

زرقانی کی ایک اور روایت میں ہے کہ آپ کے تشریف لانے پر ملائکہ بھی آسمان سے نازل ہوئے اور سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرات انبیاء کرام علیہم السلام اور ملائکہ دونوں کی امامت کرائی۔ [زرقانی: ۶/۵۰]

یہ امامت گویا ایک اظہار تھا اس بات کا کہ آپ امام النبیین ہیں۔

یہ امامت تو اس عالم کی ہے۔ عالم آخرت میں بھی قیادت اور سیادت آپ کی ہوگی۔ چنانچہ سیدنا ابی ابن کعب رضی اللہ عنہ بیان فرماتے ہیں کہ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

﴿اذا كان يوم القيامة كنت امام النبيين و خطيبهم﴾

''قیامت کے روز میں سب نبیوں کا امام اور خطیب ہوں گا۔''

[ترمذی رقم ۳۶۱۳، ابن ماجہ رقم ۴۳۱۴، مسند احمد رقم ۲۱۲۸۳، متدرک حاکم رقم

۳۴۰_۳۴۱، ۶۹۶۹]

قیامت کے روز تمام نوع انسانی کی قیادت بھی آپ کو حاصل ہوگی۔ چنانچہ سیدنا انس بن مالک رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

﴿و انا قائدهم اذا وفدوا﴾

''اور میں اس روز تمام لوگوں کا قائد ہوں گا جب وہ جمع ہوں گے۔''

[سنن الدارمی: ۱/ ۳۹، مسند الفردوس دیلمی: ۱/ ۴۷]

ایک اور روایت جو سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

﴿انا سید ولد آدم یوم القیامة﴾

''قیامت کے روز میں تمام اولاد آدم کا سردار ہوں گا۔''

[مسلم رقم ۲۲۷۸، ترمذی رقم ۳۱۴۸، ابوداؤد رقم ۴۶۷۳، ابن ماجہ رقم ۴۳۰۸، مسند احمد بن حنبل رقم ۱۰۹۸۵، مسند ابی یعلی رقم ۷۴۹۳]

پھر قیامت کے روز اولاد آدم میں سے سب سے پہلے آپ کی قبر مبارک شق ہوگی اور آپ ہی سب انسانوں سے قبل قبر مبارک سے باہر نکلیں گے۔ چنانچہ سیدنا انس بن مالک رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

﴿انا اول الناس خروجا اذا بعثوا﴾

''جب لوگوں کو قبروں سے اٹھایا جائے گا تو میں سب سے پہلے اپنی قبر مبارک سے باہر نکلوں گا۔'' [ترمذی رقم ۳۶۱۰، سنن الدارمی: ۱/ ۳۹، معجم ابی یعلی: ۱/ ۱۴۷]

ایک اور روایت میں ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

﴿انا اوّل من تنشق عنه الارض ولافخر﴾

''میں سب سے پہلا انسان ہوں جس کے لیے زمین باہر نکلنے کے لیے شق ہوگی اور میں اس پر فخر نہیں کرتا۔'' [ترمذی رقم ۳۱۴۸، سنن ابی داؤد رقم: ۴۶۷۳، ابن ماجہ رقم ۴۳۰۸، مسند احمد رقم ۲۵۴۶، مسند ابی یعلی رقم ۴۳۰۵، معجم کبیر

طبرانی رقم ۱۲۷۷۷]

قیامت کے روز لواء الحمد بھی آپ کے ہاتھ میں ہوگا۔ چنانچہ ارشاد نبوت ہے۔

﴿بیدی لواء الحمد ولا فخر﴾

''حمد کا جھنڈا میرے ہاتھ میں ہوگا، میں یہ بات فخر سے نہیں کہتا۔''

[ترمذی رقم ۳۱۴۸، ۳۶۱، ۳۶۱۵، ابن ماجہ رقم ۴۳۰۸، مسند احمد رقم ۲۵۴۶]

اس حدیث سے بھی پتہ چلتا ہے کہ آپ نبی الانبیاء (یعنی تمام نبیوں کے نبی) ہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ قیامت کے روز ہر نبی کی امت اس کے جھنڈے تلے کھڑی ہوگی، لیکن اس امت کا نبی کہاں ہوگا؟ کیا وہ بھی اس جھنڈے تلے ہوگا؟ حدیث میں اس کا ذکر نہیں ہے بلکہ حدیث میں ہے کہ تمام انبیاء علیہم السلام رسول اللہ ﷺ کے جھنڈے کے نیچے ہوں گے۔ چنانچہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

﴿آدم و من دونہ تحت لوائی ولا فخر﴾

''آدم (علیہ السلام) اور ان کے علاوہ ہر نبی میرے جھنڈے کے نیچے ہوگا اور میں یہ بات فخر سے نہیں کہہ رہا۔'' [مسند احمد رقم ۲۵۴۶، مجمع الزوائد ۳۷۲/۱۰، مسند ابی یعلی رقم ۲۳۲۸، بیہقی فی شعب الایمان رقم ۱۴۸۸]

[ترمذی نے بھی اس مضمون کی ایک روایت سیدنا ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے نقل کی ہے ملاحظہ ہو ترمذی رقم ۳۶۱۵]

مختصر یہ کہ قرآن نے ہر نبی سے یہ عہد اور میثاق لیا کہ جب میرا رسول آئے تو اس پر ضرور ایمان لانا اور اس کی نصرت اور مدد کرنا۔ اس سے پتہ چلا کہ آپ نبی الانبیاء ہیں۔ اور آپ ﷺ جب اس دنیا میں تشریف لائے تو آپ نے ان تمام نبیوں کے علوم کی تصدیق کی، اور تصدیق وہی کرتا ہے جو ان علوم سے واقف و آشنا ہو۔ معلوم ہوا کہ ہر نبی کو جو علم عطا فرمایا گیا تھا وہ علم آپ کو بھی دیا گیا تھا۔ اسی وجہ سے آپ نے ان کی تصدیق فرمائی (مصدق لما معکم)

حقیقت یہ ہے کہ اصل میں ایمان نبی کا ہوتا ہے۔ مومن جو ہے وہ اس پر ایمان

لاتے ہیں۔ ہمارا ایمان نبی کے ایمان کا عکس ہوتا ہے۔ آپ ﷺ کے فیض سے تمام مومنوں پر ایمان کا عکس پڑ گیا تو ہم تم بھی مومن نظر آنے لگے۔ ہمارا ایمان بالاستقلال نہیں ہے بلکہ آپ ﷺ کے ایمان کے تابع ہے۔ اس کی مثال ایسے ہے جیسے کہ آفتاب نکلے اور مختلف دھوپوں کے ٹکڑے آپ دنیا میں پھیلے ہوئے دیکھتے ہیں۔ ان ٹکڑوں کی مختلف شکلیں اور صورتیں ہیں۔ اگر دھوپ سے پوچھا جائے کہ تو کون ہے؟ تو اس کا جواب یہ ہوگا کہ آفتاب کا ایک عکس ہوں۔ میرا اصلی وجود کچھ نہیں۔ وجود اصلی تو آفتاب کا ہے۔ اس کی وجہ سے میرا وجود بھی نظر آتا ہے۔ میں خود آفتاب سے کٹ کر کچھ بھی نہیں۔ اسی طرح مومن کے ایمان کا وجود اصل میں نبی کے ایمانی وجود کے تابع ہے۔ تو جب انبیاء علیہم السلام مومن بنائے گئے اور انہیں ہدایت کی گئی کہ سرکار دو عالم ﷺ پر ایمان لاؤ تو ایسی صورت بن گئی کہ حقیقی ایمان صرف سرکار دو عالم ﷺ کا ہے اور آپ ﷺ کے فیضان سے پھر انبیاء کرام علیہم السلام کو بھی ایمان عطا کیا گیا۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے علم و ایمان کا ''نکتہ ءِ خیر'' سرکار دو عالم ﷺ کی ذات بابرکات ہے۔

سرکار دو عالم ﷺ فرماتے ہیں کہ ''اوتیت علم الاولین و الآخرین'' یعنی اگلوں اور پچھلوں کے سارے علوم مجھے دیئے گئے ہیں، وہ میرے سینے میں جمع ہیں۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ اصل علوم تو آپ کے سینے میں ہیں اور وہ علوم پھر آپ کے فیضان سے دوسروں تک پہنچائے گئے۔ گویا کہ آپ حس مشترک اور ام الدماغ ہیں اور انبیاء کرام علیہم السلام مثل آنکھ، ناک، کان اور زبان کے ہیں۔ علم کا فیض یہاں سے سینچ رہا ہے۔ کسی کو کوئی علم ملا اور کسی کو کوئی۔ یہی وجہ ہے کہ سرکار دو عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ

﴿علّم آدم الاسماء کلّها کما علمت الاسماء کلّها﴾

''آدم علیہ السلام کو اسماء و صفات کا علم دیا گیا جیسا کہ سارے اسماء و صفات کا مجھے علم عطا کیا گیا ہے۔''

مختصر یہ کہ انبیاء کرام علیہم السلام کو جو علوم دیئے گئے وہ حد کمال کے ساتھ جمع ہو کر جناب رسول اللہ ﷺ کی ذات کے اندر جمع کر دیئے گئے ہیں، خواہ اسماء وصفات کا علم ہو،

یا منطق الطیر یعنی پرندوں کی بولیوں کا علم ہو، خواہ تعبیر خواب کا علم یا کوئی اور علم ہو۔ اور آپ کے بعد آنے والے علماء وہ آپ ہی کے در کے فیض یافتہ ہوں گے۔ وہ تو آپ کے فیض ہی سے عالم بنے ہوں گے۔ مختصر یہ کہ آپ کی ذات بابرکات علوم کی ایک کہکشاں ہے جس میں سب انبیاء کے علوم کا اجتماع ہے۔

آپ کا خاتم النبیین ہونا

پھر دوسرے تمام نبی تو صرف نبی ہیں لیکن سرکار دو عالم ﷺ صرف نبی نہیں بلکہ خاتم الانبیاء ہیں، اور ختم نبوت کے معنی نبوت کا انقطاع نہیں جیسا کہ عام لوگ سمجھتے ہیں بلکہ نبوت کی انتہا ہے یعنی سب درجات نبوت آپ ﷺ کی ذات اقدس میں جمع ہو گئے۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ نبوت، علم اور اخلاق کے جس قدر مراتب ہیں وہ آپ کی ذات بابرکات پر ختم ہو چکے ہیں یعنی آپ سارے کمالات نبوت کے منتہیٰ ہیں۔ اب نبوت کی تکمیل کا کوئی درجہ ایسا نہیں ہے جو باقی رہا ہو اور آپ کے بعد کوئی نبی آئے اور اس درجہ نبوت کی تکمیل کرے۔ لہٰذا آپ ﷺ کے بعد نہ کسی نبوت کی ضرورت ہے اور نہ ہی کسی شریعت کی۔ اس لحاظ سے آپ ﷺ کا دین ''خاتم الادیان ہے، اور آپ کی لائی ہو کتاب ''خاتم الکتب'' آپ کی لائی ہوئی شریعت ''خاتم الشرائع'' اور آپ کا لایا ہوا خلق ''خاتم الاخلاق'' ہے۔

اس ساری بحث کا خلاصہ یہ ہے کہ ''خاتم النبیین'' کا مطلب یہ نہیں کہ نبوت منقطع ہو گئی جب کہ نبوت ایک رحمت ہے، گویا اللہ تعالیٰ کی طرف سے آپ کے آنے کے بعد رحمت کا دروازہ بند ہو گیا بلکہ ختم نبوت کا مطلب تکمیل نبوت ہے یعنی نبوت کے تمام درجات آپ پر مکمل ہو گئے اور اب نبوت کا کوئی درجہ باقی نہیں رہا۔

رسول اللہ ﷺ کی ختم نبوت کو ایک مثال سے ذہن نشین کرنے کی کوشش فرمائیں، رات کا وقت ہے اور آسمان پر سورج کے افق مغرب میں چھپ جانے کی وجہ سے اندھیرا چھا گیا۔ جونہی اندھیرا چھایا تو آسمان پر پہلے ایک ستارہ چمکا، پھر دوسرا پھر تیسرا یہاں

تک کہ ایک ایک لاکھوں کروڑوں ستارے آسمان پر چمکنے لگے، نیچے سے دیکھنے پر ایسا معلوم ہوتا تھا کہ سارا آسمان جگمگا اٹھا۔ پھر چاند بھی نکلا اور وہ بھی آدھا نہیں بلکہ بدر کامل یعنی پورا چاند نکلا۔ آسمان بھی ستاروں سے بھرا ہوا ہے اور چاند اور ستارے ہر طرف اپنا نور بکھیر رہے ہیں لیکن رات نہیں جاتی۔ اندھیرا ختم نہیں ہوتا اور آسمان سے روشنی کی کرنیں نہیں پھوٹتیں جس سے زمین پر چاندنا ہو۔

آفتاب کے جب نکلنے کا وقت ہوا۔ ابھی آفتاب نکلا نہیں صرف پو پھٹی ہے اور صبح صادق کی کرنوں نے پیغام دیا کہ آفتاب آ رہا ہے۔ بس اس پیغام کا آنا تھا کہ اندھیرا غائب ہونا شروع ہو گیا اور آفتاب نے حجلۂ مشرق سے سر نکالا تو تمام کرۂ ارض روشن ہو گیا، اور رات کے تمام ستارے نظروں سے اوجھل ہو گئے۔ وہ موجود تو تھے لیکن کرۂ آفتاب نے ان کی روشنی کو ماند کر دیا۔ یا تو یہ حالت تھی کہ کروڑوں ستارے اور چاند مل کر رات کے اندھیرے کو زائل نہ کر سکے اور رات ہی رہی۔ زمین پر چاندنا نہ ہوا، لیکن ایک ستارہ خورشید جب افق مشرق سے نمودار ہوا تو اندھیرا ایک دم غائب ہو گیا اور تمام کرۂ ارض کو اجالے نے گھیر لیا۔ اب اگر آفتاب یوں کہے کہ میں خاتم الانوار ہوں۔ میں نے لاکھوں کروڑوں چمک دار ستاروں کے نور کو ختم کر دیا۔ سارے انوار میری ذات پر ختم ہیں، میرے آنے کے بعد اب چاندنے کے لیے کسی ستارے کی ضرورت نہیں رہی کیوں کہ میں اس قدر کامل نور لے کر آیا ہوں کہ اب کسی ستارے کی حاجت نہیں بلکہ جو ستارے پہلے سے موجود تھے، ان کا نور بھی ماند پڑ گیا۔ اب وہ نمایاں ہونے کے قابل نہیں۔ اس کا مطلب یہ بھی نہیں ہے کہ آفتاب نے لاکھوں کروڑوں ستاروں کا نور چھین لیا ہے حالانکہ نور چھینا نہیں آفتاب کی روشنی کی تیزی اور چمک کے سامنے ان کی روشنی اور چمک ماند پڑ گئی ہے ایسے وقت اگر آفتاب یہ کہے کہ میں خاتم الانوار ہوں۔ سارے انوار اور چمکیں مجھ پر ختم ہو گئیں۔ اب کسی ستارے کی ضرورت نہیں رہی کہ وہ آئے اور اپنا نور پھیلائے۔ اب مغرب کے وقت تک میں ہی کافی ہوں۔ تو کیا آفتاب کے خاتم الانوار ہونے کا یہ مطلب ہوگا کہ نور ختم ہو گیا اور دنیا پر اندھیرا چھا گیا، یا یہ مطلب ہوگا کہ نور کے تمام مراتب ختم ہو گئے۔ اب کسی دوسرے ستارے کے

آنے کی مطلقاً کوئی ضرورت نہیں رہی۔ ختم انوار کے معنی قطع انوار کے نہیں بلکہ تکمیل انوار کے ہیں جس کا مطلب یہ ہے کہ آفتاب کا نور اس قدر کامل ہے کہ اب کسی ستارے کی کوئی ضرورت نہیں۔

اسی طرح سمجھ لیجئے کہ نبوت ایک آسمان ہے۔ آسمان نبوت پر سب سے پہلا ستارہ سیدنا آدم علیہ السلام کا چمکا اور اس نے اپنا نور پھیلایا۔ پھر نوح علیہ السلام کا ستارہ چمکا، پھر سیدنا ھود، پھر سیدنا صالح کے ستارے چمکے۔ پھر سیدنا ابراہیم واسماعیل علیہما السلام کے ستارے چمکے۔ پھر قرآن حکیم نے کہا: "ثم ارسلنا رسلنا تترا" پھر پے در پے انبیاء کے آنے کا سلسلہ شروع ہوا۔ سیدنا موسیٰ، سیدنا ہارون، سیدنا داؤد، سیدنا سلیمان علیہم السلام آرہے ہیں۔ غرض کہ ایک لاکھ چوبیس ہزار سے زائد نبی اور رسول اس آسمان نبوت پر طلوع ہوئے لیکن دنیا میں توحید کا چاند نا نہ ہوا۔ کفر کا اندھیرا بدستور قائم رہا۔ رات ہی رہی اگرچہ آسمان نبوت ستاروں سے بھر گیا۔

پھر دنیا نے دیکھا کہ فاران کی چوٹیوں سے نبوت کی صبح صادق طلوع ہوئی۔ اس نے خبر دی کہ آفتاب نبوت دنیا میں آنے والا ہے۔ ابھی آیا نہیں کہ دنیا میں اندھیرا چھٹنا اور چاندنا پھیلنا شروع ہوا۔ ستاروں کا نور مدہم پڑنا شروع ہوگیا۔ پھر جب آفتاب نکلا تو ستاروں کا نور بالکل ماند پڑ گیا، اور آفتاب نبوت نے نکلتے ہی اعلان کر دیا۔ اب میں آگیا ہوں اب کسی ستارے کی کوئی ضرورت نہیں رہی کیوں کہ تمام مراتب اور درجات نبوت میری ذات پر منتہی ہو گئے ہیں۔ اب اور کسی کو نبی بنا کر نہیں بھیجا جائے گا۔ اب غروب آفتاب یعنی قیامت تک میری ہی نبوت ہوگی۔

اب قیامت تک میرا ہی نور پھیلتا رہے گا۔ محدثین آئیں گے تو ان کے راستہ میں میری نبوت کا نور ہوگا۔ فقہاء آئیں گے تو ان کے اندر سے میرے ہی انوار ظاہر ہوں گے، صوفیا آئیں گے تو ان کے اندر بھی میرا ہی نور چمکے گا۔ کسی طبقہ سے میرے علوم کا نور ظاہر ہوگا تو کسی طبقہ سے میرے اخلاق کے انوار ظاہر ہوں گے۔ غرض کہ جو بھی اس دنیا میں دین کے مراتب حاصل کرے گا اس کے اندر میرا ہی نور چمکتا ہوگا۔ تو گویا اللہ تعالیٰ نے ایک ایسی

ذات پیدا فرمائی کہ اس کے انوار و برکات سے پچھلوں کو نبوتیں ملتی چلی گئیں اور بعد میں آنے والوں کو ولایتیں ملتی چلی گئیں۔ پہلے نبی بنتے تھے اور بعد والے ولی بنتے چلے گئے۔ معلوم ہوا نبوت بھی وہیں سے چلی اور ولایت بھی وہیں سے چلی۔ پچھلوں کی نبوتیں آپ کی نبوت سے مستفیض ہیں اور اگلے آنے والے لوگ ولی، مجدد، محدث، فقیہ اور صوفی آپ کے کمالات نبوت سے بنتے گئے۔

پھر اور نبی تو صرف اپنی اپنی قوموں کی طرف مبعوث ہوئے اور کچھ وقت کے لیے مبعوث ہوئے لیکن آفتاب نبوت قیامت تک کے لیے مبعوث ہوا اور نہ صرف ایک قوم کے لیے بلکہ پوری انسانیت کے لیے، دنیا کی ہر قوم کے لیے، کالے اور گورے کے لیے، عجمی اور عربی کے لیے غرضیکہ قیامت تک آنے والی ساری انسانیت کے لیے خواہ وہ پہاڑوں میں رہتے ہوں یا جنگلوں میں، شہر میں رہتے ہوں یا دیہات میں سب کے لیے بھیجا گیا۔ چنانچہ ارشادِ خداوندی ہے:

﴿وَمَا اَرْسَلْنٰکَ اِلَّا کَآفَّۃً لِّلنَّاسِ بَشِیْراً وَّ نَذِیْراً﴾

[سبا: ۲۸]

''اور ہم نے آپ کو (قیامت تک کے) تمام لوگوں کے لیے ثواب کی بشارت دینے والا اور عذاب سے ڈرانے والا بنا کر بھیجا ہے۔''

آیت میں لفظ ''کافۃ'' استعمال کیا گیا ہے۔ ''الکف'' انسان کی ہتھیلی کو کہتے ہیں جس کو انسان پھیلاتا ہے اور سیکڑتا ہے۔ اس آیت میں کافۃ کا معنی ہے لوگوں کو گناہوں سے روکنے والا۔ اس میں تا مبالغہ کی ہے۔ [المفردات: ۲/۵۵۹]

اور علامہ قرطبیؒ نے اپنی تفسیر میں لکھا ہے کہ

''کافۃ کا معنی ہے عامہ یعنی ہم نے آپ کو عام لوگوں کے لیے بشیر اور نذیر بنا کر بھیجا۔ زجاج نے کہا کہ ''الکافۃ'' کا معنی ہے ''الجامع'' یعنی ہم نے آپ کو ڈرانے اور تبلیغ میں تمام لوگوں کو جمع کرنے کے لیے بھیجا ہے۔ ایک قول یہ ہے کہ اس کا معنی ہے منع

کرنے والا یعنی ہم نے آپ کو اس لیے بھیجا ہے کہ آپ تمام لوگوں کو کفر سے منع کریں اور اسلام کی دعوت دیں۔'' [تفسیر قرطبی: ۲۷۰/۱۴]

ایک اور آیت میں اللہ تعالیٰ نے آپ کی رسالت کی عمومیت کے بارے میں فرمایا:

﴿تَبَارَکَ الَّذِیْ نَزَّلَ الْفُرْقَانَ عَلٰی عَبْدِہٖ لِیَکُوْنَ لِلْعَالَمِیْنَ نَذِیْرًا﴾ [الفرقان: ۱]

''وہ بڑی برکت والا ہے جس نے اپنے مکرم بندے پر الفرقان کو نازل کیا تاکہ وہ تمام جہانوں کے لیے ڈرانے والا ہو۔''

اس آیت کی تائید اس حدیث سے بھی ہوتی ہے جو سیدنا جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ سرکار دو عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ مجھ کو پانچ چیزیں ایسی عطا کی گئیں جو مجھ سے پہلے کسی نبی کو نہیں دی گئیں۔ ان میں چوتھی چیز آپ ﷺ نے یہ فرمائی

''اور پہلے نبی ایک مخصوص قوم کی طرف بھیجا جاتا تھا اور میں تمام مخلوق کی طرف مبعوث کیا گیا ہوں۔'' [بخاری رقم ۴۳۸، مسلم رقم ۵۲۱، نسائی رقم ۴۳۲، مسند احمد رقم ۱۴۳۰۳، سنن الدارمی رقم ۱۳۸۹، سنن کبریٰ بیہقی رقم ۹۵۸، ابن حبان رقم ۶۳۹۸]

ایک اور روایت میں رسول اللہ ﷺ نے اس بات کو ان الفاظ میں فرمایا:

﴿کان کل نبی یبعث الٰی قومه خاصة، و بعثت الٰی کل احمر و اسود﴾

''ہر نبی اپنی خاص قوم کی طرف مبعوث کیا جاتا تھا جب کہ میں تمام سرخ و سیاہ کی طرف مبعوث کیا گیا ہوں۔'' [مسلم رقم ۵۲۱، مسند احمد رقم ۲۲۵۶، سنن کبریٰ بیہقی رقم ۱۲۴۸۹، مجمع الزوائد ۳۷۱/۱۰، فتح الباری ۴۳۹/۱، بیہقی شعب الایمان ۱۷۷/۲]

ایک اور روایت میں سرکار دو عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

﴿ارسلت الی الخلق کافۃ﴾

''مجھے تمام مخلوق کی طرف رسول بنا کر بھیجا گیا۔'' [مسلم رقم ۵۲۳، سنن ترمذی رقم ۱۵۵۳، مسند احمد رقم ۹۳۲۶، ابن حبان رقم ۲۳۱۳، ۶۴۰۱، ۶۴۰۳]

اس حدیث میں ''خلق'' کا لفظ ہے اور مخلوق کا لفظ انسانوں، جنات، فرشتوں، حیوانات، درختوں اور پتھروں سب کو شامل ہے۔ علامہ جلال الدین سیوطیؒ نے الخصائص الکبریٰ میں اس کو ترجیح دی ہے کہ آپ فرشتوں کے بھی رسول ہیں۔ اور علامہ تقی الدین سبکیؒ نے یہ لکھا ہے کہ آپ سیدنا آدم علیہ السلام سے لے کر قیامت تک کے تمام نبیوں اور ان کی امتوں کے رسول ہیں، اور علامہ البارزی نے لکھا ہے کہ آپ تمام حیوانات اور جمادات کے بھی رسول ہیں۔

سیدنا جابر بن سمرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ میں مکہ کے ایک پتھر کو پہچانتا ہوں جو میرے مبعوث ہونے سے قبل مجھ کو سلام کیا کرتا تھا اور میں اس کو اب بھی پہچانتا ہوں۔ [مسلم رقم ۲۲۷۶]

اور ایک روایت میں جناب علی رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ میں سرکار دو عالم ﷺ کے ساتھ مکہ کے کسی راستہ پر جا رہا تھا۔ آپ کے سامنے جو بھی پہاڑ یا درخت آتا وہ کہتا: ''السلام علیک یا رسول اللہ'' [سنن الترمذی رقم ۳۶۲۶، سنن الدارمی رقم ۲۱، شرح السنۃ بغوی رقم ۳۷۱۰]

اور سیدنا ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ ایک بھیڑیئے نے ایک بکری پر حملہ کر کے اس کو پکڑ لیا۔ اس کے چرواہے نے اپنی اس بکری کو بھیڑیئے کے منہ سے چھڑا لیا۔ وہ بھیڑیا اپنی دم پر بیٹھ کر کہنے لگا: ''اے چرواہے! کیا تم اللہ تعالیٰ سے نہیں ڈرتے کہ اللہ کے دیئے ہوئے رزق کو مجھ سے چھین رہے ہو؟ اس چرواہے نے کہا: ''ایک بھیڑیا اپنی دم پر بیٹھا ہوا مجھ سے باتیں کر رہا ہے۔ بھیڑیئے نے کہا: ''کیا میں تم کو اس سے زیادہ حیرت انگیز بات نہ بتاؤں۔ محمد ﷺ یثرب میں لوگوں کو گزشتہ زمانے کی خبریں بیان کر رہے ہیں۔'' [مسند احمد بن حنبل: ۳/۸۳-۸۴، مسند البزار رقم ۲۴۳۱]

ان سب روایات سے پتہ چلا کہ آپ کے علوم میں نہ صرف اکملیت ہے بلکہ

آپ کی بعثت میں بھی عمومیت ہے۔ آپ صرف قیامت تک کے انسانوں اور جنات کی طرف ہی نبی بنا کر نہیں بھیجے گئے بلکہ آپ فرشتوں، نباتات، جمادات اور چرندوں، پرندوں وغیرہ کی طرف بھی اللہ کے رسول بنا کر بھیجے گئے۔ گویا کہ آپ نکتہء خیر ہیں اور جس جس شخص یا چیز کی نسبت آپ کی طرف ہوگئی اس میں خیر کی شان اکملیت نمایاں ہوگی۔ اسی وجہ سے آپ کے عہد کو "خیر القرون" کہا گیا۔ چنانچہ آپ ﷺ نے خود ارشاد فرمایا:

﴿بعثت من خير القرون بني آدم قرناً فقرناً حتى كنت من القرن الذي كنت فيه﴾

"مجھے بنی آدم کے بہترین زمانہ میں مبعوث فرمایا گیا۔ زمانے پر زمانے گزرتے رہے یہاں تک کہ مجھے اس زمانہ میں رکھا گیا جس میں، میں موجود ہوں۔" [بخاری رقم ۳۳۶۴، مسند احمد بن حنبل ۲/۳۷۳، مسند ابی یعلی رقم ۶۵۵۳، بیہقی فی شعب الایمان رقم ۱۳۹۲]

ایک اور روایت میں فرمایا کہ

﴿خير الناس قرني، ثم الذين يلونهم، ثم الذين يلونهم﴾

"سب سے بہتر لوگ میرے زمانے کے ہیں پھر وہ جو ان سے قریب ہیں اور پھر وہ جو ان سے قریب ہیں۔"

معلوم ہوا کہ وہ زمانہ سب سے بہتر، اس زمانہ کے لوگ سب سے بہتر، وہ فرشتہ جو آپ پر وحی لے کر آیا وہ "خیر الملائکة" یعنی سب فرشتوں سے بہتر، وہ کتاب جو آپ پر نازل ہوئی وہ "خیر الکتب"، وہ دین جو آپ پر اترا وہ "خیر الادیان" اور وہ شریعت جس کا آپ نے دنیا میں پرچار کیا اور لوگوں کو اس پر عمل کرنے کے لیے کہا وہ خیر الشرائع۔ گویا کہ ہر وہ چیز جس کی آپ کی طرف نسبت ہوگئی اس میں ساری خیریت آگئی چنانچہ آپ کی امت بھی "خیر الامم" ہے۔

لہٰذا شان میں اکملیت، بعثت میں عمومیت اور نسبت میں خیریت کے تمام پہلو

آپ میں پائے جاتے تھے۔ علم میں بھی آپ کا سینہ تمام علوم کا گنجینہ بلکہ مخزن علوم الٰہی تھا۔ آپ ﷺ کا علم سب سے بڑھ کر بھی ہے اور سب پر حاوی بھی اور تمام علوم کے آپ جامع بھی ہیں۔ اسی لیے آپ کو انبیائے سابقین کے لیے مصدّق کہا گیا کہ آپ کی ذات والا صفات ان کی نبوت اور ان کے علوم کی تصدیق کرنے والی ہے، اور تصدیق وہی کیا کرتا ہے جو پہلے سے علوم جانتا ہو۔ جو ان علوم سے واقف و آشنا نہیں ہوگا وہ کبھی بھی ان کی تصدیق نہیں کرے گا۔ آپ کو "مُصَدِّقٌ لما معکم" کہا گیا جس کا مطلب یہ ہے کہ اے پیغمبرو! جو علوم تم کو دیئے جائیں گے ان کی تصدیق کرنے والے سرکار دو عالم ﷺ ہوں گے۔ تو تصدیق کرنا اس بات کی دلیل ہے کہ وہ سارے علوم آپ کے اندر جمع تھے۔

آپ کے جامع العلوم ہونے کے باعث آپ کو معجزہ بھی علمی دیا گیا۔ آپ سے پہلے جتنے بھی نبی اس دنیا میں تشریف لائے ان سب کو عملی معجزات دیئے گئے۔ اور عمل عامل کے جانے کے بعد ختم ہو جاتا ہے۔ چنانچہ آج دنیا میں کہیں بھی آپ کو نہ تو عصائے موسوی ملے گا اور نہ ہی ید بیضا اور نہ ہی دم عیسیٰ سے شفا پانے والے اور زندہ ہونے والے مریض اور مردے، کیوں کہ سیدنا موسیٰ اور سیدنا عیسیٰ اور دیگر انبیاء علیہم السلام کے اس دنیا سے تشریف لے جانے کے بعد ان کے معجزات بھی ناپید ہو گئے۔

رسول اللہ ﷺ کو اگرچہ ہزاروں عملی معجزات عطا کیے گئے لیکن ایک علمی معجزہ بھی آپ کو عطا فرمایا گیا۔ علم اللہ کی صفت ہے بندہ کی صفت نہیں۔ آپ چونکہ تعلیم دینے کے لیے تشریف لائے تھے تو سب سے بڑی نبوت آپ کی اور سب سے بڑی تعلیم بھی آپ کی۔ اس لیے آپ کو معجزہ علمی بھی دیا گیا۔ اور علم کی یہ خصوصیت ہے کہ علم عالم کے جانے سے ختم نہیں ہوتا۔ آپ تشریف لے گئے لیکن دلیل نبوت آج تک موجود ہے اس لیے نبوت بھی موجود ہے۔ اس لیے آپ نہیں کہہ سکتے کہ موسیٰ علیہ السلام کی نبوت کے تحت آ جاؤ یا عیسیٰ علیہ السلام کی نبوت کے تحت آ جاؤ۔ وجہ یہ ہے کہ ان کی دلیل نبوت موجود نہیں لہٰذا نبوت بھی موجود نہیں، لیکن نبوت محمد ﷺ آج بھی موجود ہے کیوں کہ اس کی دلیل نبوت قرآن حکیم موجود ہے اور یہ قیامت تک رہے گی لہٰذا آپ ﷺ کی نبوت بھی قیامت تک کے لیے ہے۔ پھر

قرآن حکیم صرف خود معجزہ ہی نہیں بلکہ معجزہ نما بھی ہے یعنی معجزے بناتا بھی ہے کیوں کہ اس پر چل کر ہی صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے اپنی زندگی ایسی بنائی کہ دنیا اس کی مثال پیش نہیں کر سکتی۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے صحابہ کرام کی تعداد ایک لاکھ ۴۴ ہزار کے قریب ہے۔ یہ ایک لاکھ چوالیس ہزار قرآن حکیم نے نمونے بنا کر رکھ دیئے۔ گویا ایک ایک صحابی پوری امت بن گیا۔ پھر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے بعد اولیائے کرام بھی اسی قرآن حکیم کی تعلیم پر چل کر ہی اولیاء اللہ بنے۔ لہٰذا معلوم ہوا کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا یہ علمی معجزہ معجزہ ہی نہیں بلکہ معجزہ نما بھی ہے۔ جس نے اس کی تعلیم پر عمل کیا وہ خود معجزہ بن گیا۔

حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی شان اخلاق

یہ تو آپ کے شان علم کی چند جھلکیاں تھیں۔ اخلاق میں بھی آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا مقام نہایت اونچا تھا اور یہ ایک عام فہم قاعدہ ہے کہ جو مقام سب سے آخری اور اونچا ہوتا ہے نیچے کے سارے مقام اس میں جمع ہوتے ہیں۔ مثال کے طور پر ایک شخص ایم اے ہے۔ جو ایم اے ہوگا تو یقینی بات ہے کہ وہ میٹرک بھی ہوگا اور بی اے بھی۔ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو جب اخلاق کا اعلیٰ مقام دیا گیا تو اس کے نیچے جتنے بھی مقامات تھے وہ اس میں خود بخود آ گئے، لہٰذا آپ جامع علوم کے ساتھ ساتھ جامع اخلاق بھی ہیں۔

قرآن وسنت میں غور کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ اخلاق کی تین قسمیں ہیں۔

(۱) اخلاق حسنہ (۲) اخلاق کریمانہ

اور (۳) اخلاق عظیم

اخلاق حسنہ اخلاق کا ابتدائی درجہ ہے۔ اللہ تعالیٰ نے سیدنا ابراہیم علیہ السلام کو فرمایا

﴿یا خلیلی! حسن خلقک﴾

''اے میرے خلیل! اپنے اخلاق کو حسن بناؤ۔''

اس سے معلوم ہوا کہ ایک اخلاق حسن ہے جس کی تعلیم سیدنا ابراہیم علیہ السلام کو دی گئی۔ ایک خلق کریم ہے جیسا کہ حدیث میں سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

﴿بعثت لاتمم مکارم الاخلاق﴾

''میں اس لیے بھیجا گیا ہوں کہ کریمانہ اخلاق کو مکمل کر کے تمہارے سامنے پیش کروں۔''

اور ایک ہے خلق عظیم جو سرکار دو عالم ﷺ کا ذاتی خلق ہے جس کے بارے میں قرآن حکیم نے ارشاد فرمایا:

﴿ وَ اِنَّکَ لَعَلٰی خُلُقٍ عَظِیۡمٍ ﴾ [القلم: ۴]

''اے پیغمبر! آپ خلق عظیم پر ہیں۔''

اس آیت کے بارے میں امام رازیؒ نے لکھا ہے:

''خلق ملکہ نفسانیہ ہے جس کی وجہ سے انسان کے لیے نیک کام کرنا آسان ہو جاتا ہے۔ حسن خلق میں بخل، حرص اور غضب سے اجتناب کرنا داخل ہے۔ اسی طرح معاملات میں سختی سے احتراز کرنا بھی اس میں داخل ہے اور اپنے قول وفعل سے لوگوں کو مانوس کرنا بھی اس شامل ہے............

انسان کو خلق دو قوتوں سے حاصل ہوتا ہے۔ قوت علمیہ اور قوت عملیہ۔

قوت علمیہ کے بارے میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿وَ عَلَّمَکَ مَا لَمۡ تَکُنۡ تَعۡلَمُ ، وَ کَانَ فَضۡلُ اللّٰہِ عَلَیۡکَ عَظِیۡمًا﴾ [النساء: ۱۱۳]

''اور آپ جو کچھ نہیں جانتے تھے اللہ نے آپ کو اس کا علم سکھا دیا اور یہ آپ پر اللہ تعالیٰ کا فضل عظیم ہے۔''

اور قوت عملیہ کے بارے میں فرمایا:

﴿و انک لعلی خلق عظیم﴾ [القلم: ۴]

''اور بے شک آپ ضرور اخلاق عظیم پر فائز ہیں۔''

ان دونوں قوتوں کے کامل اور مکمل ہونے کے بعد انسان کو اپنے کمال کے لیے کسی اور قوت کی ضرورت نہیں۔ سو آپ کا علم بھی عظیم ہے آپ کا خلق بھی عظیم ہے۔ پس

آپ کی روح مقدس تمام ارواح بشریہ میں سب سے اعلیٰ اور سب سے افضل ہے؟

اس آیت میں ایک اور نکتہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: "وانک لعلٰی خلق عظیم" اور "علٰی" استعلا کے لیے آتا ہے، اور "علی" کا لفظ اس پر دلالت کرتا ہے کہ آپ ان اخلاق پر حاکم ہیں اور آپ کی نسبت اخلاق حسنہ کی طرف ایسے ہے جیسے مولیٰ کی نسبت غلام کی طرف اور امیر کی نسبت مامور کی طرف ہوتی ہے۔" [تفسیر کبیر: ۱۰/۶۰۱]

امام رازی قدس سرہ کا مطلب یہ ہے کہ عربی زبان میں "علٰی" کا لفظ فوقیت اور بلندی کے لیے آتا ہے۔ اس وجہ سے اس آیت کا مطلب یہ ہے کہ آپ خلق کی عظمتوں پر فائق اور سوار ہیں۔ اور آپ خلق کی باگوں کو جس طرف موڑ دیتے ہیں وہی "خلق عظیم" ہو جاتا ہے۔ یہ ایک عام اور مسلمہ قاعدہ ہے کہ جو شخص کوئی اچھا کام کرے وہ اچھا ہو جاتا ہے، اور جو شخص کوئی عظیم کام کرے وہ عظیم کہلاتا ہے، اور اس طرح سے لوگ اچھے اور عظیم ہوتے ہیں یعنی وہ اچھائی اور عظمت کے تابع ہوتے ہیں، لیکن آپ کی ذات کے بارے میں یہ قاعدہ یوں نہیں ہے بلکہ اس کے برعکس ہے یعنی آپ ﷺ اپنے عظیم ہونے میں "خلق عظیم" کے تابع نہیں بلکہ خلق عظیم اپنے عظیم ہونے میں آپ کے فعل کے تابع ہے یعنی آپ جس فعل کو کرلیں وہی "خلق عظیم" ہو جاتا ہے۔ تو اس آیت میں "علٰی" کا لفظ استعمال کرنے میں یہ نکتہ ہے کہ آپ خلق کی عظمتوں پر سوار ہیں، اور جس طرح سواری سوار کے تابع ہوتی ہے اسی طرح خلق اپنے عظیم ہونے میں آپ کے تابع ہے۔

اخلاق کی تینوں قسموں میں فرق

جب اخلاق کی تین قسمیں ہوئیں تو ان تینوں قسموں میں کیا فرق ہے؟ خلق حسن ابتدائی درجہ ہے، خلق کریم درمیانہ درجہ اور خلق عظیم انتہائی درجہ ہے۔

(۱) خلق حسن کیا ہے؟ خلق حسن عدل کامل کو کہتے ہیں یعنی معاملہ میں آدمی حد اعتدال سے تجاوز نہ کرے۔ اگر کوئی آپ کو ایک تھپڑ مارے تو اس کے جواب میں آپ نے بھی اتنے ہی زور سے اسے تھپڑ مار دیا جتنے زور سے اس نے مارا تھا تو کہا جائے گا کہ آپ

نے ''خلق حسن'' سے کام لیا۔ لیکن اگر اس نے آپ کو ایک تھپڑ مارا اور آپ نے اس کے جواب میں اس کو ایک زوردار مکہ مار دیا تو یہ تعدی اور ظلم ہوگا۔ تو ''خلق حسن'' کا مطلب ہے تعدی اور زیادتی سے بچ جانا اور عدل کے اوپر قائم رہنا۔ گویا خلق حسن کا مطلب ہے اعتدال اور معاملات کا عدل۔

(۲) دوسرا درجہ اخلاق کا ''خلق کریم'' ہے۔ اس میں ادل بدل نہیں ہوتا بلکہ ایثار اور قربانی ہوتی ہے، یعنی دوسرا زیادتی کرے تو بجائے بدلہ لینے کے اسے معاف کر دیا جائے۔ جیسے ایک شخص نے آپ کو تھپڑ مارا، آپ نے اسے کہا کہ مجھے تم سے بدلہ لینے کا حق تو ہے لیکن میں تمہیں معاف کرتا ہوں۔ یہ ایک قسم کا ایثار ہے۔ اس کو ''خلق کریم'' کہتے ہیں۔

(۳) اخلاق کا تیسرا درجہ ''خلق عظیم'' ہے اور وہ یہ ہے کہ کوئی شخص آپ کے ساتھ زیادتی کرے تو نہ صرف آپ اسے معاف کر دیں بلکہ الٹا اس کے ساتھ احسان بھی کریں۔ یہ خلق عظیم ہے، چنانچہ حدیث میں ہے:

﴿صل من قطعک، واعف عمن ظلمک و احسن الیٰ من اساء الیک﴾

''جو تمہارے ساتھ قطع تعلق کرے تم اس کے ساتھ تعلق جوڑنے کی کوشش کرو، جو تم پر ظلم کرے اس کو معاف کر دو اور جو تم سے برائی کرے تم اس کے ساتھ بھلائی کرو۔''

اور انبیاء کرام علیہم السلام تو خلق حسن اور خلق کریم کی تعلیم دیتے تھے لیکن آپ چونکہ خود خلق عظیم کے حامل تھے لہٰذا آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی امت کو بھی ''خلق عظیم'' کی تعلیم دی۔ وہ اس طرح کہ نہ تو یہ فرمایا کہ تم پر بدلہ لینا واجب ہے، اور نہ یہ فرمایا کہ تم پر معاف کرنا واجب ہے بلکہ دونوں چیزوں کو جمع کر دیا اور ساتھ ہی اعلیٰ مقام بھی پیش کر دیا۔ فرمایا:

﴿وَجَزَاءُ سَيِّئَةٍ سَيِّئَةٌ مِّثْلُهَا، فَمَنْ عَفَا وَاَصْلَحَ فَاَجْرُهُ عَلَى اللّٰهِ، اِنَّهُ لَا يُحِبُّ الظّٰلِمِيْنَ﴾

''اور برائی کا بدلہ برائی ہے، تمہیں حق ہے کہ جو تمہارے ساتھ برائی

کرے تم بھی برائی کرو (کوئی تمہیں تھپڑ مارے تو تم بھی تھپڑ مارو، جو مکّہ مارے تم بھی اسے مکہ مارو۔ برائی کا بدلہ برائی ہے) اور اگر تم معاف کردو تو اللہ کے ہاں بڑے بڑے درجات ہیں۔ بے شک اللہ تعالیٰ ظالموں کو پسند نہیں کرتا۔''

تو دونوں حق دے دیئے۔ انتقام لینے کا حق بھی اور معاف کرنے کا حق بھی۔ اگر معاف کردینے کے بعد اس کے ساتھ خیر خواہی بھی کرے تو یہ ''خلق عظیم'' ہے۔ لہٰذا جو شخص خلق عظیم کا حامل ہوگا خلق حسن اور خلق کریم دونوں اسکے نیچے آگئے کیوں کہ جب اعلیٰ مقام حاصل ہوگیا درمیان کا اور ادنیٰ مقام بھی حاصل ہوگئے۔

حضور ﷺ کے محاسن اخلاق

آپ کی زندگی کا اگر بغور مطالعہ کیا جائے تو آپ کی زندگی محاسن اخلاق اور خلق عظیم کی تعلیمات سے بھری ہوئی ہے۔ چنانچہ ایک مرتبہ ہشام بن عامر نے سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے دریافت کیا کہ مجھے رسول اللہ ﷺ کے اخلاق کے بارے میں کچھ بتائیے۔ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا: ''کیا تم قرآن نہیں پڑھتے؟ میں نے کہا: کیوں نہیں۔ سیدہؓ نے فرمایا: ''آپ کا خلق قرآن تھا۔'' [مسلم رقم ۷۴۶]

سیدہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا بیان فرماتی ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو کبھی کسی سے ظلم کا بدلہ لیتے ہوئے نہیں دیکھا جب تک کہ اللہ تعالیٰ کے محارم اور اس کی حدود میں سے کسی حد کو نہ توڑا جاتا، اور جب اللہ تعالیٰ کے محارم میں سے کسی چیز کو پامال کیا جاتا تو آپ سب سے زیادہ غضب ناک ہوتے تھے۔ اور جب بھی آپ کو دو چیزوں میں اختیار دیا جاتا تو آپ ان میں سے جو سب سے زیادہ آسان ہوتی اس کو اختیار کرتے بشرطیکہ وہ گناہ نہ ہو۔'' [بخاری رقم ۳۵۶۰، مسلم رقم ۲۳۲۷، سنن ابی داؤد رقم ۴۷۸۵، مسند احمد بن حنبل ۸۵/۶، مسند ابی یعلی رقم ۴۳۷۵، ابن حبان رقم ۶۴۱۰، المصنف عبدالرزاق رقم ۱۷۹۴۲]

سیدہ ربیع بنت معوذ بن عفراء رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ میں سرکار دو عالم ﷺ کی

خدمت میں کھجوروں کا ایک خوشا اور کچھ ککڑیاں یا جو لے کر گئی تو سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے میرے دونوں ہاتھوں میں زیورات اور سونا دیا۔

[شمائل ترمذی رقم ۳۵۷، مسند احمد ۶/ ۳۵۹، معجم کبیر طبرانی ۲۴/ ۲۷۳]

سیدنا انس بن مالک رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ ایک عورت سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئی اور عرض کیا: ''مجھے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے کام ہے۔'' آپ نے فرمایا: ''تم مدینہ کے جس راستہ میں چاہو بیٹھ جاؤ، میں تمہارے پاس بیٹھ جاؤں گا۔''

[سنن ابی داؤد رقم ۴۸۱۸، مسلم رقم ۲۳۲۶، مسند احمد ۳/ ۲۸۵]

سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ ایک دیہاتی نے مسجد میں پیشاب کر دیا لوگ اس کو مارنے کے لیے جھپٹے تو سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان سے فرمایا: ''اس کو چھوڑ دو اور اس کے پیشاب کے اوپر ایک یا دو ڈول پانی بہا دو، کیوں کہ تم آسانی کرنے کے لیے بھیجے گئے ہو مشکل میں ڈالنے کے لیے نہیں بھیجے گئے۔'' [بخاری رقم ۶۱۲۸، مسلم رقم ۲۸۴]

سیدنا انس بن مالک رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ میں سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ جا رہا تھا آپ کے اوپر ایک نجرانی چادر تھی جس کے کنارے سخت موٹے تھے ایک دیہاتی نے اس چادر کو پکڑ کر نہایت سختی سے کھینچا میں نے دیکھا کہ اس چادر کو سختی کے ساتھ کھینچنے کی وجہ سے آپ کے کندھے پر نشان پڑ گئے تھے۔ پھر اس دیہاتی نے کہا: ''اے محمد! (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) آپ کے پاس جو اللہ کا مال ہے اس میں سے مجھے دینے کا حکم دیجیے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس کی طرف مڑ کر دیکھا۔ آپ مسکرائے اور پھر آپ نے اسے کچھ عطا کرنے کا حکم فرمایا۔'' [بخاری رقم ۶۰۸۸، مسلم رقم ۱۰۵۷]

سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ آپ سے ایک مرتبہ عرض کیا گیا: ''یا رسول اللہ! مشرکین کے خلاف دعا کیجیے۔'' آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''مجھے لعنت کرنے والا بنا کر نہیں بھیجا گیا مجھے تو صرف رحمت بنا کر بھیجا گیا ہے۔''

[مسلم رقم ۲۵۹۹، شرح السنۃ بغوی ۱۳/ ۲۴۰، الادب المفرد رقم ۳۲۷]

سیدنا جریر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ایک شخص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سامنے کھڑا ہوا

کپکپا رہا تھا۔ آپ ﷺ نے اس سے فرمایا: ''تم اطمینان سے کھڑے رہو کیوں کہ میں بادشاہ نہیں ہوں بلکہ قریش کی ایک ایسی عورت کا بیٹا ہوں جو گوشت سکھا کر کھاتی تھی۔''

[معجم الاسط طبرانی رقم ۱۲۸۲، مجمع الزوائد رقم ۱۴۲۴]

سیدنا عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ جب رئیس المنافقین عبداللہ بن ابی ابن فوت ہوگیا تو اس کی نماز جنازہ پڑھانے کے لیے سرکار دو عالم ﷺ کو بلایا گیا۔ جب آپ اس کی نماز جنازہ پڑھانے کے لیے کھڑے ہوئے تو میں دوڑ کر آپ ﷺ کے پاس گیا اور عرض کی: ''یا رسول اللہ! کیا آپ ابن ابی کی نماز جنازہ پڑھا رہے ہیں؟ حالانکہ اس نے فلاں روز یہ اور یہ کہا تھا'' میں نے آپ کو اس کی وہ تمام باتیں جو اس نے آپ کو اور آپ کے دین کو بدنام کرنے کے لیے کہی ہوئی تھیں یاد دلائیں اور گنوائیں۔'' رسول اللہ ﷺ نے تبسم فرمایا اور کہا: ''عمر! اپنی رائے کو رہنے دو۔'' جب میں نے بہت اصرار کیا تو آپ نے فرمایا: ''مجھے اختیار دیا گیا ہے کہ استغفار کر و یا نہ کرو۔ سو میں نے استغفار کرنے کو اختیار کر لیا۔ اور اگر مجھے یہ علم ہوتا کہ اگر میں نے ستر مرتبہ سے زیادہ استغفار کیا تو اس کی مغفرت کر دی جائے گی تو میں ستر مرتبہ سے زیادہ استغفار کرتا۔'' سیدنا عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ پھر سرکار دو عالم ﷺ نے اس کی نماز جنازہ پڑھائی۔ الحدیث [بخاری رقم ۱۳۶۶، ۲/۶۷۴]

ہبار بن الاسود نے نبی اکرم ﷺ کی صاحبزادی سیدہ زینب سلام اللہ علیہا کو پشت میں نیزہ مارا تھا۔ اس وقت وہ حاملہ تھیں۔ وہ گر گئیں اور ان کا حمل ضائع ہوگیا جس وقت سرکار دو عالم ﷺ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے ساتھ مدینہ منورہ میں بیٹھے ہوئے تھے اچانک ہبار بن الاسود آ گیا وہ بہت فصیح اللسان تھا۔ اس نے کہا: ''اے محمد! جس نے آپ کو برا کہا اسکو برا کہا گیا، میں آپ کے پاس اسلام کا اقرار کرنے آیا ہوں۔ پھر اس نے کلمہ شہادت پڑھا۔ رسول اللہ ﷺ نے اس کا اسلام قبول کر لیا۔ اس وقت رسول اللہ ﷺ کی کنیز سلمہ آئیں اور انہوں نے ہبار سے کہا: ''اللہ تیری آنکھوں کو ٹھنڈا نہ کرے تو وہی ہے جس نے فلاں فلاں کام کیا تھا۔'' آپ ﷺ نے فرمایا: ''اسلام نے ان تمام کاموں کو مٹا دیا ہے، اور سرکار دو عالم ﷺ نے اس کو برا کہنے اور اس کے گزشتہ کام گنوانے سے منع فرما

دیا۔'' [کتاب المغازی للواقدی: ۲/ ۸۵۷]

کہاں تک گنوایا جائے حدیث و تاریخ کی کتابیں آپ کے خلق عظیم سے بھری ہوئی ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے صفوان بن امیہ کو معاف فرمایا حالانکہ وہ آپ کے قتل کی سازش میں شریک تھا۔ عکرمہ بن ابی جہل کو معاف فرما دیا جب کہ اس نے اور اس کے باپ نے ہر موقع پر آپ کو اذیت دی۔ اس وحشی بن حرب کے گناہ عظیم پر اپنے خلق عظیم سے قلم عفو پھیر دیا جس نے آپ کے محبوب و مکرم چچا سیدنا حمزہ رضی اللہ عنہ کو جنگ احد میں شہید کر دیا تھا۔

اخلاق کی دو قسمیں

ایک اور لحاظ سے اخلاق کی علماء نے دو قسمیں بیان کی ہیں۔ ایک معمولی اخلاق اور دوسری اعلیٰ اخلاق۔ پہلی قسم یہ کہ آدمی کا اخلاق جوابی ہو، یہ عام اخلاق ہے، اعلیٰ اخلاق یہ ہے کہ آدمی دوسرے کے رویہ کی پروا کیے بغیر اپنا اخلاق متعین کرے۔ اس کا اخلاق اصولی ہو جوابی نہ ہو۔ اعلیٰ اخلاقیات اس کا ایک عام اصول ہو جس کو وہ ہر جگہ برتے خواہ معاملہ دشمن کے ساتھ ہو یا دوست کے ساتھ ہو۔ وہ جڑنے والا ہو یہاں تک کہ اس سے بھی جو اس سے کٹ جائے۔ وہ اس سے بھی بہتر سلوک کرنے والا ہو جو اس سے برا سلوک کرے۔ وہ ہر ظالم کے ظلم کو نظر انداز کرنے والا ہو۔

سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ آپ کی مدنی زندگی کا ایک واقعہ بیان فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے نجد کے لوگوں کی طرف چند سوار بھیجے جو آپ کے دشمن بنے ہوئے تھے۔ وہ یمامہ کے حاکم ثمامہ بن اثال کو راستہ میں مل گئے۔ انہوں نے اس کو گرفتار کر لیا اور سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں لے آئے۔ مدینہ پہنچ کر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے اس کو مسجد کے ایک ستون کے ساتھ باندھ دیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس کی رہائی کا حکم فرما دیا۔ یہ واقعہ اس وقت کی دنیا میں نہایت عجیب و غریب تھا کیوں کہ قبائلی زندگی میں کسی دشمن کے ہاتھ آ جانے کے بعد اس کا ایک ہی انجام تھا اور وہ یہ کہ اس کو قتل کر دیا جائے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے خلق عظیم سے اس کے جسم کو تو قتل نہ کیا مگر اس کی روح کو قتل کر دیا۔ چنانچہ قید

سے چھوٹنے کے بعد ثمامہ قریب کے ایک باغ میں گیا اور غسل کر کے دوبارہ مسجد نبوی میں آیا۔ لوگ حیران تھے کہ یہ دوبارہ کس لیے یہاں آیا ہے، لیکن جب اس نے بلند آواز سے کلمۂ شہادت پڑھ کر اپنے مسلمان ہونے کا اعلان کیا تو معلوم ہوا کہ رسول اللہ ﷺ نے اس کو چھوڑ کر، دراصل ہمیشہ کے لیے اس کو گرفتار کر لیا تھا۔ اس کے بعد ثمامہ عمرہ کے لیے مکہ گیا۔ جب وہ حرم میں پہنچا اور وہاں کے لوگوں کو ثمامہ کے اسلام لانے کا علم ہوا تو انہوں نے کہا: ''تم بے دین ہو گئے ہو۔'' ثمامہ نے جواب دیا کہ میں بے دین نہیں ہوا بلکہ میں نے خدا کے رسول کے دین کو اختیار کر لیا ہے۔ یہی نہیں بلکہ ثمامہ اسلام کی قوت کا ذریعہ بن گیا۔ اس زمانہ میں مکہ کے لوگوں کو باہر کے جن مقامات سے گندم فراہم ہوتی تھی، ان میں یمامہ ایک خاص مقام تھا۔ چنانچہ ثمامہ نے اہل مکہ سے کہا: ''سن لو! محمد (ﷺ) کی اجازت کے بغیر اب گندم کا ایک دانہ بھی یہاں نہیں آئے گا۔''

مکہ شہر وادی غیر ذی زرع تھا۔ اس میں کوئی چیز پیدا نہ ہوتی تھی۔ اناج یمامہ سے آتا تھا۔ یمامہ کے حاکم ثمامہ بن اثال رضی اللہ عنہ جب حلقہ بگوش اسلام ہو گئے اور انہوں نے مکہ مکرمہ کی طرف غلہ کی برآمد بند کر دی تو مکہ والوں کا برا حال ہونے لگا۔ اس بندش سے قریش میں کہرام مچ گیا۔ ہر طرف ایک سراسیمگی کا عالم تھا۔ انہوں نے سخت اضطراب اور بدحواسی کے عالم میں سرکار دو عالم ﷺ کی طرف رجوع کیا اور درخواست کی کہ یمامہ کے حاکم کو حکم فرمایا جائے کہ وہ اناج کی بندش کو اٹھا لے۔ کوئی اور ہوتا تو انہیں ان کے مظالم یاد کراتا اور کہتا کہ آج تم کون سا منہ لے کر میرے پاس آئے ہو۔ تم نے میرے اور میرے ساتھیوں کے ساتھ کیا کچھ نہیں کیا کہ آج میں تمہارے ساتھ کوئی نیکی کروں، لیکن وہ تو خلق عظیم کے مالک تھے اور تمام جہانوں کے لیے رحمت بن کر آئے تھے۔ مکہ والوں پر اپنا دامانِ رحمت کیوں نہ پھیلاتے۔ آپ ﷺ نے اسی وقت حاکم یمامہ ثمامہ بن آثال رضی اللہ عنہ کو کہلا بھیجا کہ اناج کی بندش اٹھا لو۔ چنانچہ اس نے سرکار دو عالم ﷺ کے حکم کی تعمیل میں اناج کی بندش اٹھا لی اور اناج مکہ پہنچنے لگا، حالانکہ یہ اہل مکہ وہی تھے جنہوں نے تمام بنو ہاشم کو شعب بنی ہاشم میں نظر بند کر رکھا تھا اور مسلسل تین سال آپ کے خاندان والوں کے ساتھ

ایسا مقاطعہ کیا تھا کہ اناج کا ایک دانہ بھی ان تک نہیں پہنچنے دیتے تھے۔ بنو ہاشم کے بچے بھوک سے تڑپتے اور بلبلاتے تھے لیکن ان ظالموں کے پتھر سے زیادہ سخت دل کسی طرح نہ پسیجتے تھے بلکہ یہ بچوں کا رونا سن کر قہقہے لگاتے۔ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان کی ان سب باتوں سے درگزر فرما کر ان کے لیے اناج کی بندش ختم کرادی۔ [سیرت ابن ہشام: ۱/۳۶۴]

سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا یہ جذبہ ترحم اور صفت رحمت میدان جنگ میں بھی رہتا تھا۔ حدیث سے پتہ چلتا ہے کہ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھیوں نے میدان بدر میں پانی کا ایک حوض اپنی ضرورت کے لیے تیار کیا تھا۔ لڑائی شروع ہونے سے قبل قریش مکہ کی فوج کے آدمی اس حوض پر پانی پینے آئے۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے انہیں پانی لینے سے روکنا چاہا۔ جنگی حکمت عملی اور اسٹریٹیجی کا تقاضا یہی تھا کہ انہیں پانی نہ لینے دیا جاتا اور دشمن پر ہر قسم کی خوراک کی بندش کر دی جاتی، لیکن سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''انہیں پانی لینے اور پینے سے منع نہ کرو۔'' [بخاری رقم ۴۴۴۲، ۴۰۲۷ علیٰ اختلاف الالفاظ]

کیا دنیا ایسی کوئی مثال پیش کر سکتی ہے؟

خلاصہ یہ کہ انبیاء کی بعثت کی دو غرضیں ہوتی ہیں۔ ایک علم پھیلانا اور دوسرا مکارم اخلاق کی تکمیل۔ چنانچہ فرمایا: ''انما بعثت معلماً'' یعنی میں دنیا میں معلم بنا کر بھیجا گیا ہوں اور دوسرے دنیا کو با اخلاق بنانے کے لیے فرمایا کہ ''بعثت لاتمم مکارم الاخلاق'' یعنی میں مکارم اخلاق کی تکمیل کے لیے بھیجا گیا ہوں کہ سب کو با اخلاق بنا دوں، چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے علم اور اخلاق دونوں کو دنیا میں پھیلایا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی شان جامعیت

افراد سے خاندان اور خاندانوں سے معاشرہ تشکیل پاتا ہے۔ معاشرہ میں کئی قسم کے لوگ ہوتے ہیں بلکہ مختلف انواع کے لوگوں سے جو معاشرہ وجود میں آتا ہے اس میں پختگی اور مضبوطی ہوتی کیوں کہ ہر صنعت وحرفت اور مختلف پیشوں سے تعلق رکھنے والے لوگ اس میں موجود ہوتے ہیں جن سے لوگوں کو ضروریات زندگی مہیا ہونے میں نہایت آسانی ہو جاتی ہے۔ اسی باہمی تعاون اور مختلف پیشوں اور کاموں ہی کے ذریعہ سے یہ دنیا چل رہی ہے کیوں کہ اس دنیا کی بنیاد ہی اختلاف ہے۔

گلہائے رنگا رنگ سے ہے زینت چمن
اے ذوق! اس جہاں کو ہے زیب اختلاف سے

اس معاشرہ میں صدر مملکت اور رئیس جمہوریہ اور حکام بھی ضروری ہیں تا کہ ملک کا نظم ونسق چلا سکیں اور رعایا، محکوم اور مطیع بھی ضروری ہیں تا کہ حکام کے احکام کی تعمیل کرنے والے ہوں۔ معاشرہ میں امن وامان کے قیام کے لیے پولیس، قاضیوں اور ججوں کا ہونا بھی نہایت ضروری ہے اور فوجوں کے کمانڈروں، سپہ سالاروں، جرنیلوں اور مختلف افسروں کا ہونا بھی اشد ضروری ہے تا کہ ملک کی حدود وثغور کی حفاظت ہو سکے اور کوئی دشمن ملک میں دراندازی نہ کر سکے۔ غریب بھی ہوں اور مال دار بھی تا کہ مال داروں کے مال کو کوئی قبول کرنے والا بھی ہو ورنہ وہ صدقہ وخیرات کی عبادت سے یک قلم محروم ہو جائیں گے۔ زاہدان شب زندہ دار بھی ہوں اور عابد مرتاض بھی، دن کے سپاہی بھی ہوں اور مجاہد بھی۔ مختصر یہ کہ اس دنیا کا نظم ونسق ان مختلف اصناف وانواع کے وجود اور قیام ہی پر موقوف ہے۔ اہل وعیال بھی ہوں، دوست واحباب بھی، تاجر اور سوداگر بھی، زمیندار اور ہاری بھی، کارخانہ دار بھی ہوں اور مزدور بھی، امام بھی ہوں اور مقتدی بھی۔

یہ جتنی انواع واصناف کے لوگ اس معاشرہ میں رہتے ہیں ان میں سے ہر ایک

کو اپنی اپنی زندگی کے لیے ایک عملی نمونہ کی ضرورت ہے۔ اسلام ان تمام انسانوں کو سنت نبوی کی اتباع کی دعوت دیتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ مختلف طبقات انسانی کے لیے اپنے پیغمبر کی عملی سیرت میں مثالیں اور نمونے رکھتا ہے جو ان میں سے ہر ایک کے لیے الگ الگ ہدایت کا چراغ بن سکتا اور وہ اس سنت کے چراغ کی روشنی میں پیغمبر اسلام ﷺ کی عملی زندگی راہ نمائی کرتی ہے۔ اسلام کے صرف اسی نظریہ سے یہ بات روز روشن کی طرح ثابت ہوتی ہے کہ پیغمبر اسلام کی سیرت طیبہ میں جامعیت ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ انسانوں کے ہر طبقہ اور صنف کے لیے آپ کی پاکیزہ سیرت میں نصیحت پذیری اور عمل کے لیے ایک سبق موجود ہے۔ ایک حاکم کے لیے محکوم کی زندگی اور ایک محکوم کے لیے حاکم کی زندگی، ایک امیر کے لیے غریب کی زندگی اور ایک غریب کے لیے امیر اور دولت مند کی زندگی ایک کامل اور مکمل مثال اور نمونہ نہیں بن سکتی، اس لیے اس بات کی سخت ضرورت ہے کہ عالم گیر اور دائمی پیغمبر کی زندگی ان تمام مختلف مناظر کے رنگ برنگ پھولوں کا ایک شاندار گل دستہ ہو۔

رسول اللہ ﷺ کی جامعیت پر حضرت مولانا سید سلیمان ندوی قدس سرہ نے بڑی نفیس بحث فرمائی ہے جس میں انہوں نے ثابت کیا ہے کہ آپ کی پاکیزہ اور مقدس زندگی ہر انسانی گروہ اور ہر انسانی حالت کے مختلف مظاہر اور ہر قسم کے صحیح جذبات اور کامل اخلاق کا نمونہ ہے۔ یہ صرف محمد رسول اللہ ﷺ کی سیرت ہے وگرنہ اور کسی پیغمبر کی سیرت اس میزان پر پوری نہیں اترتی کیوں کہ کہنے والے نے بالکل درست اور صحیح کہا کہ

آنچہ خوباں ہمہ دارند تو تنہا داری

اس لیے اس بات کی ضرورت ہے کہ عالم گیر اور دائمی پیغمبر کی زندگی ان تمام مختلف مناظر کے رنگ برنگ پھولوں کا گل دستہ ہو۔ مختصر یہ کہ ایک ایسی انسانی زندگی جو ہر انسانی گروہ اور ہر انسانی حالت کے مختلف مظاہر اور ہر قسم کے صحیح جذبات اور کامل اور مکمل اخلاق کا نمونہ ہو وہ صرف اور صرف محمد رسول اللہ ﷺ کی سیرت طیبہ ہے۔ جس کو اس کائنات میں ہر انسانی گروہ اپنے لیے نمونہ اور اسوہ بنا سکتا ہے۔ اور کہنے والے نے بالکل

درست اور صحیح کہا کہ سرکار دو عالم ﷺ کی سیرت اور اخلاق و اعمال کی دنیا کی سب سے بڑی مارکیٹ (Super Market) ہے جہاں ہر جنس کے خریدار اور ہر شے کے طلب گار کے لیے بہترین سامان موجود ہے۔

اس سلسلہ میں سید سلیمان ندویؒ نے ایک ہندو تعلیم یافتہ شخص کی رائے لکھی ہے وہ قارئین کے لیے پڑھنے کے قابل ہے۔ چنانچہ سید صاحبؒ رسول اللہ ﷺ کی تعلیمات اور شخصیت کی جامعیت پر بحث کرتے ہوئے اپنے ایک دوست کے ہندو دوست کے جذبات کو یوں نقل فرماتے ہیں:

> ''آج سے تیس چالیس برس پہلے پٹنہ کے مشہور واعظ اسلام ماسٹر حق علی مرحوم نور اسلام نام کا ایک رسالہ نکالتے تھے۔ اس میں انہوں نے اپنے ایک ہندو تعلیم یافتہ دوست کی رائے لکھی ہے کہ اس نے ایک دن ماسٹر صاحب سے کہا کہ میں آپ کے پیغمبر کو دنیا کا سب سے بڑا کامل انسان تسلیم کرتا ہوں۔ انہوں نے پوچھا: ''ہمارے پیغمبر کے مقابلہ میں تم حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو کیا سمجھتے ہو؟'' انہوں نے جواب دیا کہ محمد ﷺ کے مقابلہ میں عیسیٰ علیہ السلام ایسے معلوم ہوتے ہیں جیسے دانائے روزگار کے سامنے ایک بھولا بھالا بچہ بیٹھا ہوا میٹھی میٹھی باتیں کر رہا ہو۔ انہوں نے دریافت کیا کہ تم کیوں پیغمبر اسلام کو دنیا کا کامل ترین انسان جانتے ہو؟'' اس نے جواب دیا کہ مجھ کو ان کی زندگی میں بیک وقت اس قدر متضاد اور متنوع اوصاف نظر آتے ہیں جو کسی ایک انسان میں تاریخ نے کبھی یک جا کر کے نہیں دکھائے۔ بادشاہ ایسا کہ ایک پورا ملک اس کی مٹھی میں ہو اور بے بس ایسا کہ خود اپنے آپ کو بھی اپنے قبضہ میں نہ جانتا ہو بلکہ خدا کے قبضہ میں ہو۔ دولت مند ایسا کہ خزانے کے خزانے

اونٹوں پر لدے ہوئے اس کے دارالحکومت میں آ رہے ہوں اور محتاج ایسا کہ مہینوں اس کے گھر میں چولہا نہ جلتا ہو اور کئی کئی وقت اس پر فاقے گزر جاتے ہوں۔ سپہ سالار ایسا ہو کہ مٹھی بھر نہتے آدمیوں کو لے کر ہزاروں غرق آہن فوجوں سے کامیاب لڑائی لڑا ہو، اور صلح پسند ایسا کہ ہزاروں پر جوش جانثاروں کی ہم رکابی کے باوجود صلح کے کاغذ پر بے چوں و چرا دستخط کر دیتا ہو۔ شجاع اور بہادر ایسا ہو کہ ہزاروں کے مقابلہ میں تن تنہا کھڑا ہو اور نرم دل ایسا کہ کبھی اس نے انسانی خون کا ایک قطرہ بھی اپنے ہاتھ سے نہ بہایا ہو، با تعلق ایسا ہو کہ عرب کے ذرہ ذرہ کی اس کو فکر ہو، بیوی بچوں کی اس کو فکر، غریب اور مفلس مسلمانوں کی اس کو فکر، خدا کو بھولی ہوئی دنیا کے سدھار کی اس کو فکر، غرض سارے سنسار کی اس کو فکر ہو، اور بے تعلق ایسا کہ اپنے خدا کے سوا کسی اور کی یاد اس کو نہ ہو، اور اس کے سوا ہر چیز اس کو فراموش ہو، اس نے کبھی اپنی ذات کے لیے اپنے برا کہنے والوں سے بدلہ نہ لیا اور اپنے ذاتی دشمنوں کے حق میں دعائے خیر کی اور ان کا بھلا چاہا، لیکن خدا کے دشمنوں کو اس نے کبھی معاف نہ کیا اور حق کا راستہ روکنے والوں کو ہمیشہ جہنم کی دھمکی دیتا اور عذاب الٰہی سے ڈراتا۔ عین اس وقت جب اس پر کشور کشا فاتح کا شبہ ہو وہ پیغمبرانہ معصومیت کے ساتھ ہمارے سامنے آ جاتا ہے۔ عین اس وقت جب ہم اس کو شاہ عرب کہہ کر پکارنا چاہتے ہیں وہ کھجور کی چھال کا تکیہ لگائے کھردری چٹائی پر بیٹھا درویش نظر آتا ہے۔ عین اس وقت جب عرب کے اطراف سے آ کر اس کے صحن مسجد میں مال و دولت کا انبار لگا ہوتا ہے اس کے گھر میں فاقہ کی

تیاری ہو رہی ہے۔ عین اس عہد میں جب لڑائیوں کے قیدی مسلمانوں کے گھروں میں لونڈی اور غلام بن کر بھیجے جا رہے ہیں، فاطمہؓ بنت رسول ﷺ جا کر اپنے ہاتھوں کے چھالے اور سینہ کے داغ باپ کو دکھاتی ہے جو چکی پیستے پیستے اور مشکیزہ بھرتے بھرتے ہاتھ اور سینہ پر پڑ گئے تھے۔ عین اس وقت جب آدھا عرب اس کے زیر نگین ہوتا ہے سیدنا عمر رضی اللہ عنہ حاضر دربار ہوتے ہیں ادھر ادھر نظر اٹھا کر کاشانہء نبوت کے سامان کا جائزہ لیتے ہیں، ایک کھردری چارپائی یا چٹائی پر آرام فرما رہے ہیں، جسم مبارک پر بانوں کے نشان پڑ گئے ہیں، ایک طرف مٹھی بھر جو رکھے ہیں، ایک کھونٹی پر خشک مشکیزہ لٹک رہا ہے۔ سرور کائنات ﷺ کے گھر کی یہ کل کائنات دیکھ کر سیدنا عمر رضی اللہ عنہ رو پڑتے ہیں۔ سبب دریافت ہوتا ہے۔ عرض کرتے ہیں۔ ''یارسول اللہ! اس سے بڑھ کر رونے کا اور کیا موقع ہوگا؟ قیصر و کسریٰ باغ و بہار کے مزے لوٹ رہے ہیں اور آپ پیغمبر ہو کر اس حالت میں ہیں۔'' ارشاد ہوتا ہے۔ ''عمر! کیا تو اس پر راضی نہیں کہ قیصر و کسریٰ دنیا کے مزے لوٹیں اور ہم آخرت کی سعادت کے۔'' [خطبات مدراس ص ۷۸۔۸۰]

اسی خطبہ میں ذرا آگے چل کر سید صاحبؒ نے سرکار دو عالم ﷺ کی شان جامعیت کو ان الفاظ میں بیان فرمایا ہے۔

''حضرت نوح علیہ السلام کی زندگی کفر کے خلاف غیظ و غضب کا ولولہ پیش کرتی ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی حیات بت شکنیوں کا منظر دکھاتی ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی زندگی کفار سے جنگ و جہاد، شاہانہ نظم و نسق اور اجتماعی دستور و قوانین کی مثال پیش کرتی ہے۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی لائف صرف خاکساری، تواضع، عفوودرگزر اور قناعت کی تعلیم دیتی ہے۔ حضرت سلیمان علیہ السلام کی زندگی شاہانہ اولوالعزمیوں کی جلوہ گاہ ہے۔ حضرت ایوب علیہ السلام کی حیات صبر وشکر کا نمونہ ہے۔ حضرت یونس علیہ السلام کی سیرت ندامت اور انابت کے اعتراف کی مثال ہے۔ حضرت یوسف علیہ السلام کی زندگی قید وبند میں بھی دعوت حق اور جوش تبلیغ کا سبق ہے۔ حضرت داؤد علیہ السلام کی سیرت گریہ وبکا، حمد وستائش اور دعا زاری کا صحیفہ ہے۔ حضرت یعقوب علیہ السلام کی زندگی امید، خدا پر توکل اور اعتماد کی مثال ہے، لیکن محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سیرت مقدسہ کو دیکھو کہ اس میں نوح اور ابراہیم، موسیٰ، عیسیٰ، سلیمان، داؤد، ایوب، یونس، یوسف اور یعقوب علیہم السلام سب کی زندگیاں اور سیرتیں سمٹ کر سما گئی ہیں۔

محدث خطیب بغدادی کی ایک ضعیف روایت میں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی پیدائش کے وقت ندا آئی کہ محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ملکوں ملکوں پھراؤ اور سمندر کی تہوں میں لے جاؤ کہ تمام دنیا ان کے نام ونشان کو پہچان لے۔ جن وانس، چرند وپرند بلکہ ہر جاندار کے سامنے ان کو لے جاؤ، ان کو آدم کا خلق، شیث کی معرفت، نوح کی شجاعت، ابراہیم کی دوستی، یحییٰ کی پاک دامنی اور عیسیٰ کا زہد عطا کرو اور تمام پیغمبروں کے اخلاق میں ان کو غوطہ دو۔ جن علماء نے اس روایت کو اپنی کتابوں میں جگہ دی ہے، ان کا منشاء درحقیقت یہی ہے کہ وہ پیغمبر اسلام علیہ الصلوٰۃ والسلام کی صفات جامعیت کو نمایاں کرلیں کہ جو کچھ اور انبیاء کو متفرق طور سے عطا ہوا

تھا وہ سب مجموعی طور پر آنحضرت ﷺ کو عنایت ہوا۔

حسن یوسف، دم عیسیٰ، ید بیضا داری
آنچہ خوباں ہمہ دارند تو تنہا داری

حضرت موسیٰ قانون لے کر آئے۔ حضرت داؤد دعا اور مناجات لے کر اور حضرت عیسیٰ زہد و اخلاق لے کر، مگر محمد ﷺ قانون بھی لائے، دعا و مناجات بھی، اور زہد و اخلاق بھی، ان سب کا مجموعہ الفاظ و معانی میں قرآن اور عمل میں سیرت محمد ﷺ ہے۔"

[خطبات مدراس ص ۸۱۔۸۲]

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور تجارت

جیسا کہ بتایا گیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تمام علوم کے جامع تھے۔ آپ نے دنیا کو نہ صرف عبادات کی تعلیم دی بلکہ دنیا میں رہنے کے طریقے بھی سکھائے۔ معاشرت اور معاملات کے طریقے بھی بتائے۔ اس دنیا میں ہمیشہ سے یہ طریقہ چلا آیا ہے اور اب بھی یہی طریقہ چل رہا ہے کہ ہر فن کے لیے الگ کالج اور تعلیم گاہیں ہوتی ہیں۔ زراعت کے لیے الگ، انجینئرنگ اور میڈیکل کے لیے الگ، قانون کے لیے الگ، کامرس کے لیے الگ غرض کہ ہر فن کے لیے الگ الگ تعلیم گاہیں ہوں ہیں اور جس فن کی کوئی تعلیم گاہ ہوتی ہے اس سے اسی فن کے لوگ تیار ہو کر نکلتے ہیں۔ ڈاکٹری کے لیے الگ کالج ہوتا ہے، صنعت وحرفت کے لیے اور زراعت اور تجارت کے لیے الگ الگ تعلیم گاہیں ہوتی ہیں، لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ایک ہی درس گاہ اور ایک ہی تعلیم گاہ تھی۔ اس میں سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ، سیدنا عمر رضی اللہ عنہ، سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ، سیدنا علی رضی اللہ عنہ، سیدنا سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ، سیدنا طلحہ رضی اللہ عنہ اور سیدنا زبیر رضی اللہ عنہ وغیرہ مکہ کے قریشی طالب علم تھے۔ ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ اور انیس تہامہ کے غفاری قبیلہ کے طالب علم، ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ اور طفیل بن عمرو رضی اللہ عنہ دوس قبیلہ کے ہیں، ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ، اور معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ یمن سے تعلق رکھتے ہیں۔ ضماد رضی اللہ عنہ کا تعلق ازد قبیلہ سے ہے۔ بلال رضی اللہ عنہ حبش سے ہیں اور صہیب رضی اللہ عنہ روم سے تعلق رکھتے ہیں۔ اس ایک ہی مدرسہ میں ابوبکرؓ، عمرؓ، عثمان، علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہم اور معاویہ بن ابی سفیان بہترین حکمران جنھوں نے مشرق سے لے کر مغرب تک اور افریقہ سے لے کر برصغیر پاک و ہند تک فرمان روائی کی اور دنیا کے بڑے بڑے حکمرانوں کے عدل وانصاف اور دستور وقوانین کو بے اثر کر کے رکھ دیا اور دنیا کی سیاسی زندگی کا نقشہ تبدیل کر کے رکھ دیا۔ خصوصی طور پر سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے دنیا میں سب سے پہلے اسلامی فلاحی مملکت قائم کی جس کی نظیر آج تک نہیں ملتی۔ آپ نے قریباً

ساڑھے دس سال حکومت کی اور اپنے دورِ حکومت میں لاکھوں مربع میل علاقہ فتح کر کے اسلامی ریاست کے حدود و ثغور میں اضافہ کیا جو مشرق میں افغانستان اور چین، مغرب میں تیونس اور اس سے آگے بڑھ کر شمالی افریقہ، شمال میں اناطولیہ اور قزوین اور جنوب میں بلاد نوبہ تک اسلامی مملکت کی پہنائیوں میں اضافہ کیا۔ اسلام کی آمد سے قبل عرب کسی منظم حکومت کے تصور سے ناآشنا تھے۔ ان کی زندگی قبائلی زندگی تھی۔ ہر قبیلہ کا الگ الگ رئیس ہوتا تھا جو ان کے برے بھلے کا سوچتا تھا۔ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے انہیں ایک مرکزی قوت میں منظّم کیا۔ مملکت کے مختلف حصوں کو ایک مضبوط لڑی میں پرو کر ناقابلِ شکست بنا دیا۔ اس کی تفصیل ہم نے اپنی کتاب ''سیرت سیدنا عمر بن الخطاب'' میں دی ہے۔

دوسری طرف خالد بن ولیدؓ، سعد بن ابی وقاصؓ، ابوعبیدہ بن الجراحؓ، عمرو بن العاصؓ وغیرہ جیسے سپہ سالار اور جرنیل پیدا کیے جنہوں نے چند ہی سالوں میں مشرق و مغرب کی دو ظالم اور گنہگار اور انسانیت کے لیے لعنت سلطنتوں (جس کی تفصیل ہم نے اس کتاب کی ابتداء میں دی ہے) کو الٹ پلٹ کر کے رکھ دیا اور ان کے کارناموں کی دھاک آج بھی لوگوں کے دلوں پر بیٹھی ہوئی ہے۔ سیدنا سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ فاتح فارس نے عراق و ایران کا تاج شاہی اتار کر اسلام کے قدموں میں ڈال دیا۔ سیدنا عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ نے فرعون کی سرزمین مصر رومن حکومت سے زبردستی چھین کر اسلامی مملکت میں شامل کر لی۔

ایک طرف عرب کے تاجروں کی ایک جماعت تیار کی جنہوں نے کاروباری دنیا میں اپنی دھاک بٹھائی لیکن یہ تجارت اور بیوپار انہیں اللہ کے ذکر سے غافل نہ کر سکا۔ سیدنا طلحہ بن عبید اللہ رضی اللہ عنہ ایک بہت بڑے تاجر تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی بشارت بھی آپ کو تجارتی سفر ہی میں ملی تھی، لیکن اس کے ساتھ زراعت کا شغل بھی تھا اور یہ نہایت وسیع پیمانے پر تھا۔ آپ کے عراق عرب میں کئی زراعتی فارم تھے۔ ان میں قناۃ اور سراۃ نہایت مشہور تھے۔ صرف قناۃ کے کھیتوں میں بیس اونٹ سیرابی کا کام کرتے تھے۔ ایسا ہی انتظام کچھ سراۃ میں بھی تھا۔ آپ کی تجارت بھی بہت بڑے پیمانے پر تھی۔

[طبقات ابن سعد ۳/ ۱۸۵، معجم کبیر طبرانی رقم ۱۹۶، حلیۃ الاولیاء ۱/ ۸۸، مجمع الزوائد ۹/ ۱۴۸]

تجارت اور زراعت کی آمدنی سے وہ بنو تیم کے محتاجوں کی کفالت فرماتے اور اس کی بیواؤں اور یتیموں کی اعانت فرماتے اور سیدہ عائشہؓ کو سالانہ دس ہزار درہم دیتے۔

[طبقات ابن سعد ۳/ ۱۸۵]

گھر میں مال و دولت کی فراوانی تھی۔ تجارت اور زراعت دونوں طریقوں سے مال و دولت گھر میں آتی تھی، لیکن جتنا مال آتا ان میں لاکھوں درہم و دینار اللہ کی راہ میں خرچ کر دیتے۔ ایک مرتبہ سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ نے ان کے صاحبزادے موسیٰ رضی اللہ عنہ سے پوچھا کہ تمہارے والد کس قدر دولت چھوڑ کر گئے؟ انہوں نے کہا: ''بائیس لاکھ درہم، دو لاکھ دینار اور اس کے علاوہ کثیر مقدار میں سونا اور چاندی۔ غیر منقولہ جائیداد اس کے علاوہ تھی جس کی کل قیمت کا محتاط اندازہ تین کروڑ درہم تھا۔ یہ سن کر سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ نے کہا: ''عاش حميداً سخياً شريفاً وقتل فقيداً رحمه الله''

[طبقات ابن سعد ۳/ ۱۵۶، سیر اعلام النبلاء ۵/ ۲۳۲]

اسی طرح سیدنا زبیر بن العوام رضی اللہ عنہ کا پیشہ بھی تجارت تھا۔ حالت یہ تھی کہ آپ جس کام کو ہاتھ لگاتے اس میں کبھی خسارہ نہ ہوتا۔ [الاستیعاب ۱/ ۲۰۸] فاروقی فوج میں افسر بھی کچھ عرصہ رہے اور فاروقی افسروں کی تنخواہیں سات سے دس ہزار درہم تک تھیں۔ اتنا مال دار ہونے کے باوجود فیاضی اور سخاوت میں ایک بہت بڑے مقام کے حامل تھے۔ آپ کے پاس ایک ہزار غلام تھے جو روزانہ اجرت پر کام کر کے ایک بہت بڑی رقم لاتے تھے لیکن اس مال میں سے آپ نے ایک حبہ بھی اپنی ذات پر اور اپنے اہل و عیال پر کبھی صرف نہ کیا تھا بلکہ جو کچھ آتا وہ اسی وقت اللہ کے راستہ میں خرچ کر دیتے۔ ایک مرتبہ ایک مکان چھ لاکھ میں فروخت کیا۔ کسی نے کہا کہ آپ نے زیادہ قیمت لی ہے۔ فرمایا: ''ہرگز نہیں۔'' اور وہ ساری کی ساری رقم راہ خدا میں تقسیم فرما دی۔ [سیر اعلام النبلاء ۱/ ۵۷]

سیدنا عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ نے جب ہجرت فرمائی تو مدینہ طیبہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے سیدنا سعد بن ربیع انصاری رضی اللہ عنہ کو ان کا اسلامی بھائی بنایا۔ سیدنا سعد بن ربیع رضی اللہ عنہ نے ان کو اپنا مال و دولت تقسیم کرنا چاہا اور کہا میں انصار میں سب

سے زیادہ مال دار ہوں۔ آپ میرا آدھا مال لے لیں۔ یہ سن کر سیدنا عبدالرحمٰن رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ مجھے بازار کا راستہ بتادیں۔ چنانچہ انہوں نے بنو قینقاع کا بازار دکھا دیا۔ وہ روزانہ بازار جاتے اور انہوں نے تجارت میں بہت سا مال کمایا۔ مکہ مکرمہ میں بھی آپ تجارت کرتے تھے، لیکن ہجرت کے بعد اللہ نے ان کی تجارت میں بڑی برکت دی۔ خود فرمایا کرتے تھے کہ اگر میں پتھر بھی اٹھاتا ہوں تو اس کے نیچے سے بھی سونا نکل آتا ہے۔

آئے روز ان کے تجارتی قافلے مدینہ طیبہ آتے جاتے جس کی وجہ سے ان کے ہاں دولت کے ڈھیر تھے۔ ایک مرتبہ ان کا تجارتی قافلہ مدینہ طیبہ آیا، اس میں سات سو اونٹوں پر صرف گیہوں، آٹا اور دوسری اشیاء خوردنی لدی ہوئی تھیں۔ جب وہ عظیم الشان قافلہ مدینہ میں داخل ہوا تو پورے مدینہ میں اس کا شور مچ گیا۔ جب سیدہ عائشہ صدیقہ سلام اللہ علیہا کو اس قافلہ کا علم ہوا تو فرمایا کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے:

عبدالرحمن لایدخل الجنة الاحبواً

عبدالرحمٰن جنت میں رینگتے ہوئے جائیں گے

جب سیدنا عبدالرحمٰن رضی اللہ عنہ کو اس بات کی اطلاع ہوئی تو سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کی کہ ''اے اماں! میں آپ کو گواہ بناتا ہوں کہ یہ پورا قافلہ مع اسباب و سامان بلکہ اونٹ اور کجاوہ تک اللہ کے راستہ میں وقف کرتا ہوں۔

[مسند احمد ۱۱۵/۶، طبرانی رقم ۲۶۶۴، طبقات ابن سعد ۹۳/۳، حلیۃ الاولیاء ۹۸/۱، اسد الغابہ ۳۱۶/۳]

اگرچہ بہت مال دار تھے لیکن ان میں ''حب دنیا'' نہیں تھی اور ہر برائی کی جڑ دراصل حب دنیا ہے۔ کسب دنیا نہیں۔ رسول اللہ ﷺ کی نگاہ انقلاب آفرین نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے دلوں سے دنیا کی محبت، مال کی حرص نکال دی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ جب بھی اللہ تعالیٰ کے راستہ میں خرچ کرنے کا سندیسہ بارگاہ رسالت سے آیا، صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے نہ صرف مال بلکہ اپنی جانیں بھی قربان کردیں۔ سیدنا عبدالرحمٰن کے بارہ میں امام ذہبی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں۔

کان عامة ماله من التجاره

یعنی ان کا اکثر مال تجارت کا تھا۔

لیکن لاکھوں درہم و دینار، پانچ سو اونٹ اور پانچ سو گھوڑے رسول اللہ ﷺ کی اس دنیوی زندگی میں اللہ کی راہ میں تقسیم کیے۔

[طبرانی رقم ۲۶۵، حلیۃ الاولیاء ۹/ ۹۹، الاصابہ ۶/ ۱۱۱، کنز العمال رقم ۳۶۶۷۹، نسبہ الی ابن عساکر و رجالہ ثقات، اسد الغابہ ۳/ ۳۱۶ سیر اعلام النبلاء ۱/ ۷۹]

ایک مرتبہ سیدنا عبدالرحمٰن رضی اللہ عنہ سیدہ ام سلمہ سلام اللہ علیہا کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ عرض کی: ''ام المومنین! مجھے خوف ہے کہ میں ہلاک نہ ہو جاؤں کیوں کہ میں قریش کا سب سے زیادہ مال دار شخص ہوں۔ میں نے ایک قطعہ اراضی چالیس ہزار دینار میں فروخت کیا ہے۔ ام المومنین سیدہ ام سلمہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا: بیٹا! راہ خدا میں اپنے مال کو صرف کرو میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ میرے اصحاب میں سے بعض ایسے ہیں کہ مفارقت کے بعد انہیں میرا دیدار نصیب نہ ہوگا۔ فرماتے ہیں کہ میں سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کے پاس آیا اور انہیں یہ بتایا۔ چنانچہ وہ سیدہؓ کے پاس گئے اور عرض کی:

''کیا میں بھی ان میں سے ہوں؟ سیدہ نے جواب دیا! ''بالکل نہیں، میں آپ کے بعد کسی کو بری نہیں کرتی۔''

[الاستیعاب ۶/ ۷۹۔ ۸۰، مسند احمد ۶/ ۳۱۷، ۲۹۸، ۳۱۲ و رجالہ ثقات]

عروہ بیان کرتے ہیں کہ سیدنا عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ نے پچاس ہزار دینار اللہ کے راستہ میں خرچ کرنے کی وصیت فرمائی اور ہر ایک آدمی کو ایک ایک ہزار دینار دیئے گئے۔

اور زہری فرماتے ہیں کہ سیدنا عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ نے اصحاب بدر کے لئے وصیت فرمائی اس وقت سو بدری صحابی مدینہ میں موجود تھے جن میں سے ہر ایک کو چار چار سو دینار ملے سیدنا عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ بھی ان میں سے ایک تھے۔

[سیر اعلام النبلاء ۱/ ۹۰، اسد الغابہ ۳/ ۳۱۷]

ازواج مطہرات کی خدمت کو وہ اپنا سرمایہ زندگی سمجھتے تھے۔ چنانچہ ازواج

مطہرات کے لیے ایک باغ کی وصیت فرمائی جو چار لاکھ میں فروخت کیا گیا۔
[مستدرک حاکم ۳/۳۱۱۔۳۱۲، وقال صحیح علی شرط مسلم وافقہ الذھبی، ترمذی رقم ۳۷۵۰]

امام ذہبیؒ نے حافظ ابن عبدالبرؒ کا قول نقل کیا ہے کہ سیدنا عبدالرحمٰن رضی اللہ عنہ تجارت میں بڑے خوش قسمت انسان تھے۔ اور وفات کے وقت انہوں نے ایک ہزار اونٹ، تین ہزار بکریاں اور ایک سو گھوڑے ترکہ میں چھوڑے۔ [سیر اعلام النبلاء ۱/۹۲]

زندگی میں تین ہزار غلام آزاد کیے۔ [حلیۃ الاولیاء لابی نعیم ۱/۹۹]

زندگی میں اتنا اللہ کی راہ میں تقسیم کیا لیکن پھر بھی وافر دولت چھوڑ گئے۔ ان کی چاروں بیویوں نے جن کو ترکہ میں صرف آٹھواں حصہ ملا تھا، اسی اسی ہزار دینار پائے بلکہ امام ذہبیؒ نے لکھا ہے کہ ہر بیوی نے ایک ایک لاکھ دینار پایا۔ [سیر اعلام النبلاء ۱/۸۹۔۹۱]

لکھا ہے کہ سونے کی اینٹیں اتنی بڑی تھیں کہ کلہاڑی سے کاٹ کاٹ کر تقسیم کی گئیں اور کاٹنے والوں کے ہاتھوں پر چھالے پڑ گئے۔ اور غیر منقولہ جائداد بھی بہت چھوڑی۔ [اسد الغابہ ۳/۳۱۷]

مطامح دنیا کی اصل علت

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے جو واقعات سطور بالا میں ذکر کئے گئے ہیں یہ ظاہری نگاہ میں نہایت عجیب وغریب نظر آتے ہیں کیونکہ موجودہ دور میں اور اس سے پہلے بھی جس قدر لوگ غریبوں کی حمایت میں اٹھے انہوں نے لوگوں (یعنی طبقہ امراء) سے دولت چھین چھین کر غریبوں کو تو نہیں دی البتہ ان چند لوگوں کے حوالے کی جنہوں نے بعد میں بہت بڑے سرمایہ دار کی شکل اختیار کر لی۔ لیکن صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے اپنی مرضی اور خوشی اور کسی کے دکھلاوے کے لیے نہیں بلکہ اللہ کی رضا کے لئے اپنی دولت دونوں ہاتھوں سے غرباء اور مساکین میں تقسیم کی اور دولت کے احتکار و اکتناز کے بجائے اس کو پوری سوسائٹی میں منتشر کیا اور دولت کی گردش سے سوسائٹی میں خوش حالی آئی اور اب کوئی خیرات وزکوٰۃ لینے والا نہیں ملتا تھا۔ دولت کی فراوانی تو آج بھی بہت ہے لیکن یہ چند ہاتھوں میں آ کر رک گئی

ہے، پھر اتنی دولت ہونے کے باوجود ابھی بھی ان کے دلوں میں سیری کے جذبات نہیں پیدا ہوئے اور آج بھی اگر کوئی اعلان کر دے کہ میں نے اپنی زکوٰۃ تقسیم کرنی ہے تو آپ دیکھیں گے کہ بڑے بڑے سرمایہ دار جو زکواۃ کے قطعاً مستحق نہیں ہیں وہ بھی زکوٰۃ لینے والوں کی قطار میں جا کر کھڑے ہو جائیں گے۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ دولت کی ہوس کا جذبہ اپنے پورے شباب پر ہے اور اتنی دولت ہونے کے باوجود بھی دلوں میں سیری پیدا نہیں ہوئی۔ حکیم الامت تھانوی قدس سرہ کا ملفوظ ہے فرماتے ہیں کہ دولت کی ہوس سمندر کا پانی پینے کے مترادف ہے۔ سمندر کا پانی نمکین ہوتا ہے جتنا پیو اتنی ہی زیادہ پیاس لگتی ہے۔ پیاس ختم نہیں ہوتی۔ اسی طرح جن دلوں میں حب دنیا کا جذبہ اٹکھیلیاں لیتا ہے، ان کے پاس جتنا بھی مال آجائے وہ کم ہوتا ہے۔ ان کی سیری نہیں ہوتی۔ وجہ یہی ہے کہ دلوں کی دنیا سنوری نہیں۔ وہ اپنے مالوں میں صرف اپنا حق سمجھتے ہیں، غرباء، اور مساکین کا حق نہیں سمجھتے اور قرآن کہتا ہے:

''جو لوگ رات کو بہت کم سوئیں، اوقات سحر میں اپنے گناہوں کی معافی مانگتے رہیں، جن کے مالوں میں سائل کا بھی حق ہو اور اس کا بھی جو محروم ہے (مگر سوال نہیں کرتا) [ذاریات:۱۷۔۱۹]

ایک اور مقام پر فرمایا:

''جو یتیم مسکین اور قیدی کو کھانا کھلاتے ہیں ایسی حالت میں کہ جب کھانا خود ان کو محبوب ہو۔ (وہ خود ضرورت مند ہوں اور نیت یہ ہو کہ) ہم صرف اللہ کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے کھانا کھلاتے ہیں۔ تم سے (بھوکوں اور ضرورت مندوں سے) نہ اس کا کوئی بدلہ چاہتے ہیں اور نہ شکریہ'' [الدھر:۹]

یہاں یہ بات ذہن میں رہنے کہ بخل اور سخاوت فطرت انسانی کی دو خصلتیں اور دو وصف ہیں۔ ان کی کچھ خصوصیات اور کچھ لوازم و تاثیرات ہیں۔ بخل کے لیے حرص، طمع، تنگ نظری، خود غرضی، بزدلی، بے رحمی اور سنگ دلی لازمی صفات ہیں، جن کے نتیجہ میں

ذخیرہ اندوزی، چور بازاری، رشوت، خیانت اور سود وقمار جیسے زہریلے اور انسانیت کش جراثیم پیدا ہوتے ہیں جو عوام کی خوش حالی اور انسانیت کو ڈستے ہیں اور ان میں بے اطمینانی اور پریشان حالی کا زہر پھیلا دیتے ہیں۔ بخل کے مقابلہ میں سخاوت اور فیاضی ہے جو دل کی بہادری اور حوصلہ کی بلندی چاہتی ہے۔ طبیعت میں بے نیازی پیدا کرتی ہے۔ دوسروں کی ضرورتوں کا احساس انکی ضرورت کو اپنی ضرورت پر مقدم رکھنا سخاوت اور جود وکرم کی اصل روح ہے۔ یہ روح جب کارفرما ہوتی ہے تو ہمدردی، غم خواری، رحم اور خدمت خلق کے جوہر جلوہ گر ہوتے ہیں یعنی انسانیت کا جوبن نکھرتا ہے، شرافت کا جھنڈا بلند ہوتا ہے، میل ملاپ اور محبت کی فضا ہموار ہوتی ہے۔ سخاوت اگر کارفرما ہو تو طبقاتی جنگ کی نوبت ہی نہیں آتی کیونکہ دولت مند طبقہ غرباء اور مساکین کا ہم درد وغم گسار ہوتا ہے اور غریب و نادار اس کے وفادار اور جاں نثار ہوتے ہیں اور اسی طرح ایک ایسا نظم وضبط قائم ہو جاتا ہے جو فطرت انسانی کے عین مطابق ہوتا ہے۔ جو معاشرہ اور سماج کو اطمینان کی دولت بخشتا ہے جس سے ایک دوسرے سے نفرت اور بغض نہیں بلکہ محبت اور باہمی اعتماد کی نعمت میسر آتی ہے اور جب محبت اور اعتماد کے تعاون کی کلیاں چٹکتی ہیں تو معاشرہ اور سماج رواداری اور شریفانہ اخلاق کا گلدستہ بن جاتا ہے۔ اسلام ہمیں آگاہ کرتا ہے کہ جس طرح بخل کے نتائج یعنی ذخیرہ اندوزی افراط زر کی ہوس اور سود وغیرہ انسانوں کی خوش حالی کو ڈستے ہیں تو اس کا اثر یہی ہوگا کہ وہ سرمایہ جو بخل کا معمل ہے، خود ایک اژدہا بن جائے گا جو صاحب دولت کے گلے کا طوق بن کر اس کی باچھیں پکڑے گا اور کہے گا میں ہوں تیرا مال، میں ہوں تیری دولت، دولت کے سمٹاؤ کا اصل محرک یہ ہے کہ آدمی زندگی کی کامیابی اسی کو سمجھتا ہے اس کے پاس کوٹھی، جائداد اور بنک بیلنس ہو۔ اپنی قوتوں اور صلاحیتوں کا کوئی مصرف اس کے سوا اسے معلوم نہیں کہ دنیا کی لذتیں حاصل کرنے میں اسے لگایا جائے۔ اس ذہنیت کا نتیجہ یہ ہے کہ جب ایک مرتبہ کچھ لوگوں کے پاس سرمایہ اکٹھا ہو جاتا ہے تو اس کے خرچ کرنے کو وہ نقصان کا باعث سمجھتا ہے۔ اس کے نزدیک فائدہ کی صورت صرف یہ ہے کہ سرمایہ کو مزید سرمایہ اکٹھا کرنے کا ذریعہ بنائے۔ اس طرح سے تقسیم دولت کا توازن بگڑ جاتا ہے اور

دولت کی گردش رک جاتی ہے۔ جو محروم رہ جاتا ہے وہ دن بدن اور زیادہ محروم ہوتا چلا جاتا ہے۔ اور جو خوش حال ہوتا ہے وہ اور زیادہ خوش حال ہوتا چلا جاتا ہے یہاں تک کہ کچھ لوگوں کے پاس تو بے حساب دولت اکٹھی ہو جاتی ہے اور اکثر و بیشتر آبادی کا یہ حال ہوتا ہے کہ وہ زندگی کی معمولی ضروریات بھی فراہم نہیں کر سکتی۔

دولت کے سمٹاؤ کو صرف یہ نظریہ روک سکتا ہے کہ آدمی اس دنیا کے بعد آنے والی زندگی پر یقین کرے اور اس احساس کے ساتھ زندگی گزارے کہ یہ دنیا اکٹھا کرنے کی جگہ نہیں ہے بلکہ آخرت کے لیے خرچ کرنے کی جگہ ہے۔ اسلامی تاریخ اس قسم کی بے شمار مثالوں سے بھری ہوئی ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ جن ملکوں میں اسلامی نظام قائم ہوا وہاں سے غریبی کا نام و نشان مٹ گیا یا کم از کم غریبی کا احساس ختم ہو گیا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا تجارت کی طرف شغف

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے تجارتی شغف کو دیکھ کر ہی صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو تجارت کا شوق پیدا ہوا تھا۔ ویسے بھی مکہ کے لوگ اکثر تجارتی ذہن کے تھے کیونکہ مکہ ایک وادی غیر ذی زرع تھا۔ تمام زمین پتھریلی اور ناقابل زراعت تھی۔ اس وجہ سے آپ کے آباؤ اجداد بھی تجارت ہی کرتے رہے۔ کتابوں میں لکھا ہے کہ سیدنا اسماعیل علیہ السلام کی اولاد میں بیس پشت کے بعد ایک شخص نضر پیدا ہوا۔ زرقانی نے لکھا ہے کہ اس کا اصل نام تو قیس تھا۔ نضر اس لئے کہتے تھے کہ وہ بڑے حسین وجمیل تھے۔ اور نضر ''نضارة'' سے مشتق ہے اس کے معنی رونق اور تر و تازگی کے ہیں۔ [زرقانی علی المواہب ۱/۷۷]

نضر کے والد کا نام کنانہ تھا۔ ان کے علم و فضل کی وجہ سے دور دراز کے لوگ ان کی زیارت کے لیے آیا کرتے تھے۔ انہی کنانہ کے بارہ میں ایک حدیث میں ارشاد فرمایا گیا ہے۔

''اللہ تعالیٰ نے اولاد اسماعیل میں سے کنانہ کو اور کنانہ سے قریش کو
اور قریش سے بنو ہاشم کو اور بنو ہاشم میں سے مجھ کو برگزیدہ

کیا۔" [البدایہ والنہایہ ۲/۳۵۶]

قصی:

نضر بن کنانہ کی آٹھویں پشت میں ایک شخص پیدا ہوا جس کا نام قصی تھا۔ یہ قصی عربی نام تھا اصل نام ان کا زید تھا۔ باپ کا نام کلاب اور ماں کا نام فاطمہ بنت سعد۔ قوم نے قصی کو "مجمع" کا خطاب دیا تھا کیونکہ انہوں نے قریش کے متفرق اور پراگندہ قبائل کو مکہ مکرمہ میں جمع کر دیا تھا۔ اور اس اتحاد و اتفاق کے ذریعہ ان میں ایک قوت پیدا کی۔

[زرقانی ۱/۷۳]

چنانچہ خذافہ بن غانم عدوی نے ایک مرتبہ ابوجہل کو مخاطب کر کے کہا تھا

ابو کم قصی کان یدعی مجمعاً بہ جمع اللہ القبائل من فھر

[طبقات ابن سعد ۱/۴۰، سبل الھدیٰ والرشاد ۱/۳۲۴]

بنو اسماعیل کی اولاد کو قصی کے ذریعہ کئی ہزار سال کے بعد مکہ پر سیاسی اقتدار حاصل ہوا۔ قصی نہایت زیرک اور دانش مند شخص تھا۔ اس وجہ سے بنو خزاعہ کے ساتھ ایک جنگ میں قصی کو بازنطینی بادشاہ (قیصر روم) کی حمایت حاصل تھی۔ [المعارف لابن قتیبہ ص ۲۱۵]

قصی نے نہ صرف بیرونی دنیا میں اپنے سیاسی روابط قائم کیے بلکہ اندرون مکہ بھی نہایت پلاننگ سے کام کیا اور نہایت اچھے طریقہ سے مکہ شہر کو آباد کیا کہ بیت اللہ جو پہلے شہر سے دور تھا اب شہر کے درمیان آ گیا۔ قصی نے کعبہ کے سامنے اپنا ایک مکان بنوایا جس کا صدر دروازہ کعبہ کی طرف رکھا گیا۔ اس کو آپ نے قومی کاموں کے لئے عام کر دیا۔ اور اس کا نام "دارالندوہ" رکھا۔ [تاریخ مکہ، احمد السباعی ص ۱۶]

یہ دارالندوہ ایک وسیع و عریض عمارت تھی جس کا دروازہ حرم میں کھلتا تھا۔ اس میں ہر تقریب پر اہل مکہ کے نمائندے اکٹھے ہوتے اور باہمی مشورہ سے مختلف مسائل کا حل تلاش کرتے اور پیش آمدہ معاشرتی، معاشی، سیاسی اور عمرانی مسائل پر گفتگو کرتے۔

قصی ایک تجارت پیشہ شخص تھا۔ تجارت کی وجہ سے انہوں نے ڈھیروں دولت

کمائی اور پھر اپنی قوم کی فلاح و بہبود پر بھی خرچ کی۔ اسی دارالندوہ کی وجہ سے انہوں نے پورے شہر میں ایک مرکزی نظام قائم کیا۔ دارالندوہ میں وہی لوگ شریک ہو سکتے تھے جن کی عمر کم از کم چالیس سال ہوتی تھی۔ لیکن قصی کی اولاد اس شرط سے مستثنیٰ تھی۔ بعد میں اس استثناء میں توسیع کی گئی۔ چنانچہ ابوجہل اپنی جودت رائے کی وجہ سے تیس (۳۰) سال کی عمر ہی میں اس کا رکن بن گیا۔ [کتاب الاشتقاق ص ۹۷]

اسی طرح حکیم بن حزام رضی اللہ عنہ کو پندرہ بیس سال کی عمر میں یہ عزت حاصل ہوگئی۔

قصی کی اولاد:

قصی کے چار لڑکے تھے۔ عبدالدار، عبد مناف، عبدالعزی اور عبدالقصی اور دو لڑکیاں تھیں۔ [طبقات ابن سعد ۱/۳۹]

قصی کے چاروں لڑکے تجارت پیشہ تھے۔ اگرچہ قصی کا دوسرا لڑکا عبد مناف عقل وخرد اور اصابت رائے میں خاص امتیاز رکھتا تھا لیکن مذہبی اور سیاسی اختیارات قصی کے بعد اس کے سب سے بڑے لڑکے عبدالدار اور اس کی اولاد کے ہاتھ میں تھے، حالانکہ عبدالدار اور اس کی اولاد کو عبد مناف اور اس کی اولاد کے ساتھ فرزانگی اور سیاست وغیرہ میں کوئی نسبت نہ تھی۔ قصی کی موت کے بعد اشراف قریش عبد مناف کو پسند کرتے تھے اس وجہ سے تولیت کعبہ عبدالدار اور اس کی اولاد کے ہاتھوں میں دیکھنا چاہتے تھے۔ چنانچہ عبد مناف کی رحلت کے بعد عبدالدار کی اولاد سے اشراف نے تولیت چھین لینے کا قصد کیا، چنانچہ ان دونوں خاندانوں میں ایک نزاع اور کشیدگی کی صورت حال پیدا ہوگئی، لیکن قبیلہ قریش کے اشراف نے فریقین کے مابین یہ فیصلہ کیا کہ عبد مناف کی اولاد سقایہ (حاجیوں کو پانی پلانے کا انتظام) اور رفادہ (حاجیوں کی مہمان داری کا اہتمام) کی متولی رہے اور عبدالدار کی اولاد کو مجاورت اور لوائے عرب کی خدمات سپرد کر دی جائیں۔ [ابن خلدون ۲/۶۸۹]

عبد مناف اپنی غیر معمولی سخاوت، ذہانت، سیاسی بصیرت اور معاملہ فہمی کے باعث اپنے والد کے بعد اپنی قوم کے سردار مقرر ہوئے۔ امام شافعیؒ نے عبد مناف کا نام

مغیرہ بتایا ہے، اور لکھا ہے کہ یہ نہایت حسین وجمیل تھے۔ اس وجہ سے لوگ انہیں ''قمر البطحاء'' بھی کہتے تھے جس کا مطلب ہے۔ ''سنگستان مکہ کا چاند''۔ [زرقانی ۱/۳/۷، الروض الانف ۱/۶]

عبد مناف کے چار بیٹے تھے۔ ان چاروں نے تجارت کو اپنا پیشہ بنایا۔ شام کے غسانی بادشاہ سے ہاشم نے، حبش کے بادشاہ سے عبد شمس نے، یمنی امراء یعنی شاہان حمیر سے مطلب نے اور عراق اور فارس کی حکومتوں سے نوفل نے تجارتی مراعات اور سفر میں حفاظت کے پروانے حاصل کیے۔ اسی وجہ سے چاروں بھائی متجرین (تجارت پیشہ) کے نام سے مشہور ہو گئے۔ ابن سعد کا بیان ہے کہ قیصر روم کے ہاں ہاشم کو ایک خاص اعزاز حاصل تھا۔ وہ تجارت کے سلسلہ میں انقرہ تک جاتے تھے۔

ابن ہشام نے عبد مناف کے چاروں بیٹوں کے نام یہ لکھے ہیں:

(۱) ہاشم (۲) عبد شمس (۳) مطلب (۴) نوفل

عبد مناف کے یہ چاروں صاحبزادے بھی اپنے باپ کی طرح بڑے بلند اقبال تھے۔ قریش ان کی وجہ سے اندرون ملک اور بیرون ملک دونوں جگہ معزز سمجھے جاتے تھے۔ عرب وحجاز کے علاوہ بڑے بڑے سلاطین کے ہاں بھی ان کو بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا اور ان کی وجہ سے قریش کا پورا قبیلہ باعزت سمجھا جاتا تھا۔ یہ عجیب اتفاق ہے کہ ان چاروں بھائیوں کی مختلف ملکوں میں ہاشم کی غزہ (شام) میں، عبد شمس کی مکہ میں، نوفل کی عراق میں اور مطلب کی یمن میں قبریں ہیں یہ تجارت کے سلسلہ میں باہر گئے اور وہیں انتقال کر گئے۔ [انسان العیون ۱/۵]

ہاشم بن عبد مناف:

ہاشم کا اصل نام عمرو یا عمر تھا اور ہاشم ان کا خطاب تھا۔ اس خطاب کی وجہ یہ تھی کہ ایک مرتبہ مکہ مکرمہ میں قحط پڑا۔ لوگ غلہ کے دانہ دانہ کو ترسنے لگے۔ اس حالت کو دیکھ کر ہاشم شام گئے اور وہاں سے سینکڑوں من ''کیک'' بوروں میں بھر کر لے آئے اور جن اونٹوں پر وہ لائے تھے ان کو ذبح کر کے ان کا قورمہ بنوایا اور پھر وہ کیک اس قورما میں ڈال کر اس کا ثرید

بنوایا اور اہل مکہ کو بڑے افراط سے کھلایا۔ اس وقت انکا خطاب ہاشم پڑ گیا کیونکہ ''ہشم'' کا مطلب ہے چورہ کرنا اور ہاشم اس سے اسم فاعل یعنی روٹیوں کو چورہ کر کے کھلانے والا۔ اہل تاریخ اس بات پر متفق ہیں کہ بنو عبد مناف قریش میں، سارے عرب میں، بلکہ آس پاس کے ممالک عراق، یمن اور شام کے سلاطین کے درباروں میں بھی نہایت شریف ومعزز اور بڑے بلند مراتب واعزازت کے مالک سمجھے جاتے تھے۔ خصوصا ہاشم بن مناف کی شرافت ضرب المثل تھی۔ ان کا لقب اہل عرب نے ''سید البطحا'' رکھا تھا یعنی کل مکہ اور تہامہ کا سردار اور سید۔

ہاشم کے پاس سقایہ اور رفادہ سب سے اہم شعبے تھے لیکن ان کے لیے مال ودولت کی ضرورت تھی اور محنت ومشقت کی بھی۔ یہ اگر چہ عبد مناف کے چاروں بیٹوں کے سپرد ہوئے تھے لیکن ان میں پیش پیش ہاشم رہے کیونکہ یہ سب بھائیوں میں سب سے زیادہ بلند حوصلہ، صاحب الرائے، اور باسلیقہ آدمی تھے۔

ہاشم کا ذریعہ آمدنی تجارت تھا، بازنطینی حکومت کیبادشاہ ہرقل سے ان کے تعلقات بہت اچھے تھے۔ چنانچہ ایک مرتبہ ہرقل نے ہاشم کو خط لکھا کہ مجھ کو آپ کے جود وسخا کی اطلاع پہنچی ہے۔ میں اپنی شہزادی کو جو حسن وجمال میں یگانہ روزگار ہے، آپ کے حبالہ عقد میں دینا چاہتا ہوں۔ آپ یہاں تشریف لائیں تاکہ میں آپ سے شہزادی کا نکاح کر دوں، لیکن ہاشم نے ہرقل کی اس پیش کش کو ٹھکرا دیا۔ [زرقانی ۱/۷۲]

جناب ہاشم نے نہ صرف حاجیوں کے آرام وآسائش کا انتظام کیا بلکہ تاریخ کے صفحات اس بات کی گواہی دیتے ہیں کہ انہوں نے قریش کی ترقی اور ان کی ہر قسم کی سہولتوں کی طرف بھی خاص توجہ کی۔ چنانچہ انہوں نے شام، روم اور غسان کے بادشاہوں سے اپنی قوم کے تجارتی امن وامان کے حصول کے فرامین حاصل کیے۔ ہاشم ہی نے سب سے پہلے قریش میں یہ دستور رائج کیا کہ سال میں دو مرتبہ تجارت کے لیے قافلے روانہ ہوا کریں۔ موسم گرما میں شام کی طرف اور موسم سرما میں یمن کی طرف۔ چنانچہ اسی دستور

کے مطابق ہر موسم میں قافلہ روانہ ہوتا۔لق ودق بیابانوں اور خشک ریگستانوں اور بحر و بر کو قطع کرتا ہوا موسم سرما میں یمن اور حبشہ تک جاتا اور موسم گرما میں شام، غزہ اور انقرہ (انگورہ جو اس وقت قیصر روم کا پایہ تخت تھا) تک پہنچتا۔ان ملکوں کے بادشاہ ہاشم کا بہت احترام کرتے اور قریش کے ان قافلوں کا اعزاز کرتے جو تجارت کے لیے وہاں جاتے۔

[طبقات ابن سعد ۱/۴۳]

ہاشم بن عبد مناف قریش کے پہلے رئیس اور سردار ہیں جنہوں نے ہمسایہ قوموں اور ملکوں سے تجارتی معاہدے کیے۔ چنانچہ قیصر روم کے ہاں ان کا بڑا احترام کیا جاتا تھا۔ مؤرخین نے لکھا ہے کہ ہاشم نے شام کا سفر کیا اور قیصر روم کے ہاں مہمان ہوئے۔انہوں نے قیصر سے گفتگو کی۔ قیصر ان کی گفتگو سے بہت متاثر ہوا۔ چنانچہ وہ گاہے گاہے آپ کو اپنے ہاں بلانے لگا۔ایک روز ہاشم نے قیصر سے کہا:۔

> ''اے بادشاہ! میری قوم کے لوگ تجارت پیشہ ہیں آپ انہیں ایک فرمان شاہی جاری کر دیں جو انہیں تجارتی امن عطا کر دے تاکہ وہ حجاز کا کپڑا اور چمڑا آپ کے ملک میں برآمد کر سکیں۔ہاشم کی یہ درخواست قبول ہوگئی۔ ہاشم وہاں سے واپسی کے لیے روانہ ہوئے تو جس جس قوم یا قبیلہ کے پاس سے گزرتے گئے، ان کے سرداروں سے معاہدہ ایلاف (معاہدہ امن) حاصل کیا۔'' [تاریخ یعقوبی ۱/۲۰۱]

ہاشم کی وفات کے بعد ان کے تینوں بھائیوں نے عبد شمس، مطلب اور نوفل نے نہ صرف قیصر سے معاہدہ امن کی تجدید کرائی بلکہ دوسرے ہمسایہ بادشاہوں سے بھی امن کے معاہدات حاصل کیے۔ یعقوبی کے بیان کے مطابق عبد شمس نے حبشہ کے بادشاہ نجاشی سے، مطلب نے یمنی سرداروں سے اور نوفل نے ایران کے بادشاہ کسریٰ سے امن معاہدات حاصل کیے۔[یعقوبی ۱/۲۰۱]

ہاشم نے اپنی زندگی کے اکثر اوقات سفر میں گزارے۔ایک مرتبہ شام جا رہے

تھے کہ راستہ میں یثرب (مدینہ منورہ) میں قیام ہوا۔ وہاں ایک میلہ میں ایک عورت کو دیکھا جو اپنی دکان پر بیٹھی نہایت سلیقہ اور ہوشیاری سے اسے چلا رہی تھی۔ شکل وصورت میں چودھویں کا چاند، جو دیکھے بس اسی کا ہو کر رہ جائے۔ ہاشم بھی اس کی سلیقہ مندی اور سمجھ داری سے بہت متاثر ہوئے۔ کیونکہ شرافت ونجابت اور فہم وفراست اس کے چہرہ سے ٹپک رہی تھی۔ دریافت کرنے پر پتہ چلا کہ بنو بخار کی خاتون سلمٰی بنت عمرو بن زید ہے۔ شوہر کا نام احیحہ تھا لیکن اس سے تعلقات ختم ہو چکے ہیں۔ دولڑکے عمرو اور معبد ہیں جن کے سہارے اپنی زندگی گزار رہی ہے۔ اب اگر کوئی شخص نکاح کا پیغام بھیجتا ہے تو یہ شرط لگاتی ہے کہ طلاق کا اختیار اس کے ہاتھ میں ہوگا، یعنی وہ جب چاہے گی جدا ہو جائے گی۔ ہاشم پہلے ہی اس کو دل دے بیٹھے تھے لہٰذا اپنے نکاح کا پیغام بھیج دیا۔ سلمٰی نے ہاشم بن عبد مناف کا نام پہلے ہی سن رکھا تھا اور وہ یہ بھی جانتی تھی کہ وہ مکہ کا بے تاج بادشاہ ہے اور سارے عرب میں اسکا طوطی بول رہا ہے۔ چنانچہ اس نے یہ پیغام قبول کرلیا اور نکاح ہو گیا۔ نکاح کے بعد ہاشم نے بڑی پُر تکلف دعوت کی جس میں تمام قافلہ والوں کے علاوہ خزرج کے لوگ بھی مدعو ہوئے۔ کچھ عرصہ مدینہ میں قیام کر کے ہاشم شام چلے گئے اور سلمٰی امید سے ہوگئی۔ ہاشم کا اسی سفر میں انتقال ہو گیا اور وہ وہیں غزہ میں دفن ہوئے، لیکن ادھر سلمٰی کے ہاں ایک لڑکا پیدا ہوا۔ پیدا ہوتے وقت سر میں ایک سفید بال تھا اس وجہ سے ''شیبۃ الحمد'' نام رکھا گیا۔

[طبقات ابن سعد ۱/۴۶]

خواجہ عبد المطلب

ہاشم نے اپنے بھائی کو یہ وصیت کی تھی کہ اس کی اولاد کی نگرانی کرے۔ مطلب نے اپنے بھائی کی وصیت کا پورا پورا خیال رکھا۔ اسی وجہ سے ہاشم اور مطلب کی اولاد میں بھی اتحاد رہا۔ مطلب بھی نہایت اعلیٰ قابلیت کے حامل تھے لہٰذا وہ ہاشم کی وفات کے بعد ان کی خدمات کو بخوبی انجام دیتے رہے مؤرخین نے ان کے بارہ میں لکھا ہے کہ:۔

''مطلب نہایت صاحب فضیلت وشرافت بزرگ تھے۔ قریش ان

کی سخاوت وسماحت کے باعث انہیں ''فضیلت مجسم'' کا نام دیتے ہیں۔'' [ابن خلدون ۱/۱۴، سیرۃ ابن ہشام ۱/۱۳۷]

شیبۃ الحمد (عبدالمطلب) ابھی چند برس کے تھے کہ ہاشم کا غزہ کے مقام پر انتقال ہو گیا اور شیبۃ یتیم ہو گئے۔ آپ اس وقت یثرب میں اپنے ننھیال میں تھے۔ لہٰذا انہوں نے اپنے ماموں کے زیر کفالت پرورش پائی۔ انہوں نے نہایت شفقت ومحبت سے یتیم بھانجے کی پرورش کی اور اسے ایک لمحہ بھی یتیمی کا احساس نہ ہونے دیا۔

بعض روایات میں ہے کہ ایک مرتبہ بنوحرث بن عبد مناف کا ایک شخص یثرب سے گزرا۔ اس نے وہاں چند کم سن بچوں کو نشانہ بازی کرتے دیکھا۔ اس نے دیکھا کہ ایک بچہ جب اس کا تیر نشانے پر لگتا تو وہ فخر اور مسرت کے ملے جلے جذبات کے ساتھ یہ نعرہ لگاتا ہے:

انا ابن هاشم، انا ابن سید البطحاء

میں ہاشم کا بیٹا ہوں اور سید البطحاء کا فرزند ہوں

جب وہ شخص مکہ واپس آیا وہ مطلب کے پاس گیا اور اس سے یہ سارا واقعہ کہہ سنایا اور ساتھ ہی اسے یہ کہا کہ یہ کوئی مناسب بات نہیں کہ ہاشم جیسے شخص کا بیٹا غریب الوطنی کی زندگی گزار دے۔ لہٰذا اسے اس کے ننھیال سے واپس بلاؤ، تاکہ وہ اپنے خاندان میں پل کر جوان ہو۔ مطلب نے وعدہ کیا وہ جلد از جلد یثرب جا کر اپنے بھتیجے کو واپس لائے گا۔

شیبہ کی عمر سات آٹھ سال کی ہوئی تو اس کے چچا مطلب نے مدینہ آ کر شیبہ کو مکہ مکرمہ لے جانا چاہا۔ اولاً ماں اور ماموں راضی نہ ہوئے بلکہ سختی سے انکار کیا لیکن جب مطلب نے ان کو سمجھایا کہ مدینہ میں اس بچہ کی زندگی خراب ہوگی۔ مکہ میں اس خاندان کی بڑی عزت وتکریم کی جاتی ہے۔ ہاشم کے دوست احباب اور قدردان بھی ابھی موجود ہیں، اس لیے وہاں شیبہ کو ترقی کا بہت موقع ملے گا۔ یہ بات ان کے کوزہ ذہن میں آ گئی اور وہ شیبہ کو مکہ بھیجنے کے لئے رضامند ہو گئے۔ چنانچہ مطلب اپنے یتیم بھتیجے کو اونٹ پر اپنے پیچھے

بٹھا کر مکہ مکرمہ لے آئے بعض روایات میں ہے کہ مطلب جس وقت مکہ کے قریب پہنچے تو مطلب کے ایک جاننے والے نے مطلب سے پوچھا کہ تمہارے پیچھے کون بیٹھا ہوا ہے۔ اس وقت شیبہ کے کپڑے پھٹے پرانے تھے، اس وجہ سے مطلب کو شرم محسوس ہوئی کہ وہ اپنے جاننے والے کو یہ کہے کہ یہ میرا بھتیجا ہے۔ چنانچہ انہوں نے جواب میں کہا: ''عبد المطلب'' یعنی مطلب کا غلام۔ اس روز سے شیبہ کا نام عبد المطلب پڑ گیا۔ [طبری ۹/۲]

مطلب ہاشم کے بڑے بھائی تھے۔ کچھ عرصہ کے بعد مطلب تجارتی سفر کے سلسلہ میں یمن گئے اور ایسے گئے کہ واپس نہ آئے۔ اور اسی علاقہ میں ''روان'' کے مقام پر ان کا انتقال ہو گیا۔ مطلب کی وفات کے بعد بنو ہاشم کی قیادت وسیادت اس کے بھتیجے عبد المطلب کے ہاتھ میں منتقل ہو گئی۔

عبد المطلب صحیح معنوں میں اپنے باپ ہاشم کے جانشین تھے۔ باپ کی ساری خوبیاں اور اوصاف بلکہ ان سے کچھ زیادہ ہی اللہ تعالیٰ نے ودیعت فرمائے تھے۔ زائرین بیت اللہ کی خدمت، بے کسوں اور مظلوموں کی امداد اور دادرسی، قومی ہمدردی، فیاضی، جود وسخا، مقبولیت عامہ، شہرت وناموری اور داد ودہش غرضیکہ کون سی خوبی تھی جو اللہ تعالیٰ نے ان میں نہ رکھی تھی۔ لوگ ان کی تعریف میں ہر وقت رطب اللسان رہتے اور ان کو ''شیبۃ الحمد'' کے نام سے پکارتے۔ ابن خلدون نے ان کے بارہ میں لکھا ہے کہ:

> ''عبد المطلب نے حاجیوں کے لیے سقایت ورفادت کی خدمت کو اس حالت سے زیادہ احسن طور پر قائم کیا جو مکہ مکرمہ میں ان سے پیشتر ان کی قوم کرتی تھی اور وہ حمیر خاندان کے ملوک یمن اور ملوک حبشہ میں باریاب بھی تھے۔'' [ابن خلدون ۶۵۸/۲]

خواجہ عبد المطلب کی اولاد

سرور کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حقیقی دادی فاطمہ بنت عمرو بن عائذ بن عمران بن مخزوم تھیں۔ ان سے یہ اولادیں ہوئیں۔ زبیر، ابو طالب، عبد اللہ، ام حکیم البیضاء، عاتکہ، برہ،

امیمہ، عبدالمطلب کی دوسری بیوی ہالہ بنت وہیب تھیں۔ ان سے یہ اولاد ہوئی۔ حمزہ، مقوم، محجل، اور صفیہ، یہ ہالہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی والدہ محترمہ سیدہ آمنہ بنت وہب کی چچازاد بہن تھیں۔ چنانچہ سیدنا حمزہ رضی اللہ عنہ کے نانا وہیب اور سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے نانا وہب دونوں حقیقی بھائی تھے۔ خواجہ عبدالمطلب نے اور بھی شادیاں کیں جن کی تفصیل ہم نے اپنی کتاب ''سیرت خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم'' میں دی ہے۔ [المعارف لابن قتیبہ ص ۵۲]

حضرت عبداللہ کی شادی

خواجہ عبدالمطلب کے چھوٹے بیٹے عبداللہ کی عمر جب اٹھارہ بیس برس کی ہوئی تو اٹھتی ہوئی جوانمردی اس پر تقویٰ و پارسائی کے زیور کی بارش، اس پر حسن و جمال کی رعنائیاں۔ آپ جس گلی اور جس کوچہ سے گزرتے سینکڑوں دوشیزاؤں کے دل سینوں میں مچلنے لگتے اور صدہا مخدرات رات کو چھپ چھپ کر آپ کی ایک جھلک دیکھنے کے لیے بے تاب ہو جاتیں۔ [السیرۃ النبویہ لزینی دحلان ۱/۴۲]

مواہب اللدنیہ کے شارحین کا ایک نہایت اچھا جملہ یہ لکھا ہوا کاغذ کے سینہ پر محفوظ ہے۔

> ''حضرت عبداللہ پورے قبیلہ قریش میں ایک نور تابندہ تھے خوبصورتی میں بے مثال بلکہ کوئی ان کا ثانی نہ تھا۔ قریش کی عورتیں ان کے دام محبت میں اسیر تھیں اور قریب تھا کہ وہ ان کی محبت میں اپنی عقل وخرد اور ہوش وحواس کھو بیٹھتیں۔'' [السیرۃ النبویہ لزینی دحلان ۱/۴۲]

بعض روایات میں ہے کہ یمن کے ایک یہودی عالم نے خواجہ عبدالمطلب کے نتھنوں کو دیکھ کر کہا تھا کہ مبارک ہو۔ ایک نتھنے میں نبوت اور دوسرے میں حکومت۔ اور میں نبوت کو بنوزہرہ کے پیوند میں ضیاء افگن پاتا ہوں۔ تم وطن جا کر بنوزہرہ سے مصاہرت کا تعلق پیدا کرو۔ [زرقانی علی المواہب]

سفر سے واپسی پر خواجہ عبدالمطلب نے بنو زہرہ کی خاتون آمنہ بنت وہب سے اپنے بیٹے عبداللہ کی شادی کر دی۔ سیدہ آمنہ کی والدہ برہ قریش کی ایک نہایت معزز خاتون تھیں۔ سیدنا عبداللہ کی شادی کو ابھی چند ماہ ہی ہوئے تھے اور سیدہ آمنہ کا جمال ابھی جی بھر کر دیکھا بھی نہ تھا کہ سفر آخرت کا وقت آپہنچا۔ شادی کے چند ماہ بعد غالباً سب سے پہلا گرمائی تجارتی قافلہ جو مکہ سے شام کو روانہ ہوا، اس میں آپ اپنے والد ماجد خواجہ عبدالمطلب کے حکم سے شامل ہو گئے۔ اس وقت ان کی اہلیہ امید سے تھیں۔ جب یہ قافلہ شام سے واپس آیا تھا تو جناب عبداللہ راستہ ہی میں بیمار ہو گئے۔ جب یہ قافلہ مدینہ پہنچا تو جناب عبداللہ کی صحت زیادہ مضمحل ہو گئی اور ان میں نقل و حرکت کی طاقت نہ رہی۔ اس لیے آپ اپنے والد کے ننھیال بنو عدی بن النجار میں ٹھہر گئے اور ایک ماہ بیمار رہ کر اس دار فانی سے دار باقی کو انتقال فرما گئے اور دار نابغہ میں مدفون ہوئے۔ اکثر روایات میں ہے کہ انتقال کے وقت ان کی عمر اٹھارہ سال تھی لیکن اور روایات میں ۲۵ سال منقول ہے۔ ترکہ میں جناب عبداللہ نے بکریوں کا ایک گلہ، پانچ اونٹ اور ایک باندی ام ایمن چھوڑی۔

[طبقات ابن سعد ۱/۶۱، زرقانی ۱/۱۰۹]

سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے آباؤ واجداد کے اس تذکرہ سے یہ پتہ چلتا ہے کہ وہ سب تاجر حضرات تھے۔ ان کا ذریعہ معاش تجارت تھی، اور نہ صرف ان کا ذریعہ معاش تجارت تھا بلکہ تمام اہل مکہ کے معاش کا ذریعہ تجارت اور بیوپار تھا کیونکہ وادی غیر ذی زرع ہونے کے ناتے وہاں زراعت نہیں ہو سکتی تھی۔ چنانچہ تمام مہاجرین جو مکہ سے ہجرت کر کے مدینہ طیبہ گئے وہ سب تجارت پیشہ تھے اور انصار مدینہ کی اکثریت زراعت پیشہ تھی۔

قرآن حکیم میں قریش کے تجارتی قافلوں کا ذکر

قرآن حکیم نے بھی قریش کے ان گرمائی اور سرمائی دو تجارتی قافلوں کا ذکر کیا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

﴿لِاِیْلٰفِ قُرَیْشٍ، اٖلٰفِھِمْ رِحْلَةَ الشِّتَآءِ وَالصَّیْفِ،

فَلْيَعْبُدُوْا رَبَّ هٰذَا الْبَيْتِ الَّذِيْۤ اَطْعَمَهُمْ مِّنْ جُوْعٍ وَّ اٰمَنَهُمْ مِّنْ خَوْفٍ﴿ [قریش: ۱۔۴]

''قریش کو رغبت دلانے کے لیے، انہیں سردی اور گرمی کے (تجارتی) سفر سے مانوس کیا پس انہیں چاہیے کہ وہ اس گھر کے رب کی عبادت کریں، جس نے انہیں بھوک میں کھانا کھلایا اور ان کو خوف سے امن میں رکھا۔''

مکہ مکرمہ میں غلہ پیدا نہیں ہوتا تھا اور نہ ہی وہاں باغات تھے کہ وہاں لوگوں کو پھل میسر آئیں چنانچہ سیدنا ابراہیم علی نبینا وعلیہ الصلوۃ والسلام نے دعا فرمائی جس کا ذکر سورۃ ابراہیم میں ہے۔ انہوں نے دعا یہ کی تھی کہ ''اے اللہ! میں اپنی اولاد کو وادی غیر ذی زرع میں تیرے حرمت والے گھر کے پاس بسا کر جا رہا ہوں۔ تو لوگوں کے دلوں کو ان کی طرف مائل فرما دے اور ان کو پھلوں میں سے رزق عطا فرما۔'' سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ اہل مکہ بڑے افلاس اور تکلیف میں رہے یہاں تک کہ رسول اللہ ﷺ کے جد امجد ہاشم نے قریش کو اس پر آمادہ کیا کہ وہ دوسرے ملکوں میں جا کر تجارت کریں۔ موسم گرما میں ملک شام اور موسم سرما میں ملک یمن میں تجارتی سفر کریں کیونکہ بیت اللہ اور حجاج کی خدمت کی بدولت تمام عرب میں یہ لوگ احترام وتقدس کی نظر سے دیکھے جاتے تھے۔ تمام راستے ان کے لئے خطرات سے محفوظ تھے۔

اس لیے قریش یہ کرتے کہ سال میں دو بڑے تجارتی سفر کرتے۔ سردیوں میں یمن جیسے گرم علاقہ کی طرف اور گرمیوں میں شام جیسے ٹھنڈے علاقہ کی طرف سفر کرتے جو سرسبز وشاداب تھا۔ دونوں ملکوں اور دوسرے علاقوں کی راہداری کے محصول ان سے وصول نہ کیے جاتے اور نہ کہیں ان کے مال وجان سے تعرض کیا جاتا بلکہ دل وجان سے لوگ ان کی خدمت کرتے، اور قریش حجاج کی خدمت چونکہ نہایت فیاضی سے کرتے تھے، اس لیے سب ہی ان کے احسان مند اور شکر گزار رہتے۔ بادشاہوں اور امراء سے بھی ان کے اچھے

خاصے مراسم اور روابط قائم ہو گئے تھے، اس طرح ان لوگوں کی تجارت اعلیٰ پیمانے پر پہنچ گئی مختلف ملکوں سے براہ راست انکے ثقافتی اور تہذیبی رشتے استوار ہو گئے۔ شام کے غسانی بادشاہ سے ہاشم نے اور حبش کے بادشاہ عبد شمس نے، یمنی امراء سے مطلب نے اور عراق وفارس کی حکومتوں سے نوفل نے تجارتی مراعات حاصل کر لیں۔ قریش کی سوجھ بوجھ کا معیار بھی اتنا بلند ہوتا چلا گیا کہ عرب کا کوئی دوسرا قبیلہ ان کی ٹکر کا نہ رہا اور مال ودولت کے اعتبار سے بھی وہ عرب میں سب پر فائق ہو گئے۔ اور مکہ عرب کا اہم تجارتی مرکز بن گیا۔

اس سورۃ سے قبل اصحاب الفیل کا ذکر کیا گیا ہے۔ قریش کو تجارتی سفر پر راغب کرنے کے لیے ''اصحاب الفیل'' کو ہلاک کیا گیا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ مکہ مکرمہ غیر زرعی شہر تھا اور مکہ کے سرداراور قائدین سردی اور گرمی میں تجارتی سفر کیا کرتے تھے، اور اسی تجارت پر انکا معاشی انحصار تھا۔ وہ اس تجارت کے ذریعہ اہل مکہ کی ضروریات زندگی خرید کر لاتے تھے اور مکہ کے گردونواح کے لوگ اہل مکہ کی بہت تعظیم کرتے تھے۔ وہ کہتے تھے کہ اہل مکہ بیت اللہ کے پڑوسی اور حرم کے رہنے والے ہیں اور کعبہ کے متولی ہونے کے ناطے اہل اللہ میں سمجھے جاتے تھے۔ اگر ابرہہ کا لشکر کعبہ کو گرادیتا تو ان کی لوگوں کی نگاہوں میں یہ عزت وحرمت جاتی رہتی، اور اہل حبشہ مکہ میں لوٹ مار مچادیتے۔ اور یہ شہر ویران اور کھنڈر ہو جاتا۔ اور چونکہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اسی شہر میں پیدا ہونا تھا اور اسی شہر میں مبعوث ہونا تھا اور سیدنا ابراہیم علیہ السلام نے اسی شہر میں آپ کی بعثت کی دعائیں کی تھیں اس لیے اللہ تعالیٰ نے قریش کے دلوں کو سردی کے موسم میں یمن کے سفر کی طرف مائل کیا اور گرمی کے موسم میں شام کے سفر کی طرف تجارت کے لئے مائل کیا۔

اللہ تعالیٰ نے جب قریش کو حرم میں مامون کر دیا تو ان کو اپنے تجارتی سفر میں بھی کوئی خطرہ نہ رہا۔ وہ امن اور چین کے ساتھ تجارتی سفر کرتے اور شام اور یمن سے غلہ خرید کر لاتے اور اپنی معیشت اور خورد ونوش کا انتظام کرتے۔ اب انہیں اپنے کسی سفر میں بھی ڈر کا یا لوٹ مار کا خطرہ نہ رہا تھا جب کہ دوسرے لوگ جو دور دراز کے شہروں کا سفر کرتے تھے

ان کو بہت سے خطرات پیش آتے تھے۔ چنانچہ ارشاد خداوندی ہے۔

﴿اَوَلَمْ يَرَوْا اَنَّا جَعَلْنَا حَرَمًا اٰمِنًا وَّ يُتَخَطَّفُ النَّاسُ مِنْ حَوْلِهِمْ﴾ [عنکبوت: ٦٧]

''کیا ان لوگوں نے یہ نہیں دیکھا کہ ہم نے حرم کو پرامن بنا دیا حالانکہ ان کے ارد گرد سے لوگ اچک لیے جاتے ہیں یعنی قتل و غارت کا شکار ہو جاتے ہیں۔''

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا تجارت فرمانا:

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بچپن میں تو سیدہ حلیمہ سعدیہؓ کے ہاں اپنے رضاعی بہن بھائیوں کے ساتھ بکریاں چرائیں۔ اسی طرح جوان ہونے کے ساتھ بھی آپ نے بکریاں چرائیں۔ اس بکریاں چرانے کا ذکر بخاری میں بھی ہے، سیدنا جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ مقام مرالظہران میں ہم سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ تھے کہ فاقہ کش صحابہ کرام رضی اللہ عنہم ایک جنگل میں پہنچ کر پیلو کا پھل توڑ کر کھانے لگے۔ آپ نے ارشاد فرمایا کہ سیاہ پھل زیادہ لذیذ اور خوش ذائقہ ہوتا ہے۔ ہم نے عرض کی: یارسول اللہ! آپ کو یہ کیسے معلوم ہوا۔ آپ نے فرمایا یہ میرا اس زمانے کا تجربہ ہے جب میں بکریاں چرایا کرتا تھا۔ عرض کی گئی یارسول اللہ! کیا آپ بھی بکریاں چرایا کرتے تھے؟ فرمایا! ہاں، کوئی نبی ایسا نہیں گزرا جس نے بکریاں نہ چرائی ہوں؟''

[بخاری ۲/۸۲۰، مسلم رقم ۲۰۵۰، موطا امام مالک رقم ۱۷۷۰، مسند احمد بن حنبل ۳/۳۲۶]

اسی طرح ایک اور روایت میں ہے کہ آپ نے ارشاد فرمایا کہ کوئی نبی ایسا نہیں گزرا جس نے بکریاں نہ چرائی ہوں۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے پوچھا'' حضور کیا آپ نے بھی؟'' فرمایا! ہاں میں بھی ایک مکی کی بکریاں چند قرایط پر چرایا کرتا تھا۔ [بخاری ۱/۲۰۱، ابن ماجہ رقم ۲۱۴۹] سوید کہتے ہیں کہ ہر بکری ایک قیراط کے بدلہ میں۔

اس روایت کو بغوی نے شرح السنہ ۸/۲۶۵، بیہقی نے سنن کبریٰ ۶/۱۱۸، دلائل النبوۃ ۱/۵۵، کنز العمال ۴/۱۱۱ الکامل لابن عدی ۵/۱۷۴۷، طبقات ابن سعد ۱/۱۲۶، مسند الجامع ۱۸/۳۹ عن ابی ہریرۃؓ روایت کیا ہے وسندہ صحیح

مصر کے مشہور عالم اور سیرت نگار استاذ العلماء فضیلۃ الشیخ استاذ ابو زہرہ نے قراریط کا مفہوم یہ لکھا ہے کہ:

القراریط هی حصة من اللبن كان يتغذى به مع اولاد ابى طالب.

''قراریط بکریوں کے دودھ کا وہ حصہ ہے جو سرکار دوعالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اجرت کے طور پر لیا کرتے تھے اور وہ ابو طالب کے اہل وعیال کے لیے بطور غذا، استعمال فرمایا کرتے۔'' [سیرۃ خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ۱/۱۲۷]

اس سے معلوم ہوا کہ ابو طالب حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی کفالت نہ کرتے تھے بلکہ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم آپ کے بچوں کی کفالت فرماتے تھے۔

ایک اور روایت میں ہے کہ ایک مرتبہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: میں بھی اپنے گھر والوں کی بکریاں مقام اجیاد میں چرایا کرتا تھا۔'' [فتح الباری ۴/۴۶۴]

بعض علماء نے یہاں یہ نکتہ بیان فرمایا ہے کہ انبیاء علیہم السلام کا بکریاں چرانا دنیا کی گلہ بانی کا مقدمہ اور تمہید ہوتی ہے۔ بکریاں چرانے میں گلہ بان کو ہر طرف نگاہ رکھنی پڑتی ہے کیونکہ کچھ بکریاں اس طرف دوڑتی ہیں اور کچھ دوسری طرف۔ ان کو نظم وضبط میں لانا نہایت مشکل اور دشوار ہوتا ہے۔ پھر اس کو بھیڑیوں اور درندوں سے بچانا بھی گلہ بان کے فرائض میں سے ہے۔ انبیاء علیہم السلام کو چونکہ امت کا گلہ بان بننا ہوتا ہے اور امت کی صلاح وفلاح کی فکر میں شب وروز سرگرداں رہنا ہوتا ہے۔ امت کے افراد بھیڑ بکریوں کی طرح ادھر ادھر بھاگتے پھرتے ہیں اور انبیاء علیہم السلام ان کو ادھر ادھر بھاگنے سے روکتے ہیں، ان کو شریعت کے نظم وضبط میں رکھتے ہیں اور ان کو شیطان اور نفس کے بھیڑیوں اور درندوں سے بچاتے ہیں، اس لیے بچپن میں ان سے بکریاں چرائی جاتی ہیں تا کہ انہیں ایک

ٹریننگ حاصل ہو جائے۔ بعض حضرات کا خیال ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بچپن میں بارہ سال کی عمر میں گلہ بانی کی اور بعض جوانی کی منزل میں بھی آپ کا بکریاں چرانا بیان کرتے ہیں۔ آپ نے کتنا عرصہ بکریاں چرائیں کسی اور روایت میں ہمارے علم کے مطابق اس کی تصریح نہیں ہے۔[تفصیل کیلئے ملاحظہ ہو طبقات ابن سعد ۱/ ۱۲۵۔۱۲۶، نہایۃ الارب ۶/ ۹۳ عیون الاثر، ابن سید الناس ۱/ ۴۵، سیرۃ حلبیہ ۱/ ۱۲۵]

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنی عمر کی ۲۵ منزلیں طے کر کے عنفوان شباب میں تھے تو گلہ بانی سے آگے بڑھ کر آپ نے میدان تجارت میں قدم رکھا جو آپ کے آباء واجداد کا پیشہ تھا۔ تجارت کے میدان میں آپ کی آمد کا مقصد دولت اکٹھا کرنا نہ تھا جیسا کہ عام تجار کا ہوتا ہے، کیونکہ آپ تو قناعت پسند طبیعت کے حامل تھے۔ گلہ بانی کی اجرت کا اندازہ لگائیں کہ چند قراریط یعنی چند قیراط کی اجرت اس معاشرہ میں کوئی حیثیت نہ رکھتی تھی، لیکن آپ دنیا کے تمام مادی میلانات اور رجحانات سے بے تعلق تھے۔ جب تک زندہ رہے دوسروں کو لعل و گہر بخشتے رہے لیکن اپنا چولہا مہینوں تک نہ جلتا۔ مولانا ظفر علی خان مرحوم نے سچ کہا: ؎

ہیں دوسروں کے واسطے لعل و زر وگر
اور اپنا یہ حال ہے کہ ہے چولہا بجھا ہوا

آپ کی طبیعت میں مال و دولت کے ادھیڑ بن کی مناسبت ہی نہ تھی خود آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایک موقع پر فرمایا:

﴿نحن قوم لانا کل حتی نجوع و اذا اکلنا لا نشبع﴾

''ہمارا تعلق اس طبقہ سے ہے جو اشتہاء سے قبل کھانے پر ہاتھ نہیں ڈالتا اور کبھی سیر شکم ہو کر نہیں کھاتا۔'' [مجمع الزوائد]

اس سے کوئی شخص انکار نہیں کر سکتا کہ آپ نے خود بھی ساری زندگی سختیوں اور مصیبتوں میں گزاری اور دوسروں کو بھی اس قسم کی زندگی بسر کرنے کی ترغیب دی۔

بخلاف ان لوگوں کے جو مال و دولت کے پیچھے بھاگتے ہیں تا کہ اس کے ذریعہ

نفسانی خواہشات کی تکمیل کر سکیں۔ میدان تجارت میں قدم رکھنے سے آپ کی غرض حصول دولت نہ تھی بلکہ ایک تو کثیر العیال اور قلیل المال چچا ابو طالب کی اعانت و امداد تھی اور دوسرے دنیا کو دیانت و امانت، راست بازی اور سچائی اور صداقت کے اصول سکھانے تھے۔ تیسری غرض ایک اور بھی تھی اور وہ یہ تھی کہ چونکہ چند سالوں کے بعد آپ کو ایک بہت بڑا مشکل کام سونپا جانا تھا لہٰذا اپنے تعلقات میں وسعت پیدا کرنے اور لوگوں کو آزمانے اور پرکھنے کا تجربہ حاصل ہو۔

نبوت سے قبل بھی آپ کی زندگی ایک نہایت پاکیزہ زندگی تھی جس میں بداخلاقی کا کوئی معمولی سا دھبہ بھی نہ تھا۔ لیکن تاریخ کی یہ پرانی عادت بہت ہی تکلیف دہ اور مایوس کن ہے کہ کسی شخص کی زندگی کے واقعات قلم بند کرنے کے لیے وہ اسی وقت قلم اٹھاتی ہے جب وہ شخص تاریخی انسان بن چکا ہوتا ہے۔ اس سے قبل اس کے قلم کو جنبش نہیں ہوتی۔ اس نے یتیم مکہ اور نور نظر عبد اللہ اور سیدہ آمنہ کی آنکھوں کی ٹھنڈک کے بارہ میں بھی اسی بخل سے کام لیا اور ان تمام واقعات کو اپنے دامن میں سمیٹنے اور قلم کو حیطہ تحریر میں لانے سے روکے رکھا جو محمد رسول اللہ ﷺ کی روزمرہ کی زندگی میں پیش آتے رہے اور جو قریش کے گردن درازوں کو متاثر کرتے رہے۔ نہ صرف متاثر کرتے رہے بلکہ انہیں ان کا گرویدہ بنا دیا اور وہ آپ کا ''الصادق'' اور ''الامین'' کے سوا کوئی اور نام لینا بے ادبی سمجھتے تھے۔ یہ دونوں لفظ یہاں تک زبانوں پر چڑھ گئے کہ انہوں نے ایک قومی لقب کی حیثیت اختیار کر لی۔ چنانچہ ابن سعد نے طبقات میں آپ کی ایک نہایت خوبصورت تصویر ان الفاظ میں پیش کی ہے۔

> ''محمد ﷺ نے جب عالم شباب میں قدم رکھا تو آپ انسانیت اور مروت کے اعتبار سے اپنی قوم میں سب سے زیادہ ممتاز، اخلاق میں سب سے اعلیٰ، میل جول میں سب سے زیادہ فرحت بخش، ہمسائیگی میں سب سے زیادہ کریم اور خوش گوار، حلم و تحمل کا پیکر، گفتگو میں صادق اور راست گو، فحش گوئی اور ایذا رسانی میں کوسوں دور بھاگنے والے، بردباری میں بے مثال تواضع اور منکسر المزاجی میں باکمال،

ہر ایک کے ہم درد اور بہی خواہ، وعدہ کے پکے اور انتہائی درجہ کے امانت دار، گویا کہ خداوند قدوس نے ان کی ذات والا صفات میں تمام امور صالحہ اور اخلاق فاضلہ مرتکز کر دیے تھے۔ اسی بنا پر قوم نے آپ کو ''الامین'' کے معزز لقب اور خطاب سے نواز تھا''

[طبقات ابن سعد ۱/ ۱۲۱]

ابن سعد نے گویا کہ ''الامین'' کی تعریف کر دی ''الامین'' اس کو کہتے ہیں جس میں یہ ساری صفات موجود ہوں نہ کہ وہ صرف امانت دار ہو۔

تاریخ کے اس بخل کے باوجود چند واقعات ایسے ہیں جو تاریخ کے سکڑے ہوئے دامن پر پڑ گئے اور اس نے انہیں اپنے دامن میں سمیٹ کر محفوظ کر لیا تا کہ انسانیت ان کی روشنی میں اپنے راستے کا تعین کر سکے۔

عبداللہ بن ابی الحمساء ایک معمولی انسان تھا۔ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے اس کا کوئی سودا ہو رہا تھا۔ دوران گفتگو اسے کوئی کام یاد آ گیا۔ وہ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے کہنے لگا کہ آپ ٹھہریئے میں ابھی آ کر بات کرتا ہوں۔ آپ کی زبان سے ''اچھا'' نکل گیا۔

عبداللہ بن ابی الحمساء تو وہاں جا کر اپنے وعدہ کو بھول گئے لیکن آپ اپنی زبان سے نکلے ہوئے لفظ ''اچھا'' کو نہ بھولے۔ آپ پورا دن اس کا اسی مقام پر انتظار کرتے رہے پھر اگلا دن بھی گزر گیا۔ تیسرے روز ابن ابی الحمساء کو یاد آیا کہ میں واپسی کا وعدہ کر کے آیا تھا۔ وہ فوراً آپ کے مکان پر پہنچا لیکن گھر والوں سے یہ خبر سن کر اس کو سخت حیرانگی ہوئی کہ آپ تین روز سے گھر پر ہی نہیں آئے۔ وہ فوراً وعدہ گاہ پر پہنچا۔ دیکھا کہ آپ وہاں اس کے انتظار میں کھڑے تھے۔ آپ اس کو دیکھ کر بالکل غصہ میں نہیں آئے۔ دھیمی آواز سے صرف اتنا کہا۔ ''بھلے مانس! تو نے مجھے پریشان کر دیا میں برابر تین روز سے تمہارا یہاں انتظار کر رہا ہوں۔ [ابوداؤد، باب العدہ، کتاب الادب]

عبداللہ بن سائب رضی اللہ عنہ ایک صحابی تھے۔ فرماتے ہیں کہ میں زمانہ جاہلیت میں محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا شریک تجارت تھا۔ میں جب مدینہ طیبہ حاضر ہوا تو آپ نے فرمایا! مجھے پہچانتے

ہو؟ میں نے عرض کیا: کیوں نہیں''۔

﴿كنت شريكي فنعم الشريك لا تداري ولا تماري﴾

''تم تو میرے شریک تجارت تھے، نہ کسی بات کو ٹالتے اور نہ کسی بات پر جھگڑا کرتے۔'' [خصائص کبریٰ ۱/۱۹۱، اسد الغابہ ۵۲/۲۳۱]

قیس بن ثابت المخزومی بھی اسی طرح کا واقعہ بیان کرتے ہیں کہ زمانہ جاہلیت میں آپ میرے شریک تجارت تھے۔ آپ بہترین شریک تجارت تھے۔ نہ کبھی جھگڑتے اور نہ کسی سے مناقشہ کرتے۔ [الاصابہ ترجمہ قیس بن سائب رضی اللہ عنہ]

کاروباری سلسلہ میں جھگڑا اور مناقشہ نہ کرنا احترام آدمیت کی بہترین مثال ہے تا کہ کوئی شخص معمولی دنیوی فائدے کے لیے انسانی اقدار کے احترام کو ختم نہ کر دے۔

بعض حضرات نے لکھا ہے کہ اعلان نبوت سے قبل آپ مختلف لوگوں کے ساتھ تجارت میں شریک رہے چنانچہ آپ اپنے بچپن کے دوست سیدنا ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کے شریک تجارت بھی رہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ایک سیرت نگار لکھتے ہیں کہ:

''قریش کے ایک بڑے سوداگر حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ بھی آپ کے شریک کاروبار رہے وہ کبھی کبھی تجارتی سفر میں آپ کے ساتھ ساتھ ہوتے۔ وہ شروع ہی سے آپ کی کاروباری صداقت وامانت کے بڑے گرویدہ تھے۔'' [سیرۃ احمد مجتبیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ۱/۱۰۵]

زبیر بن عبد المطلب آپ کے سگے تایا تھے۔ یہ بھی آپ کے شریک تجارت تھے۔ زبیر مکہ کے مشہور تاجروں میں سے تھے۔ بعض حضرات کا کہنا ہے کہ آپ کی والدہ ماجدہ سیدہ آمنہ نے آپ کے والد ماجد کے ترکہ کو زبیر کے کاروبار میں لگا دیا تھا جو کہ ایک کامیاب تاجر تھے۔ اس طرح سرمایہ میں اضافہ ہوتا رہا۔ (تاریخ محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ص ۲۱) کچھ اور سفر بھی آپ نے اپنے تایا کے ساتھ کیے۔

ایک اور مصنف نے لکھا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا تمام کاروبار آپ کے تایا زبیر کی زیر نگرانی رہا۔ آپ نے دس سال کی عمر میں اپنے تایا کے ہمراہ یمن کا سفر کیا۔

کچھ اور لوگوں نے بھی بعض حضرات کے ساتھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا شریک

تجارت ہونا لکھا ہے۔

اعلان نبوت سے قبل بھی آپ کی زندگی نہایت پاکیزہ اور معاملات نہایت کھرے اور تعلقات نہایت استوار تھے۔ آپ کی ان صفات کا شہرہ نہ صرف مکہ بلکہ بیرون مکہ بھی پھیلا۔ ہر کوئی آپ کی خوبیوں سے اپنی اپنی استعداد اور طلب کے مطابق آشنا اور باخبر ہوا کیونکہ پھول کی مہک صرف چمن ہی تک نہیں رہتی۔ بلکہ حدود چمن سے باہر بھی نکلتی ہے اور راستہ پر چلتے ہوئے لوگوں کو بھی اپنی موجودگی کا پتہ دیتی ہے۔

سیدہ خدیجہؓ قریش کی ایک نہایت معزز اور مال دار خاتون تھیں۔ باپ کا نام خویلد، شرم وحیاء کی بیٹی۔ اسی وجہ سے نہ صرف اسلام میں بلکہ زمانہ جاہلیت میں بھی لوگ ''طاہرہ'' کے نام سے پکارتے تھے۔ [زرقانی ۱/۱۹۹، فتح الباری ۷/۱۰۰]

ہر مال دار اپنے مال میں اضافہ اور بڑھوتری کا خواہش مند ہوتا ہے، لیکن فرق یہ ہے کہ برے تاجر حلال وحرام کی تمیز نہیں کرتے لیکن اچھے لوگ جائز طریق اور حدود شریعت میں رہ کر تجارت کرتے ہیں۔ جب بھی قریش مکہ تجارت کے لیے قافلہ روانہ کرتے تھے سیدہ خدیجہ بھی چند آدمیوں کو اپنا مال مضاربت کے اصول پر دے کر روانہ کرتیں اور اس طریقہ سے اپنے مال میں اضافہ کرتیں۔ سیدہ چونکہ معاملات کی سچی اور اصول تجارت میں دیانت دار تھیں اس وجہ سے لوگ ان کا مال لے جانے کو ترجیح دیتے تھے۔

بعض روایات میں ہے کہ ایک روز ابو طالب نے جناب رسالت مآب ﷺ سے کہا کہ اس وقت تمہاری قوم کا ایک تجارتی قافلہ شام جانے کو تیار ہے اور خدیجہ قریش کے آدمیوں کو سرمایہ دے کر تجارت کے لیے بھیج رہی ہے اور لوگ اس کے سرمایہ سے بہت منافع حاصل کر رہے ہیں۔ اگر تم بھی خدیجہ سے شام جانے کی خواہش کا اظہار کرو تو مجھے یقین ہے کہ وہ تمہاری طہارت نفسی اور معاملات کی صداقت اور دیانت کی وجہ سے تم کو دوسروں پر ترجیح دے گی۔ گو میں تمہیں شام بھیجنا پسند نہیں کرتا لیکن حالات کی مجبوری ہے کہ تجارت کے لیے وہاں جائے بغیر اور کوئی چارہ کار بھی نہیں۔ [عیون الاثر لابن سید الناس ۱/۱۱۶]

روایات میں ہے کہ ابو طالب اگرچہ خاندان قریش کے سربراہ تھے، لیکن ایک

سردار اور سربراہ کے لیے جو صفات اور خصوصیات ایک شخص میں پائی جانی چاہئیں جیسے شجاعت و بہادری، جودونوال، بخشش وعطا، مروت و بردباری اور دولت وثروت وغیرہ ابو طالب ان میں سے اکثر سے یک قلم محروم تھے، لیکن پھر بھی چونکہ زبیر بن عبدالمطلب کے انتقال کے بعد خاندان میں سب سے زیادہ عمر رسیدہ تھے۔ لہٰذا جسمانی کمزوری اور معذوری اور مالی کمزوری اور ناداری کے باوجود وہ اپنے خاندان کے سربراہ ہوئے۔

ابو جعفر محمد بن حبیب الہاشمی کے مطابق آپ لنگڑے تھے اور ابن قتیبہ نے اپنی کتاب المعارف میں بھی ایسا ہی لکھا ہے۔ شاید پیدائشی طور پر آپ معذور تھے۔ چنانچہ اس جسمانی نقص کی وجہ سے نہ ہی حرب فجار میں اور نہ ہی کسی اور جنگ میں آپ کی شرکت کا پتہ چلتا ہے۔ اہل خاندان کا ذریعہ معاش تجارت تھا اور تجارت کی وجہ سے انکی معاشی حالت بہت بہتر تھی۔ ابو طالب چونکہ لنگڑے تھے لہٰذا اپنی اس معذوری کی وجہ سے وہ دور دراز تجارتی سفر سے معذور تھے۔ یہی انکی مالی کمزوری کا سبب تھا۔ سیرت کی کتابوں میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی معیت میں آپ کے سفر شام کا جو ذکر ملتا ہے وہ صرف ایک افسانہ ہے، ورنہ تاریخی طور پر اس کی کوئی حیثیت نہیں، ٹانگوں کے اسی نقص کی وجہ سے وہ عطر فروشی اور بعض اوقات غلہ کی خرید وفروخت کر لیتے تھے۔ اس معمولی تجارت کی وجہ سے ان کی آمدنی کوئی زیادہ نہ تھی۔ دوسرے کثرت عیال کی وجہ سے انکی اس معمولی آمدنی سے خاندان کا گزارا مشکل تھا۔ چنانچہ سیدنا علی ابن ابی طالب فرماتے ہیں:

﴿ابی ساد فقیراً و ما ساد فقیر قبلہ﴾ [یعقوبی ۱/۱۷]

''میرے والد ابو طالب جب سردار ہوئے تو مالی طور پر فقیر تھے اور ان سے قبل کوئی فقیر سردار نہیں ہوا۔''

[ایسا ہی سیرۃ حلبیہ ۱/۱۴۳، ابن ابی الحدید ۳/۴۶۱ میں بھی لکھا ہوا ہے]

یہ وہ حالات تھے جن کے تحت ابو طالب جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو سیدہ خدیجہ رضی اللہ عنہا طاہرہ کا مال تجارت لے جانے کی ترغیب دے رہے تھے تاکہ ان کے مالی حالات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اس سفر کے باعث اچھے ہوجائیں۔

بعض روایات میں ہے کہ آپ کے اوصاف حمیدہ اور دیانت و امانت اور صدق مقال کی شہرت دور دور تک پہنچ گئی۔ سیدہ خدیجہؓ کا سامان قریش کے کل سامان کے برابر ہوتا تھا۔ وہ مضاربت پر لوگوں کو تجارت کے لیے بیرون مکہ اور شام بھیجتی تھیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی عمر اس وقت ۲۵ سال تھی اور آپ کو قوم کی جانب سے ''الصادق'' اور ''الامین'' کے القاب مل چکے تھے اور یہی دو صفات ایک تاجر کی تجارت کے فروغ کا سب سے بڑا سرمایہ ہوتی ہیں۔ آپ کے ان اوصاف کا گھر گھر چرچا ہوا۔ اس بنا پر سیدہ خدیجہ نے خود آپ کو پیغام بھیجا کہ اگر آپ میرا مال تجارت شام لے کر جائیں تو آپ کو دوسروں کی نسبت زیادہ حصہ دوں گی۔ آپ نے سیدہ کے اس پیغام کو قبول فرمالیا اور سیدہ خدیجہ کے غلام میسرہ کے ساتھ آپ شام کی جانب مال لے کر روانہ ہوئے۔ شام جانے سے قبل سیدہ خدیجہ نے آپ سے یہ کہا کہ میں آپ کی قوم کے دوسرے تاجروں کو جو نفع یا حصہ دیتی ہوں، آپ کو اس سے دگنا دوں گی۔ آپ نے اس کو منظور فرمالیا اور گھر آ کر اپنے چچا ابو طالب سے بھی اس کا ذکر کیا یہ سن کر ابو طالب بہت خوش ہوئے۔ [عیون الاثر لابن سید الناس ۱/۱۱۶۔۱۱۷]

بعض روایات میں ہے کہ سیدہ نے اپنے غلام میسرہ کو جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ روانہ کیا تو نہایت تاکید سے فرمایا: میسرہ! خبردار ان کی نافرمانی نہ کرنا اور نہ ہی ان کی رائے کی مخالفت کرنا۔''

غرض کہ آپ سیدہ خدیجہ طاہرہ کا مال لے کر غلام میسرہ کی معیت میں ۱۶ ذی الحجہ کو شام روانہ ہو گئے۔ آپ کے چچاؤں نے قافلہ والوں کو سخت تاکید کی کہ محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سخت حفاظت کرنا ایسا نہ ہو کہ انہیں کسی دشمن سے کوئی گزند پہنچے۔ راستہ میں آتے جاتے میسرہ برابر دیکھتا رہا کہ جب گرمی کی شدت ہوتی تھی تو جھٹ بادل آ کر آپ پر سایہ فگن ہو جاتا تھا۔ میسرہ یہ باتیں دیکھ دیکھ کر حیران ہوا اور اسکے دل میں آپ کی محبت اور عقیدت جاگزین ہو گئی۔

جب واپسی پر آپ مر الظہران پہنچے جو مکہ اور عسفان کے مابین ایک وادی ہے تو آپ سب سے آگے آگے تھے یہاں تک کہ ظہر کے وقت آپ مکہ مکرمہ پہنچ گئے۔ اس

وقت سیدہ خدیجہ چند خواتین کے ساتھ اپنے بالا خانہ میں بیٹھی ہوئی باہر کا نظارہ کر رہی تھیں۔ ان خواتین میں نفیسہ بنت منیہ بھی موجود تھیں۔ سیدہ خدیجہؓ اور دوسری خواتین نے اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ دو بڑے پرندے سرور عالم ﷺ کے سر پر سایہ کر رہے ہیں یہ نظارہ دیکھ کر وہ انگشت بدندان رہ گئیں۔ ظاہر ہے کہ وہ فرشتے تھے جو پرندوں کی شکل میں متمثل تھے۔

بعض روایات میں ہے کہ شام کے سفر میں سیدہ خدیجہ کا اپنے غلام میسرہ کو آپ کے ساتھ بھیجنے کا بہانہ یہ تھا کہ وہ سفر میں آپ کی خدمت کرتا رہے گا لیکن اصل مقصد یہ تھا کہ وہ سرکار دو عالم ﷺ کے طور واطوار کا گہری نظر سے مطالعہ کرتا رہے۔ سرور کائنات ﷺ جب اپنی تجارت میں دوسروں سے بہت زیادہ منافع کما کر واپس مکہ تشریف لائے تو سیدہ بہت خوش ہوئیں، لیکن سب سے زیادہ خوشی آپ کو سرور کائنات کے اوصاف حمیدہ اور خصائل پسندیدہ کو سن کر ہوئی جو میسرہ نے سیدہ سے بیان کیے اور آپ کی دیانت داری اور راست گفتاری کی ایسی تعریف کی کہ سیدہ نے دامان محمد ﷺ سے اپنے آپ کو وابستہ کرنے کا عزم صمیم کر لیا۔

سیدہ خدیجہ مکہ مکرمہ کی رہنے والی خاتون تھیں جو ۴۵ سال کے پیٹے میں تھیں۔ (یہ عام روایت ہے لیکن ڈاکٹر حمید اللہ مرحوم کی تحقیق ہے کہ سیدہ کی عمر بھی اس وقت سرور دو عالم کے برابر تھی، اور ایک روایت میں سیدہ کی عمر ۲۸ سال تھی۔ (ذکرہ ابن کثیر من روایت ابن عساکر عن ابن عباس ملاحظہ ہو تاریخ دمشق ص ۱۵۶، طبقات ابن سعد ۱/ ۱۷ (ہمارے خیال میں ۲۸ برس والی روایت زیادہ صحیح ہے کیونکہ ۴۵ برس کی عورت اتنی اولاد پیدا نہیں کر سکتی جتنی سیدہ نے کی) سیدہ جس شخص سے شادی کا ارادہ کر بیٹھی تھی، وہ حسب ونسب میں تمام مکہ والوں سے اعلیٰ اور افضل تھا۔ صورت وسیرت میں بے مثال، اخلاق وعادات میں باکمال، گویا کہ دنیا جہاں کی خوبیاں اللہ تعالیٰ نے اس کی ذات میں جمع کر رکھی تھیں۔ ایسا قیمتی ہیرا، انہیں کہاں ملنے والا تھا۔ سیدہ ایک تاجرہ تھی۔ تجارت میں بھی وہ اس نوجوان کی کاروباری صلاحیتوں، دانش مندی، ہوشیاری اور مستعدی دیکھ چکی تھیں۔ اگرچہ اس

نوجوان کے پاس دولت کے ڈھیر نہیں تھے، لیکن سیدہ کی نگاہ اس کی جن خوبیوں کی طرف تھی، اس کے مقابلہ میں دولت وثروت کی حیثیت ایک پرچھائیں سے زیادہ نہ تھی۔ دولت کے انبار رکھنے والے خود سیدہ کو قبل ازیں دعوت نکاح دے چکے تھے لیکن ان کے دعوت نامے سیدہ نے ٹھکرا دیے تھے۔ اب سیدہ کی دلچسپیاں آپ کی ذات ستودہ صفات میں خود بخود مرتکز ہو چکی تھیں اور وہ اس کوشش میں تھیں کہ جلد از جلد کوئی اس رشتہ کے لیے سلسلہ جنبانی کرے۔ یہ سب کچھ سرکار دو عالم ﷺ کی نیک نفسی، راست بازی، صداقت، امانت داری، اور صدق وصفا کی وجہ سے ہوا جو تجارت کے اہم اجزاء ہیں۔ چنانچہ سیدہ سے آپ کا نکاح سفر شام سے واپسی کے دو ماہ ۲۵ روز بعد ہو گیا۔

[تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو زرقانی ۱/۱۹۹ الروض الانف ۱/۱۲۲، ابن ہشام ۱/۱۹۰، فقہ السیرۃ ص ۶، فتح الباری ۷/۱۰۵، عیون الاثر ۱/۱۷ وغیرہ]

اس واقعہ سے معلوم ہوا کہ ایک تاجر میں نہایت اعلیٰ اخلاقی صفات کا پایا جانا ضروری ہے اور رسول اللہ ﷺ کی انہی صفات سے متاثر ہو کر مکہ کی ذہین اور تجربہ کار تاجرہ سیدہ طاہرہؓ آپ کے حبالہ عقد میں آئیں حالانکہ آپ کو تجارت کا کوئی سابقہ تجربہ نہ تھا اور تجارت کا سابقہ تجربہ رکھنے والے بڑے بڑے تاجر سیدہ کی اس میزان پر پورے نہ اترے اور ان کی دعوت نکاح کو سیدہ نے ٹھکرا دیا تھا۔

سوشل اور تجارتی بائیکاٹ

تجارت کی اہمیت کا اندازہ اس سے بھی لگایا جا سکتا ہے کہ جب کسی قوم یا فرقہ کو نقصان پہنچانا مقصود ہو تو اس کا سوشل اور تجارتی بائیکاٹ کر دیا جاتا ہے جیسا کہ قریش مکہ نے مسلمانوں کا کیا۔ جس کی تفصیل کچھ یوں ہے کہ جب مسلمان قریش مکہ کے مظالم سے تنگ آ کر حبشہ ہجرت کر گئے تو قریش نے ان کو واپس لانے کے لیے اپنا ایک سفارتی وفد شاہ حبشہ نجاشی کے پاس بھیجا جس کی تفصیل ہم نے اپنی کتاب ''سیرت خاتم النبیین ﷺ'' میں دی ہے۔ یہ سفارتی وفد ناکام واپس لوٹا۔ سفارت کی اس ناکامی اور سیدنا حمزہ رضی اللہ عنہ اور

سیدنا عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کا حلقہ اسلام میں داخل ہونے اور مزید برآں بنو ہاشم اور بنو مطلب کے سارے ہی مسلم اور کافر افراد کا ایک ہو کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حفاظت وصیانت کے عہد و پیمان نے قریش مکہ کو چکرا دیا۔ انکی سمجھ میں کچھ نہیں آتا تھا کہ محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اس دعوت کو کس طرح روکا جائے۔ لہٰذا انہوں نے اب اپنی اسٹریٹیجی (Strategy) میں تبدیلی کی اور اب اقدام قتل کے بجائے ظلم وستم کی ایک اور راہ تجویز کی جو پہلی تمام ظالمانہ کاروائیوں سے زیادہ سنگین اور سخت تھی۔

وہ ظالمانہ کاروائی یہ تھی کہ قریش نے متفقہ طور پر ایک تحریری معاہدہ تیار کیا کہ جب تک بنو ہاشم اور بنو مطلب محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو قتل کے لیے ان کے حوالے نہ کر دیں گے اس وقت تک ان دونوں خاندانوں سے ہر قسم کے تعلقات منقطع کر دیے جائیں۔ نہ کوئی شخص ان سے میل جول اور بات چیت کرے گا۔ نہ ہی ان سے تجارت کرے گا اور نہ ہی ان کو کھانے پینے کا کوئی سامان مہیا کیا جائے گا خواہ وہ سامان خریدنا ہی کیوں نہ چاہیں، کوئی شخص ان سے کسی قسم کی رواداری نہ برتے گا اور نہ ان سے رشتہ بیاہ کرے گا۔

بعض سیرت نگاروں کے نزدیک یہ معاہدہ نضر بن حارث نے تحریر کیا تھا اور بعض روایات میں ہے کہ عامر بن ہاشم نے یہ معاہدہ لکھا تھا۔ بہر حال جس نے بھی یہ معاہدہ لکھا سرکار دو عالم نے اس کے بارہ میں بددعا کی اور اس کا وہ ہاتھ شل ہو گیا۔ جس سے اس نے وہ معاہدہ لکھا تھا۔ [زاد المعاد ۲/ ۴۶، طبقات ابن سعد ۱/ ۲۰۹]

اس معاہدہ پر قبائل قریش کے تمام سربراہ حضرات نے دستخط کیے اور جب یہ معاہدہ مرتب ہو گیا تو اس کو خانہ کعبہ کی چھت سے آویزاں کر دیا گیا۔ اس معاہدہ کے بعد نبو ہاشم اور نبو مطلب کا مکمل تجارتی اور سوشل بائیکاٹ شروع کیا گیا، اور ابولہب کے سوا بنو ہاشم اور بنو مطلب کے سارے افراد خواہ وہ مسلمان تھے یا کافر، سمٹ کر شعب بنی ہاشم میں محبوس ہو گئے۔ (عام تواریخ اور سیرت کی کتابوں میں اس کا نام شعب ابی طالب لکھا ہوا ہے لیکن یہ نام غلط ہے۔ دراصل یہ ایک پہاڑ کا درہ تھا جو خاندان بنو ہاشم کا موروثی تھا اور اس کا اصل نام شعب بنو ہاشم تھا۔ [ملاحظہ ہو سیرۃ النبی، شبلی نعمانی ۱/ ۲۴۵ تعلیقہ ناسخ التواریخ ۲/ ۳۴۱، العقد

الفرید ۳/ ۱۹۶ اور تاریخ یعقوبی وغیرہ] یہ واقعہ محرم سنہ ۷ نبوی کو پیش آیا۔ [فتح الباری ۷/ ۱۴۷]

اس درہ میں مسلسل تین سال یہ دونوں خاندان محبوس رہے۔ یہ تین سال نہایت سنگین تھے۔ دشمنان اسلام نے ہاشم اور مطلب کی اولاد سے میل ملاقات، سلام و پیام، تجارت اور لین دین سب کچھ یک قلم موقوف کر دیا۔ دکانداروں نے ان کے ہاتھ سودا سلف فروخت نہ کرنے کی قسم کھالی۔ ہر قسم کا تعاون اٹھ گیا۔ قریش تمام اشیاء خوردنی کو جن کی نسبت انہیں ادنیٰ احتمال ہوتا تھا کہ ہاشمیوں یا مطلبیوں کے ہاتھ پڑ جائیں گی۔ ہر قیمت پر فی الفور خرید لیتے اور ہاشمیوں کو خریدنے نہ دیتے۔ جب ان کے کانوں میں بھنک پڑ جاتی کہ کہیں سے سوداگر غلہ لا رہے ہیں تو شہر سے دور نکل کر راستہ میں انہیں جا ملتے، اور تمام اناج جس قیمت پر بھی انہیں مل سکتا، خرید لیتے۔ بنو ہاشم اور بنو مطلب کے سب لوگ جب اس گھاٹی اور درہ میں چلے گئے تو ان کے سکونتی مکانات مقفل ہو گئے۔ درہ میں بھی کوئی شی میسر نہ تھی کیونکہ قریش نے درہ کو ہر طرف سے محصور کر لیا تھا اور کھانے پینے کی کوئی چیز ان تک نہ پہنچنے دیتے تھے۔ جب ہاشمیوں کے ننھے منھے بچے بھوک سے بلبلاتے اور ان کی آواز باہر دور دور تک سنائی دینے لگتی تو سیاہ دل اور سنگ دل قریش خوش ہوتے، لیکن جوان میں رحم دل تھے ان کو ناگوار گزرتا اور وہ صاف کہتے کہ تم کو نظر نہیں آتا کہ اس معاہدہ کے لکھنے والے پر کیا آفت نازل ہوئی ہے۔

کوئی کوشش ایسی نہ تھی جو ہاشمیوں کو بھوکے مارنے کے لیے قریش مکہ عمل میں نہ لائے۔ ان سنگ دل لوگوں نے اس گھاٹی سے باہر ایسا پہرہ لگا رکھا تھا کہ رات کے وقت بھی کوئی چیز گھاٹی میں نہ پہنچ سکتی تھی۔ بنو ہاشم درختوں کے پتے کھا کھا کر دن کاٹتے تھے۔

بنو ہاشم اور بنو مطلب نے تین سال اس طرح گزارے کہ ان کو علانیہ کوئی شی دستیاب نہ ہوتی تھی اور اگر کسی شی پر انہیں دسترس حاصل ہو جاتی تو وہ وہی ہوتی جو سیدنا ابو بکر رضی اللہ عنہ یا دوسرے جانثاروں کی طرف سے کسی طرح چوری چھپے پہنچا دی جاتی تھی۔ چنانچہ ایک مرتبہ ام المومنین سیدہ خدیجہ سلام اللہ علیہا کے بھتیجے حکیم بن حزام بن خویلد نے جو ابھی حلقہ اسلام میں داخل نہیں ہوئے تھے کسی قدر گیہوں اپنے غلام کے ہاتھ اپنی پھوپھی کے پاس

گھاٹی میں بھجوا دیئے۔ ابوجہل کو پتہ چل گیا وہ دشمن اسلام جھٹ سوار ہو کر پہنچا اور غلام کا راستہ روک کر کہنے لگا: ''میں تمہیں ہاشمیوں کے پاس گیہوں نہ لے جانے دوں گا اور سارے مکہ میں تمہیں ذلیل ورسوا کردوں گا۔ اتفاق سے ابوالبختری بن ہشام بن حارث نامی ایک غیر مسلم رئیس وہاں آ گیا اور ابوجہل سے پوچھنے لگا کیا قصہ ہے؟ ابوجہل نے کہا کہ ''یہ حکیم بن حزام کا غلام محمد ﷺ کیلئے گیہوں لے جا رہا ہے اور میں اسے روک رہا ہوں'' ابوالبختری نے کہا: ''ابوالحکم! حکیم بن حزام کی پھوپھی کا کچھ گیہوں اس کے پاس امانتاً رکھا ہوا تھا وہ اس نے منگوایا ہوگا۔ جانے دو، اس میں کوئی حرج نہیں۔'' ابوجہل نے کہا ''میں یہ گیہوں کسی صورت نہیں جانے دوں گا۔'' ابوالبختری نے کہا: ''ایک شخص اپنی پھوپھی کی امانت واپس کرنا چاہتا ہے مگر تیری شقاوت اور سنگ دلی اس کی اجازت بھی نہیں دیتی۔'' ابوجہل کو یہ سن کر غصہ آ گیا چنانچہ ابوجہل اور ابوالبختری میں تلخ کلامی ہوگئی اور پھر نوبت ہاتھا پائی تک پہنچ گئی۔ ابوالبختری نے ابوجہل کے اونٹ کی گردن پکڑ کر زور سے مروڑی اور جھٹکا دے کر اونٹ کو بٹھالیا پھر ابوجہل کو گردن سے پکڑ کر نیچے کی طرف کھینچا۔ پھر اونٹ کی ہڈی اٹھا کر اس زور سے ابوجہل کے سر پر ماری کہ اس کا سر پھٹ گیا اور خون کا فوارہ جاری ہو گیا۔ لیکن ابوالبختری نے اسے پھر بھی نہ چھوڑا۔ خوب ٹھوکریں اور ٹھڈے مارے اور بری طرح ذلیل وخوار کیا۔ مار کھانے سے زیادہ ابوجہل کو تکلیف اس سے پہنچی کہ سیدنا حمزہ رضی اللہ عنہ شعب بنوہاشم سے اس کارروائی کو دیکھ رہے تھے۔

اس کا خلاصہ یہ ہے کہ تجارت ایک قوم کیلئے نہایت ضروری چیز ہے۔ اگر یہ نہ ہوتو قوم بدحال اور خستہ حال ہو جاتی ہے۔ اس وجہ سے رسول اللہ ﷺ نے خود بھی تجارت کی اور لوگوں کو بھی تجارت کرنے کی ترغیب دی کیونکہ معاشیات کی پختہ حالی قوم کی ریڑھ کی ہڈی ہوتی ہے۔ اور قوموں کی مضبوطی اور فارغ البالی اور خوش حالی تجارت ہی سے ہوتی ہے چنانچہ رسول اللہ ﷺ نے بھی ہجرت مدینہ کے بعد قریش مکہ کی اقتصادی ناکہ بندی کرنے کی کوشش کی جو کہ جنگ بدر کی سب سے بڑی وجہ تھی۔ ہجرت مدینہ کے بعد جب تحویل قبلہ کا حکم نازل ہوا اسے حتمی طور پر مسلمانوں کا قبلہ کعبہ کو قرار دیا گیا۔ تحویل کعبہ کے

اس حکم سے مسلمانوں کا رشتہ خانہ کعبہ کے ساتھ اور بھی مضبوط اور پختہ کر دیا گیا۔

اس متمدن اور مہذب دنیا کے اندر بھی کسی مطالبہ کو تسلیم کرانے کا پرامن طریقہ اقتصادی ناکہ بندی ہے۔ مدینہ منورہ کی بیدار مغز قیادت نے یہ طریقہ استعمال کیا۔ چنانچہ مختلف سرایا اور غزوات میں قریش کے تجارتی قافلوں کے تعاقب میں جو دستے روانہ ہوئے ان کا منشا اور مقصد صرف یہ تھا کہ قریش کو مجبور کر دیا جائے تاکہ مسلمانوں کا مکہ میں داخلہ بے خطر ہو سکے لیکن قریش مکہ کو مسلمانوں کی یہ بیدار مغزی اور جسارت کب برداشت ہو سکتی تھی۔

مسلمان جب ہجرت کر کے مدینہ منورہ گئے تو قریش نے اہل مدینہ کو یہ حکم دیا تھا کہ محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے جنگ کرو یا پھر انہیں اپنے ہاں سے نکال دو وگرنہ تمہارے نوجوانوں کو قتل اور تمہاری عورتوں کو لونڈیاں بنالیا جائے گا۔ اہل مدینہ نے قریش کا یہ حکم بالکل تسلیم نہ کیا۔ اب قریش کیلئے یہ وقار کا سوال ہو گیا تھا کیونکہ اب اگر وہ مدینہ پہنچ کر ان کے نوجوانوں کو قتل اور عورتوں کو لونڈیاں نہ بنائیں تو ان کے وقار اور عزت کی پوری عمارت دھڑام سے زمین پر آ گرتی تھی اور سرزمین عرب میں ان کی تسلیم شدہ عظمت و قیادت خطرہ میں پڑ جاتی تھی لیکن اب مسلمانوں کی پوزیشن وہ نہیں تھی جو زعیم قریش ابوجہل سمجھتا تھا کیونکہ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مدینہ منورہ پہنچتے ہی جو سیاسی تدابیر اختیار کی تھیں اور بقائے باہمی کے اصول پر معاہدات کا جال پھیلا کر ظاہر بینوں کیلئے مادی اسباب میں بھی ایک طاقت اور قوت بنالی تھی اس نے قریش کو باور کرا دیا کہ مسلمان اتنا تر لقمہ نہیں ہیں کہ ان کو آسانی کے ساتھ نگلا جا سکے بلکہ اب انہیں مکمل تیاری کر کے مدینہ کا رخ کرنا چاہیے۔

جنگ کی تیاری کے لیے سرمایہ کی ضرورت تھی اور اتنا سرمایہ ان کے پاس اگرچہ تھا لیکن کفر کے بخل کی وجہ سے وہ اتنا سرمایہ لگانا نہیں چاہتے تھے۔ چندہ اکٹھا کرنا انہوں نے مناسب نہ سمجھا، لہٰذا منصوبہ یہ بنایا گیا کہ چندہ کے بجائے تجارت کے ذریعہ سرمایہ اکٹھا کیا جائے۔ اس کا طریقہ یہ سوچا گیا کہ ایک بہت بڑا تجارتی قافلہ شام بھیجا جائے۔ اس تجارتی قافلہ میں مکہ کا ہر شخص خواہ وہ عورت ہو یا مرد سرمایہ لگائے اور اس سے جو منافع حاصل ہو اس

کو مسلمانوں کے خلاف جنگ میں صرف کیا جائے۔ چنانچہ تجارت کے نام پر قریش کے ایک ایک فرد نے اس قافلہ میں اپنا مال لگایا۔ عورتیں جو تجارت میں بہت کم حصہ لیتی ہیں۔ انہوں نے بھی اس میں اپنی رقم لگائی۔ صرف ایک شخص ایسا تھا جو اس سے الگ رہا، اس کا نام حویطب بن عبدالعزیٰ تھا۔ [البدایہ والنہایہ ۳/۲۵۶]

انتقام کے جذبہ کے تحت جس شخص کے پاس تھوڑی سے تھوڑی رقم بھی تھی، اس نے بھی وہ اس تجارتی قافلہ میں لگادی۔ چنانچہ ابوسفیان جو اس تجارتی قافلہ کے سردار تھے، انہوں نے خود بیان کیا ہے کہ

﴿مامن قریشی ولاقرشیة له نش فصاعداً لابعث به رضا﴾

''قریش کے کسی مرد یا عورت کے پاس ایک نش یا اس سے بھی کم تھا تو اس نے وہ ہمیں دے دیا۔'' [طبقات ابن سعد ۲/۷]

نش اوقیہ یا بیس درہم کا ہوتا ہے جس کا وزن پونے چار تولے چاندی ہوتا تھا۔ اس طرح مجموعی رقم جو اکٹھی ہوئی اس کی مالیت پچاس ہزار دینار تھی۔ اس لحاظ سے وہ اٹھارہ ہزار سات سو پچاس تولہ سونا اس قافلے کا سرمایہ تھا جو آج کل کے حساب سے قریباً دس کروڑ بنتا ہے۔

قریباً ہر قبیلہ کا نمائندہ اس میں شریک ہوا۔ اس طرح صرف سربراہوں کی تعداد چالیس اور ایک روایت کے مطابق ستر تھی۔ [درمنثور ۳/۱۶۴]

ابوسفیان کو رئیس قافلہ مقرر کیا گیا کیوں کہ انہیں تجارتی قافلوں کا زیادہ تجربہ تھا۔ اتنے سرمایہ کا ساز وسامان لے کر یہ قافلہ مکہ سے شام کی جانب روانہ ہوا۔

اتنا بڑا قافلہ جس میں پچاس ہزار کا ساز وسامان تیار کیا گیا ہو اور ایک ہزار اونٹ اور قریش کے چالیس سے ستر اکابر کے ہاتھ میں اس کی زمام کار ہو تو اس کا مکہ سے نکل کر شام جانا کوئی سربستہ راز نہیں ہو سکتا۔ اس کی خبریں مدینہ میں بھی پہنچ رہی تھیں۔ اور قدرتی بات ہے کہ یہ خبریں اہل مدینہ کے دلوں میں خوف و ہراس کی لہریں پھیلا رہی تھیں، لہٰذا

نبوی بصیرت نے قریش کے اس تجارتی منصوبے کو ناکام بنانے کے لیے غزوہ عشیرہ میں ڈیڑھ سو یا دو سو مہاجرین کی معیت میں خود اس کا تعاقب کیا، لیکن آپ کے عشیرہ پہنچنے سے پہلے وہ قافلہ وہاں سے جاچکا تھا۔ اس طرح وہ آپ کی گرفت سے بچ نکلا تھا۔ رمضان المبارک میں پھر یہی قافلہ بے شمار مال و دولت سے لدا پھندا واپس مکہ مکرمہ آرہا تھا۔ آپ کو اس کی واپسی کی اطلاع ملی تو آپ نے سیدنا طلحہ بن عبید اللہ اور سیدنا سعید بن زید رضی اللہ عنہ کو اس کے حالات کا پتہ چلانے کے لیے شمال کی جانب روانہ فرمایا۔ یہ دونوں صحابی مقام حوراء تک گئے۔

سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا یہ اقدام ہر لحاظ سے مناسب تھا۔ یہ اقدام لوٹ مار میں شمار نہیں ہوتا بلکہ یہ اقتصادی ناکہ بندی کہلاتا ہے کیوں کہ اپنے آپ کو دشمن کے شر سے بچانا نہایت ضروری ہے۔ قریش کے عزائم اچھے نہیں تھے۔ انہوں نے تمام اہل مدینہ کو الٹی میٹم دے دیا تھا کہ اگر انہوں نے محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو مدینہ سے نہ نکالا تو تمہارے نوجوانوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا جائے گا۔ قریش اگر مدینہ پر حملہ کرتے تو صرف مسلمان ہی ان کے ظلم و ستم کا نشانہ نہ بنتے بلکہ مدینہ کے تمام باشندے اور باسی بھی ان کے حملہ کا ہدف ہوتے۔ ایک باحوصلہ بہادر اور بیدار مغز قائد کے لیے یہ ضروری ہوتا ہے کہ وہ نہ صرف اپنے آدمیوں کا بلکہ اپنے حلیف اور معاہد شہریوں کی جان و مال کی حفاظت کا انتظام بھی کرے۔ جنگی تدابیر، لڑائی کے پینترے اور اسٹریٹیجی (Strategy) اور مقابلہ کی چالیں وہ قابل قدر خوبیاں ہیں جو ایک بہادر اور بیدار مغز جرنیل کے کمالات میں شمار ہوتی ہیں۔ سیدنا سعد بن معاذ انصاری رضی اللہ عنہ رئیس اوس مکہ مکرمہ میں ابوجہل کو جو چیلنج دے کر آئے تھے کہ ''ہم تمہاری تجارت کا راستہ بند کر دیں گے۔'' اس کو کامیاب کرنے کا سب سے اہم اور سب سے زیادہ نازک وقت یہی تھا چنانچہ آپ نے بروقت، برمحل اور بجا طور پر قصد فرمایا کہ اس قافلہ کا راستہ روکا جائے۔

تجارتی قافلہ کی واپسی شام سے کب ہوگی اور کس راستہ سے واپس جائے گا۔ اس کا علم کسی کو نہ تھا۔ جانے کا راستہ تو معلوم تھا لیکن اس بات کا قوی امکان تھا کہ واپسی کا راستہ

تبدیل ہو جائے اور مدینہ طیبہ کے قریب سے گزرنے کے بجائے اس شاہراہ سے گزرے جو ساحل سمندر کو چھوتی ہوئی ینبع کے قریب سے بدر کی جانب مڑتی ہے۔ بدر ایک جنکشن تھا جہاں مدینہ کو بھی راستہ جاتا تھا اور مکہ مکرمہ کو بھی، لہٰذا سرکار دو عالم ﷺ نے دونوں طرف آدمی بھجوا دیئے۔ لبیس بن عمرو جہنی کو بدر کی جانب اس راستہ پر بھیجا اور عدی بن ابی الرغباء کو اس راستہ پر جو مکہ کو جاتا تھا، اور سیدنا طلحہ بن عبید اللہ اور سیدنا سعید بن زید کو شام کی جانب روانہ کیا۔ [البدایہ والنہایہ ۳/۲۶۲]

دس روز گزر گئے لیکن یہ حضرات مدینہ واپس نہ پہنچے۔ البتہ لبیس بن عمرو جہنی جن کو مکہ مکرمہ کی طرف جانے والے راستہ پر بھیجا گیا تھا وہ واپس تشریف لائے۔ سیدنا انس بن مالک رضی اللہ عنہ بیان فرماتے ہیں کہ سیدنا لبیس رضی اللہ عنہ جب واپس پہنچے تو انہوں نے تنہائی میں سرکار دو عالم ﷺ سے ملاقات کی اور اس وقت آپ ﷺ کے اور میرے سوا گھر میں اور کوئی نہ تھا۔ [البدایہ والنہایہ ۳/۲۷۷]

تنہائی میں کیا باتیں ہوئیں تاریخ کے اوراق اس بارہ میں خاموش ہیں۔ البتہ اس کے فوراً بعد سرکار دو عالم ﷺ نے روانگی کا حکم دیا اور روانگی کا اعلان کچھ اس طرح کیا کہ ''جن کی سواریاں یہاں موجود ہیں وہ ہمارے ساتھ چلیں۔'' گویا جانے میں عجلت کا اظہار فرمایا۔ انصار کے پاس سواری کے اونٹ تو تھے لیکن رسول اللہ ﷺ ان کو لے کر اتنی جلدی مدینہ طیبہ سے نکلے کہ وہ اپنی چراگاہوں سے جو کہ مدینہ طیبہ کے گرد و نواح میں آٹھ میل تک پھیلی ہوئی تھیں، اپنے اونٹ نہ لا سکے۔ انہوں نے بارگاہ رسالت میں عرض بھی کیا کہ وہ اپنے اونٹ اپنی چراگاہوں سے لے آئیں لیکن انہیں اجازت نہ ملی۔

[ملاحظہ ہو بخاری ۱/۷۸ عمدۃ القاری و مسند امام احمد بن حنبل وغیرہ]

مدینہ طیبہ سے اس طرح دفعتاً روانگی کچھ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو ناگوار بھی گزری کیوں کہ وہ فراست نبوی کو نہ سمجھ سکے تھے اور دوسرے قریش کے قافلہ کی شان و شوکت اور جاہ و جلال کا جو نقشہ ان کے ذہنوں میں تھا یا ان سے جو بیان کیا گیا تھا اس سے بھی وہ خائف تھے۔ اسی بات کو قرآن حکیم نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے۔

﴿كَمَا اَخْرَجَكَ رَبُّكَ مِنْ بَيْتِكَ بِالْحَقِّ وَ اِنَّ فَرِيْقًا مِّنَ الْمُؤْمِنِيْنَ لَكٰرِهُوْنَ﴾

''جیسے تیرے رب نے تجھے باہر نکالا تیرے گھر سے صحیح وجہ سے حالانکہ اہل ایمان کا ایک گروہ اس سے ناخوش تھا۔''

آپ نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے ساتھ شام کی طرف کوچ نہ فرمایا بلکہ آپ اس جانب روانہ ہوئے جہاں سے اب قافلے کے گزرنے کا امکان تھا۔ یہ بدر کے قریب کا راستہ تھا جو سمندر کو چھوتا ہوا اس راستہ سے جا ملتا تھا جس کو ابوسفیان نے اب اختیار کیا تھا جہاں سیدنا طلحہ بن عبید اللہ رضی اللہ عنہ اور سعید بن زید رضی اللہ عنہ پہنچے ہوئے تھے اور ابھی تک واپس نہ آئے تھے۔

سرکار دو عالم ﷺ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو لے کر باہر تو نکلے لیکن صحابہ رضی اللہ عنہم کو معلوم نہیں تھا کہ کہاں جانا ہے۔ منزل متعین نہ تھی، نتیجہ سفر کا اندازہ نہیں تھا لیکن مدینہ سے اتنی جلدی نکلنے کی وجہ سے یہ معلوم تھا کہ سفر نہایت اہم ہے۔ تبھی تو اتنی جلدی رخت سفر باندھا ہے اور ہمیں اپنی سواریاں لینے کے لیے بھی وقت نہیں دیا گیا۔

آپ کا معمول یہ تھا کہ مدینہ سے باہر جب کبھی سفر پر جاتے تو مدینہ سے باہر نکل کر کسی جگہ قیام فرماتے۔ وہاں ضروری انتظامات کا جائزہ لیتے، رفقائے سفر کو شمار کرتے اور ان کی ضروریات کا بھی جائزہ لیتے۔ اس دفعہ جو آپ رفقائے سفر کو لے کر نکلے تو مدینہ طیبہ سے ایک میل باہر ''بئر ابی عتبہ'' پر قیام فرمایا اور ہدایت فرمائی کہ اونٹوں کو پانی پلایا جائے، پکھالوں میں پانی بھر لیا جائے اور ایک صحابی سیدنا قیس بن صعصعہ رضی اللہ عنہ کو حکم فرمایا کہ وہ کنویں پر کھڑے ہو جائیں اور رفقائے سفر اور ان کی سواریوں کو شمار کریں۔ انہوں نے رفقائے سفر کو جو شمار کیا تو ان کی تعداد ۳۱۳ تھی جن میں ۷۴ مہاجرین اور باقی انصار تھے۔ ان ۳۱۳ کے پاس کل ستر (۷۰) اونٹ تھے اور صرف دو گھوڑے تھے۔ ایک سیدنا مقداد رضی اللہ عنہ کے پاس اور دوسرا سیدنا زبیر بن عوام رضی اللہ عنہ کے پاس۔ ابن سعد نے ایک اور گھوڑے کا بھی ذکر کیا ہے جو سیدنا مرثد بن ابی مرثد غنوی رضی اللہ عنہ کے پاس تھا۔

۱۲ ارمضان المبارک ۲ھ میں اتوار کے روز آپ مدینہ منورہ سے روانہ ہوئے اور جمعہ کے روز غزوہ بدر کا واقعہ پیش آیا۔ یعنی چار پانچ روز میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے قریباً ۸۰ میل کی مسافت طے کی جو عموماً اس سے زیادہ دنوں میں طے کی جاتی تھی۔ یہ تیز رفتاری صرف اس لیے اختیار کی گئی تا کہ اس تجارتی قافلے کا مال ضبط کیا جاسکے جو بعد میں مسلمانوں کے مقابلہ میں جنگ میں کام آنا تھا۔ آپ کا اس طرح بے سرو سامانی کی حالت میں نکلنا اس بات کی صاف غمازی کرتا ہے کہ آپ جنگ کے لیے نہیں نکلے تھے بلکہ قریش کے تجارتی قافلہ کے تعاقب اور جستجو میں اتنی تیز رفتاری سے آئے تھے۔

سیدنا لبیس بن عمرو رضی اللہ عنہ اور سیدنا عدی بن ابی الرغباء رضی اللہ عنہ جن کو پہلے قافلہ کا پتہ چلانے کے لیے بھیجا گیا۔ یہ دونوں حضرات بدر پہنچ کر ایک ٹیلہ کے قریب ٹھہر گئے۔ پھر بدر کے چشمہ پر گئے۔ مجدی بن عمرو جہنی یہاں کا رئیس تھا۔ وہ بھی چشمہ پر موجود تھا۔ وہاں دو لونڈیاں بھی پانی بھرنے آئی ہوئی تھیں۔ ان میں سے ایک نے دوسری سے قرض کی رقم لینی تھی چنانچہ وہ دوسری عورت کو پکڑے ہوئے اپنے قرض کا مطالبہ کر رہی تھی۔ مقروض لونڈی نے اس کو یہ کہہ کر یقین دلا دیا کہ کل پرسوں قریش کا ایک تجارتی قافلہ آنے والا ہے۔ میں اس میں محنت مزدوری کر کے کچھ رقم جمع کرلوں گی اور تمہارا قرضہ ادا کردوں گی۔ مجدی بن عمرو جہنی نے اس شرط پر ان کا جھگڑا طے کرا دیا۔ [سیرۃ ابن ہشام ۲/۶۱۷]

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے ان دونوں صحابہ نے ان عورتوں کی باتوں کو سن لیا اور وہ تمام معلومات ان سے اخذ کرلیں جو انہیں درکار تھیں۔ ان دونوں بزرگوں نے بھی اپنے اونٹوں کو پانی پلایا اور سیدھے سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور پوری رپورٹ پیش خدمت کی۔ ان کی رپورٹ سے یہ معلوم ہوگیا کہ ابوسفیان کا قافلہ ابھی بدر سے نہیں گزرا۔

بوسفیان ایک ہوشیار اور بیدار مغز تاجر تھے اور وہ صرف تاجر ہی نہیں تھے بلکہ ایک حوصلہ مند جرنیل اور صاحب ہوش وحواس لیڈر بھی تھے۔ اسی وجہ سے اہل مکہ نے انہیں اس تجارتی قافلہ کا رئیس بنایا تھا۔ ابوسفیان کو بخوبی علم تھا کہ قریش نے مسلمانوں سے جنگ کا

جو منصوبہ اور پلان بنایا ہے، یہ تجارتی قافلہ بھی اس کا ایک حصہ ہے اور چونکہ تمام اہل مکہ کا سرمایہ اس میں لگا ہوا ہے۔ اس وجہ سے سب کی ہمدردیاں بھی ان کے ساتھ ہیں اور وہ ان کے جذبات کے ساتھ بخوبی کھیل سکتے ہیں۔ چنانچہ انہوں نے دو کام کیے۔

ایک تو اس قافلہ کو مسلمانوں کی دست برد سے بچانے کے لیے مناسب تدابیر کیں اور دوسرے اہل مکہ کو بھی خبردار اور ہوشیار کر دیا کہ وہ بھی قافلہ کے سرمایہ کو تاخت و تاراج ہونے سے بچائیں۔ انہوں نے قافلہ کو مسلمانوں کی دست برد سے بچانے کیلئے یہ تدبیر کی کہ مدینہ کا راستہ چھوڑ کر وہ راستہ اختیار کیا جو ساحل سمندر کو چھو کر ینبع کے قریب سے گزرتا ہے۔ جیسا کہ بتایا گیا ہے کہ سرکار دو عالم ﷺ کے دو صحابی سیدنا طلحہ بن عبید اللہ اور سیدنا سعید بن زید رضی اللہ عنہ قافلہ کی جستجو میں جب حوراء کے علاقہ میں ''کشد'' کے پاس پہنچے تو قافلہ یہاں سے گزر رہا تھا۔ وہ یہاں سے بدر کی طرف مڑا جہاں مشہور فرودگاہ تھی اور یہاں سے ہر طرف کو شاہراہیں جاتی تھیں۔ ایک شاہراہ مکہ مکرمہ کی طرف جاتی تھی۔ ابو سفیان کا اصل راستہ بدر سے یہی شاہراہ تھی اور قریش کی فوج بھی مکہ سے بدر اسی شاہراہ سے آئی تھی۔ لیکن ابوسفیان نہایت بیدار مغزی اور ہوشیاری سے کام لیتے ہوئے پہلے قافلہ کے بغیر خود تنہا بدر پہنچا تاکہ وہاں کے رئیس شیخ مجدی سے حالات معلوم کرے، لیکن سرکار دو عالم ﷺ کے دو مخبر سیدنا لبیس بن عمرو رضی اللہ عنہ اور سیدنا عدی بن ابی الرغباء رضی اللہ عنہ قافلہ کا پتہ لگانے کے لیے بدر کے چشمہ پر پہنچے جہاں دو لونڈیاں آپس میں جھگڑ رہی تھیں اور شیخ مجدی بن عمرو ان کے پاس کھڑا ان کا جھگڑا چکا رہا تھا۔ ان دونوں حضرات نے ان دونوں لونڈیوں کی گفتگو سے حالات کو بھانپ لیا۔ انہوں نے شیخ مجدی سے کوئی گفتگو نہ کی بلکہ اپنے اونٹ کو پانی پلا کر اور مشکیزہ میں پانی بھر کر واپس چلے آئے تھے۔ ابوسفیان جب تنہا بدر پہنچا اور شیخ مجدی بن عمرو سے دریافت کیا کہ ''کیا مدینہ کے لوگ ادھر آئے تھے؟ آپ کو ان کے بارہ میں کچھ علم ہے؟'' شیخ مجدی نے جواب دیا: ''مدینہ کا کوئی آدمی اس طرف نہیں آیا۔ جو لوگ اس طرف سے گزرے ہیں ان کو میں بخوبی پہچانتا ہوں، البتہ دو شخص ایسے آئے تھے جن کو میں نہیں پہچان سکا۔ انہوں نے یہاں بات چیت تو کوئی نہیں کی بلکہ پہنچ کر ٹیلہ کے

قریب اونٹ بٹھایا پھر اس طرف آئے، پانی بھرا اور واپس چلے گئے، میں نہیں بتا سکتا کہ وہ کون تھے؟"

ابوسفیان کو ان دونوں حضرات کے بارہ میں شبہ ہوا اور فوراً وہاں گیا جہاں انہوں نے اونٹ بٹھایا تھا۔ وہاں کچھ مینگنیاں پڑی ہوئی تھیں اس نے ایک مینگنی کو اٹھا کر توڑا تو اس میں سے ایک گٹھلی نکلی۔ اس نے جونہی گٹھلی دیکھی تو گھبرا کر بولا:

﴿هذا والله علائف يثرب﴾

"اللہ کی قسم یہ تو یثرب کے راتب کی گٹھلی ہے۔"

پھر فوراً قافلہ میں پہنچا اور رفقائے قافلہ کو بتایا اور اس راستہ کو چھوڑ کر دوسرے راستہ کو ہولیا۔ جب آگے چل کر پوری طرح اطمینان ہو گیا کہ قافلہ مسلمانوں کی دست برد سے محفوظ ہو گیا ہے تو ابوجہل کو پیغام بھیجا کہ قافلہ چونکہ محفوظ ہو گیا ہے لہٰذا آپ لوگ بھی جنگ کا ارادہ ترک کر کے واپس چلے جائیں۔ چنانچہ مورخین نے لکھا ہے کہ جب میدان بدر میں فریقین کا مقابلہ ہوا تو ابوسفیان کا قافلہ نشیبی حصہ میں سمندر کے کنارے کنارے مکہ جا رہا تھا۔

ایک طرف تو ابوسفیان نے قافلہ کو اس تدبیر سے مسلمانوں کی دست برد سے محفوظ کر لیا۔ دوسری طرف اس نے حفظ ماتقدم کے طور پر ایک شخص ضمضم بن عمرو غفاری کو سونے کے بیس مثقال دیے جن کا وزن آج کل کے حساب سے ساڑھے ساٹھ تولے ہوتا ہے اور اس کو پٹی پڑھائی کہ وہ فوراً مکہ پہنچ کر اپنے اونٹ کی ناک کاٹ دے، اپنے تمام کپڑے پھاڑ کر برہنہ ہو جائے، اونٹ پر الٹا بیٹھ کر (یعنی منہ دم کی طرف کر کے) پورے مکہ شہر میں شور مچاتا ہوا گھوم جائے اور یہ آواز لگا دے کہ محمد (ﷺ) نے ابوسفیان کے تجارتی قافلے پر حملہ کر دیا ہے۔ ضمضم خود بھی بہت ہوشیار اور چالاک آدمی تھا۔ لہٰذا اس نے بڑی ہوشیاری اور چالاکی سے ابوسفیان کی اس تدبیر پر عمل کیا۔ یہ طریقہ عرب میں اس زمانہ میں لوگوں کو ہوشیار کرنے کا ہوتا تھا۔

ضمضم مکہ آیا اور اس نے وہی کچھ کیا جو ابوسفیان نے اس سے کہا تھا۔ یہ خبر جنگل

کی آگ کی طرح مکہ میں پھیل گئی۔ لوگوں کے جذبات میں اشتعال پیدا ہوا جس کو اب کوئی روک نہیں سکتا تھا کیوں کہ قافلہ پر حملہ سے پورا ملک متاثر ہوتا تھا۔ اس لیے جذبات کی ایک گھٹا اٹھی اور گہرے بادل کی طرح پورے ملک پر چھا گئی۔ اس آواز نے پورے ملک کو چونکا دیا۔ مرد وزن پریشان حال گھروں سے نکل آئے۔ وہ یہ سن کر حواس باختہ ہو گئے کہ محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اور ان کے رفقاء یہ سمجھتے ہیں کہ یہ قافلہ بھی ابن حضرمی کے قافلے جیسا ہے۔ لات اور عزیٰ کی قسم! انہیں پتہ چل جائے گا کہ ہمارا معاملہ کچھ اور ہے۔

اب تو دار الندوہ کے اجتماع کی بھی ضرورت نہیں تھی کہ وہاں جمع ہو کر سوچا جائے کہ کیا کیا جائے؟ اب تو ہر شخص دار الندوہ بنا ہوا تھا۔ اب ابوجہل ان کا لیڈر تھا اور اب پورے مکہ کی زمام کار اس کے ہاتھ میں تھی۔ اس کو لوگوں کے جذبات کے ساتھ کھیلنے کا ایک موقع ہاتھ آ گیا۔ اس نے فوراً تیاری کا حکم دے دیا۔ چنانچہ دو تین روز کے اندر قریش کی ایک اچھی خاصی تعداد اسلحہ سے لیس ہو کر روانگی کے لیے تیار ہو گئی جو بالآخر جنگ بدر پر منتج ہوئی جس کی تفصیل ہم نے اپنی کتاب ''سیرۃ خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم'' میں دی ہے۔

یہ تفصیل اس لیے بیان کی گئی ہے کہ تجارت ایک قوم کی اقتصادی اور معاشی قوت اور طاقت ہے۔ اس کی کمزوری اور بربادی قوم کی کمزوری اور بربادی سمجھی جاتی ہے۔ اس وجہ سے سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے امت کو تجارت کرنے کی ترغیب دی اور اپنی زندگی میں اگر ضرورت محسوس کی تو اسلام کے دشمنوں کی اقتصادی اور تجارتی ناکہ بندی کرنے سے گریز نہ کیا اگرچہ پھر اپنی رحمۃ للعالمینی کی وجہ سے ان کی اقتصادی اور تجارتی ناکہ بندی کو یک قلم ختم کر دیا۔ چنانچہ اس سلسلہ میں ثمامہ بن آثال حاکم یمامہ کا ایک واقعہ گزشتہ صفحات میں نقل کیا گیا ہے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے ان کو گرفتار کر کے مسجد کے ستون کے ساتھ باندھ دیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس کے جسم کو تو قتل نہ کیا البتہ اس کی روح کو قتل کر دیا یعنی اس پر احسان کر کے چھوڑ دیا۔ ثمامہ آپ کے خلق عظیم سے سخت متاثر ہوا۔ وہ قریب کے ایک باغ میں گیا اور غسل کر کے دوبارہ مسجد نبوی میں آیا اور کلمہ شہادت پڑھ کر دائرہ اسلام میں داخل ہو گیا۔ پھر وہ عمرہ کے لیے مکہ گیا۔ جب وہاں کے لوگوں کو اس کے اسلام لانے کا علم ہوا تو انہوں

نے کہا: ''تم بے دین ہو گئے ہو؟'' ثمامہ نے جواب دیا کہ میں بے دین نہیں ہوا بلکہ میں نے اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے دین کو قبول کیا ہے۔ ثمامہ نے نہ صرف اسلام قبول کیا بلکہ اسلام کی قوت کا ذریعہ بن گیا۔ اس زمانہ میں مکہ کے لوگوں کو باہر کے جن مقامات سے گندم فراہم ہوتی تھی اس میں یمامہ کا ایک خاص مقام تھا۔ چنانچہ ثمامہ نے اہل مکہ سے کہا:

''سن لو! محمد ﷺ کی اجازت کے بغیر اب گندم کا ایک دانہ بھی یہاں نہیں آئے گا۔''

گندم کی درآمد بند ہونے سے مکہ والوں کا برا حال ہونے لگا۔ انہوں نے سخت اضطراب اور بدحواسی کے عالم میں سرکار دو عالم ﷺ کی طرف رجوع کیا اور درخواست کی کہ یمامہ کے حاکم کو حکم فرمایا جائے کہ وہ اناج کی بندش اٹھالے۔ آپ نے اسی وقت ثمامہ بن آثال کو کہلا بھیجا کہ اناج کی بندش اٹھالو۔ چنانچہ اس نے آپ ﷺ کے حکم کی تعمیل کرتے ہوئے اناج کی بندش اٹھالی۔ [سیرۃ ابن ہشام ۱/۳۶۴]

آج یورپ جو اسلام پر الزام لگا رہا ہے کہ وہ تلوار کے زور سے پھیلا، ان سے صرف ایک ہی سوال ہے کہ ان تلوار چلانے والوں پر تلوار کس نے چلائی۔ اس سلسلہ میں ایک مغربی مسلمان نے بڑی پتے کی بات کہی ہے۔ اس کا نام احمد ہولٹ (Ahmad Holt) تھا۔ یہ اگرچہ انگلستان کا ایک سول کنٹریکٹر تھا اور سچائی کی تلاش میں اس نے بہت سفر کیا۔ کئی لوگوں سے ملا، یہودیت، عیسایت اور اسلام کا تقابلی مطالعہ کیا۔ آخر ۱۹۷۵ء میں اس نے اسلام قبول کرلیا۔ اس نے اسلام کی اس تلوار کے بارہ میں جس نے دنیا کی ایک بہت بڑی اکثریت کو حلقہ بگوش اسلام کیا۔ ایک عجیب وغریب بات لکھی ہے کہ

''اسلام کی تلوار لوہے کی تلوار نہیں بلکہ پیار و محبت کی تلوار ہے۔ مجھے خود اس بات کا تجربہ ہے کیوں کہ اس تلوار کا میں خود بھی زخم خوردہ ہوں۔ یہ تلوار لوگوں کو مارتی نہیں بلکہ انہیں زندگی بخشتی ہے۔ یہ انسان کو اس بات کی آشنائی بخشتی ہے کہ وہ کیا ہے؟ کیوں ہے؟ اور اس دنیا میں کیا لینے کے لیے آیا ہے؟'' [سیرۃ ۴/۵۵، بحوالہ انسان کامل ﷺ ص ۶۹۸]

اسی طرح ایک امریکن دانشور مسٹر جیمز میچنر (James Michener) نے

مغربی دنیا کے اس خیال کی کہ اسلام تلوار کے زور سے پھیلا ہے، ان الفاظ میں تردید کی ہے۔

''جیسے اسلام نہایت تیزی سے دنیا میں پھیلا بالکل اتنی تیزی سے اور کوئی مذہب دنیا میں نہیں پھیلا۔ مغرب کا یہ نظریہ کہ اسلام تلوار کے زور سے پھیلا، بالکل غلط ہے اور جدید اسکالرز اور دانش ور اس نظریہ کو تسلیم کرتے ہیں کہ اسلام نے حریت فکر پر بڑا زور دیا ہے۔''

(Islam the Misunderstood Religion, Reader Digest, May, 1955)

رسول اللہ ﷺ کی اسی عفو و درگزر کی صفت کو علامہ سید سلیمان ندوی قدس سرہ نے ان الفاظ میں بیان فرمایا ہے۔

''مکہ جب فتح ہوا تو حرم کے صحن میں، کس حرم کے صحن میں، جہاں آپ ﷺ کو گالیاں دی گئیں، آپ پر نجاستیں پھینکی گئیں۔ آپ کے قتل کی تجویز منظور ہوئی۔ قریش کے تمام سردار مفتوحانہ کھڑے تھے۔ ان میں وہ بھی تھے جو آپ کو جھٹلایا کرتے تھے، وہ بھی تھے جو آپ کو مٹانے میں ایڑی چوٹی کا زور لگا چکے تھے، وہ بھی تھے جو خود اس پیکر قدسی کے ساتھ گستاخیوں کا حوصلہ رکھتے تھے، وہ بھی جنہوں نے آپ پر پتھر پھینکے تھے۔ آپ کے راستہ میں کانٹے بچھائے تھے۔ آپ پر تلواریں چلائی تھیں۔ وہ بھی تھے جنہوں نے آپ کے عزیزوں کا خون ناحق کیا تھا، ان کے سینے چاک کیے تھے، ان کے دل و جگر کے ٹکڑے کیے تھے، وہ بھی تھے جو غریب اور بے کس مسلمانوں کو ستاتے تھے، ان کو جلتی ریتوں پر لٹاتے۔ دہکتے کوئلوں سے ان کے جسموں کو داغتے تھے، نیزوں کی انی سے ان کے بدن کو چھیدتے تھے آج یہ سب مجرم سرنگوں تھے، پیچھے دس ہزار خون آشام تلواریں محمد رسول اللہ ﷺ کے ایک اشارہ کی منتظر تھیں۔''

[خطبات مدراس، خطبہ نمبر ۵، سیرت محمدی کی جامعیت]

تجارت کی اہمیت

وسائل معیشت میں افضل ترین وسیلہ ''تجارت'' ہے۔ بعض سلف میں اختلاف پایا جاتا ہے کہ سب سے افضل تجارت ہے یا زراعت۔ امام شافعیؒ کے نزدیک تجارت افضل ہے اور امام ابوالحسن ماوردی وغیرہ کی رائے یہ ہے کہ زراعت افضل ہے۔ امام نوویؒ کی رائے یہ ہے کہ اپنے ہاتھ سے کمانا افضل ہے اور اس میں زراعت بھی شامل ہے۔ صاحب بحرالرائق فرماتے ہیں کہ احناف کے نزدیک جہاد کے بعد معیشت کا افضل طریقہ تجارت ہے۔ پھر زراعت ہے اور پھر صنعت وحرفت ہے۔ علماء نے لکھا ہے کہ معیشت کے تین ذرائع ہیں: تجارت، زراعت اور اجارہ (ملازمت) اور ہر ایک کے فضائل میں بہت احادیث آئی ہیں۔ بعض حضرات نے اس میں صنعت وحرفت کو بھی شامل کیا ہے لیکن بعض حضرات کے نزدیک صنعت وحرفت کمائی کے اسباب میں شمار نہیں ہوتے اس لیے کہ صرف صنعت وحرفت کمائی نہیں ہے کیونکہ اگر کوئی شخص برتن بناتا ہے تو وہ برتن بنا بنا کر اپنی دکان بھرلے گا اس سے کوئی آمدنی نہیں ہوگی جب تک وہ ان برتنوں کو فروخت نہیں کرے یا پھر کسی کے پاس ملازم ہو کر برتن بنانے شروع کردے۔ اس وجہ سے یہ دونوں طریقے تجارت اور اجارہ میں آگئے۔ غرضیکہ اسباب معیشت میں سب سے افضل سبب تجارت ہے اس لیے رسول اللہ ﷺ نے اپنی احادیث میں اس کی بڑی تعریف کی اور آپ نے خود بھی تجارت کی اور تجارت کو پسند فرمایا۔ اس وجہ سے تجارت اسلامی نظام معیشت کا جزو اعظم ہے۔ لہٰذا ایک اسلامی حکومت کے فرائض میں داخل ہے کہ وہ اس کی توسیع کیلئے ہر ممکن کوشش کرے بلکہ موجودہ زمانہ میں تو تجارت کو ہر چیز پر فوقیت حاصل ہے اور دنیا میں تمام امیر ملک تجارت کی وجہ سے امیر ہوئے ہیں نہ کہ زراعت کی وجہ سے، چنانچہ فقہاء نے لکھا ہے:

''اس دنیا میں تجارت تمام معاشی اعمال میں سب سے بڑا وسیلہ معاش ہے اور تمدن وحضارت کے اسباب میں سے سب سے بڑا

سبب ہے۔"

اسی وجہ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے تجارت کی بڑی ترغیب دی ہے کیونکہ اقتصادی اور معاشی نظام کی ترقی کا راز سب سے زیادہ تجارت ہی میں مضمر ہے۔ جو قوم جس قدر تجارت میں دلچسپی لیتی ہے وہ اسی قدر معاشی اور اقتصادی ترقی کی منزلیں طے کرتی ہے۔ جس ملک اور قوم کے باشندے اس زمانہ میں تجارت میں دلچسپی نہیں رکھتے وہ اقتصادی میدان میں ہمیشہ دوسروں کے دست نگر رہتے ہیں اور اسی راستہ سے دوسری قومیں ان کے تمدن، تہذیب، معیشت، اقتصادیات اور سیاست بلکہ مذہب پر قابض ہو جاتی ہیں اور ان کو غلام بنا کر ان پر مطلق العنان حکومت کرتی ہیں جیسا کہ برصغیر پاک و ہند میں انگریزوں نے قبضہ کیا اور ہندوستان کے باشندے قریباً دو سو سال تک غیروں کے جبر و استبداد کا شکار رہے۔ انگریز ہندوستان میں تجارت ہی کی غرض سے آیا تھا اور آج بھی امریکہ اور یورپی ممالک اسی راہ سے دنیا پر اپنا پنجہ استبداد مضبوط کر رہے ہیں۔ عراق کے تیل پر قبضہ کرنے کیلئے امریکہ نے وہاں ایسی خون کی ہولی کھیلی اور ابھی تک کھیل رہا ہے کہ دنیا میں اس کی مثال نہیں ملتی۔ اسی وجہ سے علماء نے لکھا ہے کہ جو قوم تجارت نہیں کرتی وہ آج نہیں تو کل ضرور غلام بن کر رہے گی اور جو ملک تجارت کی برکات سے محروم ہے وہ جلد ہی قعر مذلت و ہلاکت میں گر کر تباہ و برباد ہو جائے گا۔

زراعت کی اہمیت

اس کا یہ مطلب بھی نہیں ہے کہ اسلام میں زراعت کا کوئی مقام نہیں ہے۔ اسلام میں زراعت کا بھی بہت بڑا مقام ہے لیکن تجارت کی اہمیت زراعت سے زیادہ ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انسانی دنیا پر زرعی پیداوار کو ایک عظیم الشان احسان جتا کر بتایا ہے کہ انسانی طبعی وسائل معیشت میں زراعت کو بھی ایک خاص اہمیت حاصل ہے۔ چنانچہ قرآن حکیم میں ہے۔

﴿اَفَرَ اَیْتُمْ مَاتَحْرُثُوْنَ، ءَاَنْتُمْ تَزْرَعُوْنَهٗ اَمْ نَحْنُ الزّٰرِعُوْنَ،

لَوْ نَشَاءُ لَجَعَلْنَاهُ حُطَامًا فَظَلْتُمْ تَفَكَّهُونَ، إِنَّا لَمُغْرَمُونَ
بَلْ نَحْنُ مَحْرُومُونَ﴾ [الواقعہ: ۶۳ - ۶۷]

''بھلا بتاؤ تو سہی تم جو کھیتی باڑی کرتے ہو اس کو تم اگاتے ہو یا ہم اگاتے ہیں اگر ہم چاہیں تو اس کو چورا چورا کر دیں اور تم باتیں بناتے رہ جاؤ کہ بلاشبہ تم پر تاوان ڈالا گیا بلکہ ہم تو محروم رہ گئے۔''

اس آیت کے بارہ میں شیخ الاسلام علامہ شبیر احمد عثمانی قدس سرہ فرماتے ہیں۔

''بظاہر بیج زمین میں تم ڈالتے ہو لیکن زمین کے اندر اس کی پرورش کرنا پھر باہر نکال کر ایک لہلہاتی کھیتی بنا دینا کس کا کام ہے؟ اس کے متعلق تو ظاہر اور سطحی دعویٰ بھی تم نہیں کر سکتے کہ ہماری تیار کی ہوئی ہے۔ پھر کھیتی پیدا کرنے کے بعد اس کا محفوظ اور باقی رکھنا بھی ہمارا ہی کام ہے۔ ہم چاہیں تو کوئی آفت بھیج دیں جس سے ایک دم میں ساری کھیتی تہس نہس ہو کر رہ جائے پھر تم سر پکڑ کر روؤ اور آپس میں بیٹھ کر باتیں بنانے لگو کہ میاں ہمارا تو بڑا بھاری نقصان ہو گیا بلکہ سچ پوچھو تو بالکل خالی ہاتھ ہو گئے'' [فوائد عثمانی: ص۷۱۲]

زراعت پر انسانی زندگی کا انحصار ہے کیونکہ جو غلہ زمین میں اگتا ہے اس کو کھا کر ہی انسان زندہ رہتا ہے۔ اس سے پتہ چلا کر زراعت کو بھی انسانی زندگی میں اور شریعت کے نزدیک ایک اہم مقام حاصل ہے۔ چنانچہ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

﴿اطلبوا الرزق فی خبایا الارض﴾

[رواہ ابویعلی، رقم ۴۳۶۷، مجمع الزوائد ۴/ ۷۲]

''زمین کی پہنائیوں میں رزق تلاش کرو۔''

اس حدیث سے مراد زراعت اور کاشت کاری ہے کما قال الامام السرخسیؒ

فضیلت کے علاوہ زراعت کا یہ کام باعث اجر و ثواب بھی ہے جیسا کہ حدیث میں ہے۔

''جو مسلمان کوئی پودا اگاتا ہے تو اس درخت میں سے جو کچھ کھایا جاتا

ہے وہ اس کا صدقہ ہو جاتا ہے جو کچھ اس میں سے چوری ہو وہ اس کا
صدقہ ہو جاتا ہے اور جو درندے کھالیں وہ بھی اس کا صدقہ ہو جاتا
ہے اور جو پرندے کھالیں وہ بھی اس کا صدقہ ہو جاتا ہے اور جو شخص
اس میں سے کم کرے گا وہ اس کا صدقہ ہو جائے گا۔'' [مسلم رقم: ۳۹۴۷]

اسی مضمون کی ایک اور روایت سیدنا انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے بھی مروی ہے کہ سرکار دو عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

''جو مسلمان بھی کوئی درخت لگاتا ہے یا کوئی کھیت اگاتا ہے اس سے
کوئی پرندہ، انسان یا جانور کھائے تو وہ اس کا صدقہ ہو جاتا ہے یعنی
اس کیلئے اجر و ثواب کا باعث بنتا ہے۔''

[مسلم رقم: ۳۹۵۰، بخاری رقم: ۲۳۲، مسند احمد ۴/ ۵۵، معجم کبیر طبرانی، ۴/ ۲۳۶، الترغیب والترہیب: ۳/ ۳۷۶]

ان احادیث سے یہ معلوم ہوا کہ مسلمان اگر کوئی درخت لگائے تو جو جاندار بھی اس کا پھل کھائے گا وہ درخت لگانے والے کا صدقہ ہوگا۔ اس پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ثواب کا مدار تو نیت پر ہے۔ جب درخت لگانے والے نے اس صدقہ کی نیت ہی نہیں کی تو اس کو اس کا اجر و ثواب ملے گا؟ بعض علماء نے اس کا یہ جواب دیا ہے کہ اعمال اختیاریہ کے ثواب کا مدار نیت پر ہے اور اگر کوئی فعل دوسرے فعل کا اتفاقاً سبب بن جائے جس میں اس کے قصد و ارادہ کا دخل نہ ہو تو اس پر بغیر نیت کے بھی اجر مل جاتا ہے۔

علامہ بدرالدین عینیؒ نے اس حدیث کے بارہ میں مزید وضاحت کرتے ہوئے لکھا ہے:

''اور اس حدیث میں یہ بتایا گیا ہے کہ درخت لگانے والے کو اس پر
اجر و ثواب ملتا ہے خواہ اس نے اس ثواب کا ارادہ بھی نہ کیا ہو حتیٰ کہ
اگر اس نے درخت لگایا اور پھر اسے فروخت کر دیا اور کاشت کی اور
اس کو فروخت کر دیا تب بھی یہ اس کے حق میں صدقہ ہو جائے گا اس

لیے کہ اس کا یہ عمل مخلوق خدا کی روزی میں اضافہ کا باعث ہوا۔''

[عمدۃ القاری: ۱۷۱/۵]

امام سرخسیؒ نے مبسوط میں لکھا ہے کہ تقرب الی اللہ کے علاوہ اس امر کا کار خیر ہونا مسلم اور غیر مسلم دونوں کے حق میں یکساں ہے جیسا کہ سرکار دو عالم ﷺ کے اس اثر سے ظاہر ہوتا ہے کہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ حق تعالیٰ شانہ فرماتے ہیں:

﴿عمروا بلادي فعاش فيها عبادي﴾ [المبسوط ۳/ ۱۳۶]

''میری بستیوں کو آباد کرو تا کہ ان میں میرے بندے زندگی گزار سکیں۔''

اسی بارہ میں امام سرخسیؒ فرماتے ہیں:

﴿فلهذا قلنا هذا الفعل حسن من كل احد﴾ [المبسوط ۳/ ۱۳۶]

''پس اس وجہ سے ہم کہتے ہیں کہ یہ عمل (یعنی زراعت) ہر کسی کے ہاتھوں بہتر عمل ہے۔''

امام سرخسیؒ ہی کا بیان ہے کہ سرکار دو عالم ﷺ نے مقام ''جرف'' میں زراعت اور کاشتکاری کی ہے [المبسوط ۲۲/۲] اور تجارت کرنا تو آپ ﷺ کا بہت سی احادیث میں آیا ہے۔ اس وجہ سے معلوم ہوا کہ جس طرح تجارت کرنا سنت ہے ایسے ہی زراعت اور کاشتکاری بھی سنت نبوی ہے۔ صرف اختلاف اس میں ہے کہ تجارت کرنا افضل ہے یا زراعت کرنا، بعض علماء کے نزدیک کاشت کاری کرنا افضل ہے بعض نے کہا کہ ہاتھ کی محنت پر مشتمل کام سب سے افضل ہے۔ بعض نے کہا کہ تجارت سب سے افضل ہے۔ حاکم نے مستدرک میں روایت کیا ہے کہ سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ سرکار دو عالم ﷺ سے پوچھا گیا: ''کون سا پیشہ اور کسب سب سے افضل ہے؟'' آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''جو کام انسان اپنے ہاتھ سے کرے اور ہر جائز بیع'' درحقیقت ان سب میں اضافی فضیلت ہے بعض اعتبار سے کاشت کاری افضل ہے اور بعض اعتبار سے تجارت افضل ہے اور بعض اعتبار سے اجارہ اور صنعت وحرفت افضل ہے۔ امام سرخسیؒ اس بارہ میں تحریر فرماتے

ہیں کہ بعض مشائخ حنفیہ کا قول ہے کہ تجارت اور صنعت وحرفت سے زراعت اور کاشتکاری افضل ہے۔ وجہ اس کی یہ بتائی کہ اس کا نفع عام ہے اور اس کی خیر کثیر ہے اور سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد اور عمل میں ان رکیک خیال لوگوں کا رد ہے جو کاشتکاری اور فن تعمیر کو برا سمجھتے ہیں۔ [المبسوط: ۲۳/۱۴]

علامہ بدرالدین عینیؒ نے بخاری کی شرح میں وہی بات لکھی ہے جو ہم قبل ازیں بیان کر چکے ہیں۔ فرماتے ہیں کہ ''ان تینوں وسائل معیشت کی افضلیت اور اہمیت دراصل ذاتی نہیں ہے بلکہ اضافی ہے۔ وہ اس لیے کہ یہ مخلوق خدا کی فلاح و بہبود اور عام خوشحالی اور رفاہیت کا ذریعہ ہیں لہٰذا جن ممالک میں خام اجناس کی قلت ہو اور وہاں کے طبعی حالات یا ماحول میں زراعت کی زیادہ ضرورت ہو تو وہاں زراعت افضل ہے تاکہ لوگوں کو اس سے نفع عام ہو لیکن اگر کسی جگہ زراعت کے وسائل مفقود ہوں تو وہاں تجارت کو افضلیت اور برتری حاصل ہوگی اور اگر کسی ملک کے باشندوں کو قدرتی اور طبعی طور پر زراعت اور تجارت کے مقابلہ میں صنعت کی زیادہ ضرورت ہو تو وہاں صنعت وحرفت کو فوقیت ہوگی اور یہی بات اور فیصلہ بہتر اور خوب ہے۔'' [عمدۃ القاری: ۵/۱۱۷]

معلوم ہوا کہ ہر سہ وسائل کے باہم راجح اور مرجوح ہونے کا سوال ملکوں کی طبعی حالت اور زمانہ کی ضرورت وحاجات کے پیش نظر ہے نہ کہ کسی ذاتی فضیلت کے پیش نظر ان کی یہ فضیلت اضافی ہے۔

اصل بات یہ ہے کہ ان تینوں وسائل کی جانب ملکی باشندوں کو یکساں توجہ دینی چاہیے کیونکہ یہ تینوں وسائل ہی ملکی ضرورت کیلئے لازمی ہیں۔ ان میں سے جس وسیلہ کی بھی کمی ہوگی ملک کا نقصان ہوگا۔ ملک کی تمدنی حالت اسی صورت میں درست اور مضبوط ہوسکتی ہے جب تینوں وسائل بقدر ضرورت ملک میں موجود ہوں ورنہ ملک کی بربادی یقینی ہے۔ وجہ یہ ہے کہ خام اجناس اور زرعی پیداوار کے بغیر نہ تجارت کو فروغ حاصل ہوسکتا ہے اور نہ صنعت وحرفت ترقی کرسکتی ہے۔ زراعت کی کمی دنیوی تمدنی زندگی کو نہ صرف فاسد بلکہ تباہ و برباد کر دیتی ہے۔ جب قومیں معاشی وسائل کو چھوڑ کر عیش پرستانہ وسائل زندگی اختیار

کر کے ان میں منہمک ہو جاتی ہیں اور سرمایہ دارانہ بلندیوں اور مسرفانہ اور مترفانہ رفاہیت میں باہمی مقابلہ کو اپنی زندگی کا معیار بنالیتی ہیں (جیسا کہ آج کل پاکستان میں ہورہا ہے) تو وہ کبھی بھی اپنی تمدنی زندگی میں پھل پھول نہیں سکتیں اور ان کی یہ عیش کوشی اور مسرفانہ زندگی ان کو جلد ہی لے ڈوبتی ہے اور پھر ان قوموں کا نام صرف تاریخ کے صفحات میں رہ جاتا ہے صفحہ ہستی سے وہ مٹ جاتی ہیں چنانچہ حکیم الامت حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ قدس سرہ نے اس بارہ میں یوں فرمایا:

> ''جب کسی قوم کی اکثریت اور جم غفیر اس قسم کے غیر طبعی اور غیر مفید کسب واکتساب میں منہمک ہو جاتی ہے تو زراعت اور تجارت جیسے وسائل معیشت کو خیر باد کہہ دیتے ہیں اور جب کہ رؤسائے شہر اور امرائے ملک غلط وسائل معیشت پر مال خرچ کرتے ہیں تو ایسے لوگ تمدنی مصالح کو برباد اور تباہ کر دیتے ہیں اور آہستہ آہستہ یہ غلط انہماک ان لوگوں کیلئے باعث مصیبت بن جاتا ہے جو اہم اور ضروری معاشی وسائل کی جانب مشغول ہیں۔ مثلاً کاشت کار، تاجر اور صناع، نیز یہ فاسد انہماک ان پیشہ ور افراد پر بھاری ٹیکسوں کا باعث ہو جاتا ہے اور یہ بات تمدنی زندگی کیلئے اس قدر نقصان دہ ہو جاتی ہے کہ اعضائے جماعت کے ایک عضو سے متعدی ہو کر دوسرے عضو تک پہنچتا ہے اور آہستہ آہستہ تمام افراد قوم میں چچڑی لگنے کی طرح متعدی ہو جاتا ہے۔'' [حجۃ اللہ البالغۃ:۲/۱۰۶]

مختصر یہ کہ تینوں وسائل معیشت اپنی جگہ پر ضروری ہیں لیکن زراعت اپنی ذات میں فرض کفایہ ہے کیونکہ انسان اور حیوان سب ہی اس کے محتاج اور ضرورت مند ہیں۔

صنعتی انقلاب کے بعد دنیا میں ترقی اور خوشحالی کی منزل ان ممالک کو حاصل ہوئی جو صنعتی اور تجارتی تھے۔ اس کے برعکس جو ممالک صرف زرعی تھے انہیں وہ ترقی حاصل نہ ہوئی، لیکن اگر سب ملک ایک دوسرے کے مدد ومعاون ثابت ہوں اور معاشی دست برد کے

ذریعہ ظلم کی راہ نہ کھولیں تو سب قوموں کیلئے یہ بات خوش آئند ہے لیکن موجودہ زمانے میں مختلف ممالک میں باہمی تعاون کے بجائے مناقشت ومنازعت ہے جو قدرت کی فیاضیوں سے زراعتی بھی ہیں اور تجارتی بھی اور صنعتی بھی کیوں کہ اس زمانہ میں زراعتی ممالک صنعتی ممالک کے مقابلہ میں امیر نہیں ہو سکتے۔ مثال کے طور پر پاکستان ایک زراعتی ملک ہے، ہم اگر سارا سال چاول، گندم اور کپاس وغیرہ کاشت کریں اور پھر اپنے ملک کے لوگوں کی بنیادی ضروریات کو بالائے طاق رکھتے ہوئے ان تمام خام اجناس کو ایکسپورٹ اور برآمد کردیں اور اس کے بدلہ میں ہمیں جو زرمبادلہ حاصل ہو امریکہ اور دوسرے مغربی ممالک جو صنعتی وسائل میں ید طولیٰ رکھتے ہیں صرف دس جہاز ہمیں دے دیں تو نہ صرف ہمارا سارا کمایا ہوا زرمبادلہ ہم سے واپس لے لیں بلکہ ہمیں ان کا مقروض بھی ہونا پڑے۔ ان ممالک نے اپنی صنعت وتجارت اور انڈسٹری کے ذریعہ زرعی ممالک کو اپنا غلام بنالیا ہوا ہے اور ان کی صنعت وتجارت کو مفلوج کر کے ان پر معاشی بالادستی حاصل کر لی ہے۔

تجارت سے معاشی ترقی

بہرحال اس بات پر اکثریت کا اتفاق ہے کہ تجارت سب سے افضل ہے کیونکہ اس سے معاشی ترقی حاصل ہوتی ہے، معاشی ترقی سے کیا مراد ہے؟ معاشی ترقی سے عموماً وہ عمل مراد لیا جاتا ہے جس کے نتیجہ میں مجموعی پیداوار یا فی کس آمدنی میں ایک طویل عرصہ کے دوران اضافہ ہو۔ چنانچہ پروفیسر کنڈل برگر (Kindle Bargar) کے مطابق معاشی ترقی سے مراد زیادہ پیداوار کے ساتھ ساتھ فنی اور اداراتی نوعیت کی تبدیلیاں ہیں جن کے ذریعہ یہ پیداوار حاصل کی جاتی ہے اور تقسیم کی جاتی ہے۔

پروفیسر مائر اینڈ بالڈون (Meier and Baldwin) نے معاشی ترقی کی تعریف یوں کی ہے کہ ''معاشی ترقی ایک ایسے عمل کا نام ہے جس کے دوران کسی ملک کی حقیقی آمدنی میں طویل عرصہ کے دوران اضافہ ہوتا ہے اگر حقیقی قومی آمدنی میں اضافہ ملک کی آبادی میں اضافہ سے زیادہ ہو تو فی کس آمدنی میں بھی اضافہ ہو جائے گا بشرطیکہ خط غربت

سے نیچے زندگی بسر کرنے والوں کی تعداد میں اضافہ نہ ہو اور تقسیم دولت مزید خراب نہ ہو۔"

اسلام میں معاشی ترقی کا تصور

اسلام ایک مستقل دین اور مکمل نظام حیات ہے جو انسان کو ایک ایسا ضابطہ حیات عطاء کرتا ہے جس کی روشنی میں ایک قوم یا ایک فرد روحانی اور مادی ترقی کی منزلیں نہایت آسانی کے ساتھ طے کر سکتا ہے۔ دیگر مذاہب جمود کے قائل ہیں لیکن ان کے برعکس اسلام جمود (Static) کا قائل نہیں بلکہ اسلام ایک حرکی (Dynamic) دین ہے جو کہ ہر قسم کے پیش آمدہ حالات اور ہر قسم کے معاملات پر غور فکر کر کے اور قوت اجتہادیہ سے کام لے کر قرآن وسنت کے بنیادی اصولوں کی روشنی میں نیا لائحہ عمل مرتب کرنے کی ترغیب دیتا ہے۔ اسی کو شریعت کی اصطلاح میں اجتہاد کہتے ہیں جس کے ذریعے ہر زمانہ میں مسلمان اپنے لیے راہ عمل مرتب کر سکتے ہیں۔

اسلام کا مقصد انسان کی فلاح ہے۔ فلاح کا یہ تصور نہ صرف اس دنیا کی زندگی بلکہ اخروی زندگی پر بھی محیط ہے اور یہ اصل زندگی تو اخروی زندگی ہے۔ دنیوی زندگی تو پچاس ساٹھ سال ہوگی لیکن اخروی زندگی تو ہمیشہ کی زندگی ہے اور نہ ختم ہونے والی زندگی ہے اور ایک مسلمان کیلئے دنیا اور آخرت دونوں کی زندگی بہتر ہونا ضروری ہے۔ اسی لیے قرآن حکیم میں مومنین کو دعا سکھلائی گئی۔

﴿رَبَّنَا اٰتِنَا فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً وَّ فِي الْاٰخِرَةِ حَسَنَةً وَّ قِنَا عَذَابَ النَّارِ﴾ [بقرہ: ۲۰۱]

"اے ہمارے رب! ہمیں دنیا میں اچھائی عطا فرما اور آخرت میں (بھی) اچھائی عطا فرما اور ہم کو دوزخ کے عذاب سے بچا۔"

بعض حضرات نے لکھا ہے کہ دنیا کی بھلائی سے مراد ہے عافیت، نیک بیوی، علم، عبادت، پاکیزہ اعمال، نیک اولاد، صحت، دشمنوں پر فتح، نیک لوگوں کی رفاقت، اسلام پر ثابت قدمی اور ایمان پر خاتمہ اور آخرت کی بھلائی سے مراد جنت، برے حساب اور محشر کے

خوف سے سلامتی حورعین اور دیدار الٰہی کی لذت ہے۔

بس آخرت کے ساتھ ساتھ اس دنیا کی بھلائیوں اور ترقیوں کا حصول بھی ایک فرد اور بحیثیت مجموعی پورے معاشرہ کی ذمہ داری ہے۔

دینوی زندگی میں فلاح کا حصول معاشی ترقی کے ساتھ منسلک اور وابستہ ہے اس لیے اسلام اپنے ماننے والوں کو معاشی جدوجہد میں حصہ لینے، غربت اور جہالت کا خاتمہ کرنے اور معاشی ترقی کے دیگر عوامل کی تحقیق وافزائش کیلئے بھرپور ترغیب دیتا ہے۔ سرکار دو عالم ﷺ کا ارشاد گرامی ہے:

﴿کادالفقر ان یکون کفراً﴾

[کنز العمال ۲/ ۴۹۲، حلیة الاولیاء، ۳/۵۳، ۱۰۹]

''فقر (غربت) انسان کو کفر کے قریب پہنچا دیتی ہے۔''

چنانچہ غربت کی وجہ سے بعض دفعہ انسان قادیانی یا عیسائی ہو جاتا ہے اور اپنی ایمانی زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھتا ہے شاید اسی وجہ سے سرکار دو عالم ﷺ دعا فرمایا کرتے تھے:

''اے اللہ! میں کفر اور فقر وفاقہ سے تیری پناہ مانگتا ہوں۔''

[ارواء الخلیل رقم:۷۵۲]

یہ نقطہ نظر انسان کو سستی اور تکاسل اور ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہنے سے بچاتا ہے کیونکہ فقر وفاقہ سے بچنے کیلئے ایک طرف تو انسان معاشی جدوجہد کرے گا اور دوسری طرف اللہ تعالیٰ سے کفر کے شر سے محفوظ رہنے کی دعا کرے گا کیونکہ رسول اللہ ﷺ کی متعدد احادیث میں مانگنے اور دوسروں کے سامنے دست سوال دراز کرنے سے منع کیا گیا ہے اور اپنی محنت سے روزی کمانے کا حکم دیا گیا ہے۔

دنیا میں موجود سرمایہ دارانہ نظام معیشت واقتصاد کے مقابلہ میں اسلام کے پیش نظر صرف اور صرف مادی ترقی ہی معاشی ترقی کا مقصود نہیں بلکہ معاشی ترقی کو چند حدود کا پابند کیا گیا ہے۔ اسلام معاشی ترقی کا خواہاں ہے لیکن اس مقصد کے حصول کیلئے معاشرتی،

اخلاقی اور دینی اقدار کی قربانی دینے کیلئے تیار نہیں بلکہ چاہتا ہے کہ جو بھی ترقی ہو وہ ان اقدار کو پیش نظر رکھ کر ہو اور معاشی ترقی کے ساتھ ساتھ معاشرتی اور دینی اقدار میں بھی ترقی ہو اخلاقی اقدار کا پودا سرسبز و شاداب ہو۔ معاشرے کے تمام ادارے مثلاً خاندان، حکومت، کاروبار، مسجد و منبر، مدرسہ اور خانقاہ اور سکول و کالج وغیرہ اپنا بھرپور کردار ادا کریں تا کہ معاشی ترقی کے ساتھ ساتھ معاشرے کا ہر فرد دینی اور روحانی ترقی کی منازل بھی طے کرتا جائے اور تقویٰ اور پاکیزگی کے لحاظ سے بھی افراد میں تنزل کے بجائے ترقی نظر آئے۔

یہی معیار اللہ تعالیٰ نے قرآن حکیم کی اس آیت میں پورا کرنے کی ہدایت کی ہے۔

﴿اِنَّ اَکْرَمَکُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقَاکُمْ﴾

''تم میں اللہ کے نزدیک زیادہ عزت والا وہ ہے جو تم میں زیادہ متقی اور پرہیزگار ہے۔''

نفع کیلئے تجارت کرنے کا حق

اسلام میں ہر شخص کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ اپنے مال اور املاک کو مزید نفع کمانے اور اس طرح اپنی ملکیت اور مال میں اضافہ کرنے کیلئے استعمال کرے۔ وہ اپنے مال سے خود تجارت کر سکتا ہے اور دوسرے کاروباری شخص کے واسطے سے بھی اپنا منشا پورا کر سکتا ہے۔

اسلام نے اس حق کو نہ صرف تسلیم کیا ہے بلکہ اس کی ترغیب بھی دی ہے اور اس کے فضائل اور برکات بھی احادیث میں ذکر کیے گئے ہیں چنانچہ قرآن حکیم میں ہے:

﴿فَاِذَا قُضِیَتِ الصَّلٰوۃُ فَانْتَشِرُوْا فِی الْاَرْضِ وَابْتَغُوْا مِنْ فَضْلِ اللّٰهِ﴾ [جمعه: ۱۰]

''پس جب تمہاری نماز پوری ہو جائے تو زمین میں پھیل جاؤ اور اللہ کے فضل (مال تجارت اور رزق) کو تلاش کرو یعنی حاصل کرو۔''

اس آیت میں طلب رزق اور تجارت کو اللہ کے فضل سے تعبیر کیا گیا ہے اور آیت کا شان نزول ترغیب تجارت پر مبنی ہے۔

قرآن حکیم میں ایک اور مقام پر فرمایا:

﴿لَا تَاْكُلُوْٓا اَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ اِلَّآ اَنْ تَكُوْنَ تِجَارَةً عَنْ تَرَاضٍ مِّنْكُمْ﴾ [النساء: ۲۹]

''اپنے مالوں کو آپس میں باطل طریقوں سے نہ کھاؤ بلکہ باہمی رضامندی کے ساتھ تجارت کی راہ سے نفع حاصل کرو۔''

اس آیت میں ایک لفظ ''بالباطل'' فرما کر تمام ناجائز طریقوں سے حاصل کیے ہوئے مال کو حرام قرار دے دیا۔ پھر ان ناجائز طریقوں کی تفصیلات سرکار دو عالم ﷺ کے حوالہ فرمائیں۔ آپ ﷺ نے ہر ناجائز معاملہ کی تفصیل بیان فرمادی۔

اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ جو تفصیلات ناجائز خرید وفروخت یا ناجائز اجارہ وغیرہ کی رسول ﷺ کی احادیث میں مذکورہ ہیں وہ درحقیقت اس قرآنی حکم کی تشریح ہیں اس لیے وہ سب احکام ایک حیثیت سے قرآن ہی کے احکام ہیں۔ رسول اللہ ﷺ کی احادیث میں جتنے احکام شرعیہ مذکور ہوئے ہیں سب کا عام طور پر یہی حال ہے اس میں کسی نہ کسی قرآنی اشارہ کی تشریح ہے خواہ ہمیں معلوم ہو یا نہ ہو کہ یہ فلاں آیت کی تشریح ہے۔

آیت کے پچھلے جملہ میں ناحق اور ناجائز طریقوں سے کسی کے مال میں تصرف کرنے کو حرام قرار دیا گیا ہے۔ دوسرے جملہ میں جائز طریقوں کو حرمت سے مستثنیٰ کرنے کیلئے ارشاد فرمایا:

﴿اِلَّآ اَنْ تَكُوْنَ تِجَارَةً عَنْ تَرَاضٍ مِّنْكُمْ﴾

''یعنی دوسروں کا وہ مال حرام نہیں جو بذریعہ تجارت باہمی رضامندی سے حاصل کیا گیا ہو۔''

جائز طریقے اگرچہ تجارت کے علاوہ اور بھی ہیں مثلاً عاریت، ہبہ، صدقہ اور میراث وغیرہ لیکن عام طور پر ایک شخص کا مال دوسرے کے تصرف میں آنے کی معروف اور جاری صورت تجارت ہی ہے۔

پھر تجارت کے معنی عام طور پر صرف بیع وشراء کے لیے جاتے ہیں لیکن تفسیر

مظہری میں اجارہ یعنی ملازمت ومزدوری اور کرایہ کے معاملات کو بھی تجارت میں داخل قرار دیا گیا ہے کیونکہ بیع میں تو مال کے بدلہ میں مال حاصل کیا جاتا ہے اور اجارہ میں محنت وخدمت کے بدلہ میں مال حاصل ہوتا ہے، لفظ ''تجارت'' ان دونوں کو حاوی ہے۔

[معارف القرآن: ۲/ ۳۸۷]

دوسرے کا مال حاصل کرنے کی جائز صورتوں میں سے اس آیت میں صرف تجارت کا ذکر کیا گیا ہے۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ کسب معاش کے ذرائع میں سے تجارت اور محنت سب سے افضل اور اطیب ذریعہ معاش ہے۔ چنانچہ سیدنا رافع بن خدیج رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے دریافت کیا گیا کہ کون سی کمائی حلال اور طیب ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

''انسان کے ہاتھ کی مزدوری اور ہر سچی بیع وشراء (جس میں جھوٹ اور فریب نہ ہو)۔''

[رواہ احمد والحاکم، الترغیب والترہیب: ۵/ ۴۱۵، اخرجہ الامام احمد فی المسند ۴/ ۱۴۱، معجم کبیر طبرانی ۴/ ۳۳۰، زوائد المسند رقم ۱۸۶۶، کشف الاستار رقم ۱۲۵۷، مشکل الاثار، طحاوی رقم: ۳۷۸۳]

جو تاجر سودا خریدنے اور سودا فروخت کرنے میں جھوٹ نہیں بولتا بلکہ سچائی اور صدق ودیانت سے کام لیتا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس کے بارہ میں فرمایا:

﴿التاجر الصدوق الامین مع النبیین والصدیقین والشھداء﴾ [رواہ الترمذی]

''سچا اور امانت دار تاجر (قیامت کے روز) انبیاء، صدیقین اور شہداء کے ساتھ ہوگا۔''

اسی مضمون کی ایک اور روایت کے الفاظ یوں ہیں جس کو سیدنا انس بن مالک رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ ''سچ بولنے والا تاجر قیامت کے روز اللہ تعالیٰ کے عرش کے سایہ کے نیچے ہوگا۔'' [الترغیب والترہیب: ۳/ ۵۸۵]

رسول اللہ ﷺ کی ان دونوں احادیث سے یہ معلوم ہوا کہ تجارت میں سچ اور دیانت وامانت کی بڑی اہمیت ہے۔ اگر کسی تاجر میں صدق وراست بازی اور دیانت وامانت نہیں ہے تو وہ اپنے کاروبار میں کامیاب نہیں ہوسکتا۔ چنانچہ ایک اور حدیث میں سرکار دو عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

﴿ان اطیب الکسب کسب التجار، الذین اذا حدثوا لم یکذبوا، واذا ائتمنوا لم یخونوا، واذا وعدوا لم یخلفوا واذا اشتروا لم یذموا، واذا باعوا لم یمدحوا، واذا کان علیهم لم یمطلوا واذا کان لهم لم یعسروا﴾

[الترغیب والترهیب: ۳/ ۵۸۲]

''بہترین پاکیزہ کمائی ان تاجروں کی ہے جو جب بات کرتے ہیں تو جھوٹ نہیں بولتے، جب ان کے پاس امانت رکھی جاتی ہے تو وہ اس میں خیانت نہیں کرتے، جب وعدہ کرتے ہیں تو وعدہ خلافی نہیں کرتے اور خریدتے وقت اس شے کی مذمت نہیں کرتے (تاکہ فروخت کرنے والا اسے ناقص سمجھ کر قیمت کم کر کے دے دے) اور جب وہ خود کوئی چیز فروخت کرتے ہیں تو اس کی بہت زیادہ تعریف نہیں کرتے (تاکہ قیمت زیادہ ملے) اور اگر ان کے ذمہ کسی کا کچھ نکلتا ہو تو ٹال مٹول نہیں کرتے اور اگر خود ان کا کسی کے ذمہ نکلتا ہو تو اس کو وصول کرنے میں تنگ نہیں کرتے یعنی اتنا اصرار نہیں کرتے کہ دینے والا تنگ آجائے۔''

اسی چیز کو ایک اور روایت میں سیدنا ابوامامہ رضی اللہ عنہ نے یوں بیان فرمایا ہے کہ سرکار دو عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

﴿ان التاجر اذا کان فیه اربع خصال طاب کسبه، اذا اشتریٰ لم یذم، واذا باع لم یمدح ولم یدلس فی

﴿البیع ولم یحلف فیما بین ذالک﴾

[ترغیب وترھیب: ۳ / ۵۸۶]

''بیشک جب کسی تاجر میں چار چیزیں آ جائیں تو اس کی کمائی پاک اور طیب ہو جاتی ہے۔ پہلی یہ کہ جب وہ کوئی چیز خریدے تو اس شے کی مذمت نہ کرے، دوسری جب وہ کوئی شے فروخت کرے تو اپنی چیز کی بہت زیاد تعریف نہ کرے تیسری بیچنے میں کوئی گڑ بڑ نہ کرے اور خرید و فروخت میں قسم نہ کھائے۔''

ایک حدیث میں سرکار دو عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''بے شک تاجر لوگ فاجر ہیں، بے شک تاجر لوگ فاجر ہیں۔'' ایک شخص نے پوچھا ''یا رسول اللہ! کیا خرید و فروخت اللہ تعالیٰ نے حلال نہیں کی؟'' آپ نے فرمایا: ''ہاں خرید و فروخت تو بالکل حلال ہے لیکن یہ وہ لوگ ہیں۔

﴿انھم یقولون فیکذبون، ویحلفون ویأثمون﴾

''جو بات کرتے ہیں تو جھوٹ بولتے ہیں اور جب قسم اٹھاتے ہیں تو جھوٹی اٹھاتے ہیں۔''

[مسند احمد بن حنبل: ۳/۴۴۴، زوائد المسند رقم ۱۸۸۱، مجمع الزوائد ۴/۸۶]

ایک مرتبہ رسول اللہ ﷺ نے تاجروں کو مخاطب کر کے فرمایا:

﴿ان التجار یبعثون یوم القیامة فجاراً الا من اتقی وبرو صدق﴾

''بے شک تاجر لوگ قیامت کے روز فسق و فجور میں اٹھیں گے مگر وہ جنہوں نے تقویٰ اختیار کیا ہوگا یعنی کسی سے دھوکہ نہ کیا ہوگا اور اچھے طریقے سے تجارت کی ہوگی اور سودا بیچتے وقت صدق و دیانت سے کام لیا ہوگا۔''

[ابن ماجہ ۲۱۴۶، سنن کبریٰ بیہقی: ۵/۲۶۶، ابن حبان ۱۱/۲۷۶، مصنف عبد الرزاق ۱۱/

۴۵۸، مستدرک حاکم ۲/ ۶، سنن الدارمی ۲/ ۱۶۳، معجم کبیر طبرانی، ۵/ ۳۶، حلیۃ الاولیاء، لابی نعیم ۷/ ۱۱۴]

سیدنا حکیم بن حزام رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

﴿البیعان بالخیار مالم یتفرقا. او قال: حتی یتفرقا، فان صدقا و بینا بورک لهما فی بیعهما، و ان کتما و کذبا محقت برکة بیعهما﴾ [رواہ البخاری، رقم ۲۰۷۹، مسلم ۳۸۳۶، الترغیب والترهیب ۳/ ۵۸۶]

خرید وفروخت کرنے والوں کو بیع توڑنے کا حق ہے جب تک کہ وہ اپنی جگہ سے نہ ہٹیں اگر خریدار اور فروخت کنندہ (بائع ومشتری) صدق بیان سے کام لیں اور مال اور قیمت کے عیب اور کھرے کھوٹے ہونے کو بیان کردیں تو ان کی بیع میں برکت ہوتی ہے اور اگر وہ مال کے عیب کو چھپالیں اور مال کے جھوٹے اوصاف بتائیں تو شاید کچھ نفع کمالیں لیکن بیع کی برکت ختم کردیتے ہیں۔

(بخاری میں یہ حدیث تھوڑے سے الفاظ کے اختلاف کے ساتھ کئی جگہ مروی ہے، ملاحظہ ہو رقم ۲۰۸۲، رقم ۲۱۰۸، ۲۱۱۰، ۲۱۱۴، واخرجہ ابوداؤد رقم ۳۴۵۹، ترمذی رقم ۱۲۴۶، نسائی رقم ۴۴۲۹، ۴۴۷۶)۔

ایک اور روایت سعید بن منصور نے اپنی سنن میں روایت کی ہے کہ نعیم بن عبدالرحمٰن اور یحییٰ بن جابر نے مرسلاً نقل کیا ہے۔

﴿تسعة اعشار الرزق فی التجارة والعشر فی المواشی یعنی انتاج،﴾ [التراتیب الاداریہ ۲/ ۱۰]

''نو حصے رزق تجارت میں ہے ایک حصہ جانوروں کی پرورش وپرداخت میں ہے۔''

﴿قال المناوی رجاله ثقات﴾

امام دیلمی نے سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے کہ

﴿اوصیکم بالتجار خیراً فانهم برد الافاق وامناء الله فی الارض﴾ [التراتیب الاداریه ۲/ ۱۱]

فرماتے ہیں کہ میں تمہیں تاجروں کے ساتھ خیر کے برتاؤ کی وصیت کرتا ہوں کیونکہ یہ لوگ ڈاکیے اور زمین میں اللہ کے امین ہیں۔

سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں عجمی غلام جو کہ سرخ رنگ کے ہوتے تھے تجارت کرتے تھے اور عرب تجارت کو اچھا نہیں سمجھتے تھے۔ امام مالکؒ فرماتے ہیں کہ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا:

﴿علیکم بالتجارة لاتفتنکم هذه الحمراء علیٰ دنیاکم﴾ [التراتیب الاداریه: ۲ / ۲۰]

''تجارت کو ضروری سمجھو، ایسا نہ ہو کہ یہ سرخ لوگ (عجمی غلام) تمہاری دنیا پر امتحان بن جائیں۔''

کتابوں میں لکھا ہے کہ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ اپنے زمانہ خلافت میں ایک مرتبہ بازار تشریف لائے۔ بازار میں انہوں نے دیکھا کہ تجارت کرنے والے عموماً باہر کے لوگ اور عوام الناس ہیں۔ یہ دیکھ کر آپ غمگین ہوئے جب خاص خاص لوگ اکٹھے ہوئے تو سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے ان سے یہ بات بیان کی۔ لوگوں نے امیر المومنین کی یہ بات سن کر عرض کی کہ اللہ تعالیٰ نے فتوحات اور مال غنیمت کی وجہ سے تجارت کرنے سے ہم کو مستغنی کر دیا ہے۔ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ''اگر تم لوگ ایسا کرو گے تو تمہارے مرد ان کے مردوں کے اور تمہاری عورتیں ان کی عورتوں کی محتاج ہو جائیں گی۔''

علامہ عبدالحیٔ کتانیؒ فرماتے ہیں کہ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کی فراست اس امت کے بارہ میں بالکل درست ثابت ہوئی کیونکہ جب اس امت نے مشروع طریقہ سے تجارت کو خیر باد کہہ دیا تو اس کو غیروں نے اختیار کرلیا اور امت مسلمہ غیر مسلموں کی محتاج ہو کر رہ گئی اور یہ چھوٹی سے چھوٹی چیز سے لے کر بڑی سے بڑی چیز تک دوسروں کے محتاج ہو گئے۔

[التراتیب الادرایہ:۳/۲۱]

رسول اللہ ﷺ نے تجارت کیلئے جہاں صدق و دیانت کا ذکر فرمایا وہاں اس بات کا بھی ذکر فرمایا کہ ایک تاجر شخص کو صبح صبح اٹھ کر تجارت کی تیاری کرنا چاہیے۔ اگر تجارت کا کام چل گیا تو بجائے صبح اٹھنے کے دیر سے اٹھنا تجارت سے برکت کو اٹھا لیتا ہے۔ حدیث میں رسول اللہ ﷺ کی یہ دعا کئی صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے مختلف کتابوں میں منقول ہے۔

﴿اللھم بارک لامتی فی بکورھا﴾

[ترمذی رقم ۱۲۱۲، ابوداؤد رقم ۲۹۰۶، ابن ماجہ رقم ۲۲۳۶، ابن حبان: ۱۱/۶۲، شرح السنہ ۱۱/۱۹، دارمی ۲/۲۱۴، مسند احمد ۳/۴۱۶]

''اے اللہ میری امت کے صبح ہی صبح کام میں برکت عطا فرما۔''

یہ حدیث صخر الغامدی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے اور اس بارہ میں اور بھی کئی صحابہ کرامؓ سیدنا علیؓ، سیدنا عبداللہ بن مسعودؓ، سیدنا بریدہؓ، سیدنا انسؓ، سیدنا عبداللہ بن عمرؓ، سیدنا عبداللہ بن عباسؓ اور سیدنا جابر بن عبداللہؓ وغیرہ سے روایات مروی ہیں۔ سیدنا صخرؓ کا یہ قول بھی امام ترمذیؒ نے نقل فرمایا ہے کہ سرکار دو عالم ﷺ جب بھی کوئی لشکر روانہ فرماتے تو صبح ہی کو روانہ فرماتے تھے اور سیدنا صخر رضی اللہ عنہ خود بھی تاجر تھے وہ جب اپنے ملازمین کو تجارت کیلئے بھیجتے تو صبح ہی کو بھیجتے۔ چنانچہ انہیں تجارت میں خوب نفع ہوا اور ان کی تجارت میں بڑا اضافہ ہوا۔

اس روایت کی تفصیل کیلئے ملاحظہ ہو:

[مسند احمد ۱/۱۵۴، ۱۵۲، ۳/۴۱۶، ۱/۷، ۴۳۲، ۴/۳۸۴، ۳۹۰، ۳۹۱، زیادات المسند ۱/۱۵۳، ۱۵۴، زوائد المسند رقم ۱۸۶۹، کشف الاستار رقم ۱۲۴۸، ۱۲۴۹، معجم کبیر طبرانی رقم ۱۰۴۹۰، مسند ابی یعلی موصلی رقم ۵۴۰۶، ۵۴۰۹، ۴۶۲۷ وغیرہ]

نبی اکرم ﷺ نے تو تجارت اور خرید و فروخت کی یہاں تک ترغیب دی کہ سیدنا سعد بن حریث رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

﴿من باع عقاراً او دارا ولم یجعل ثمنھا فی مثلھا لم یبارک لہ﴾ [ابن ماجہ رقم ۲۴۹۰۔۲۴۹۱، سنن کبریٰ بیہقی ۶/۳۳، مسند احمد

۴/ ۳۰۷، مجمع الزوائد ۴/ ۱۱۱، کنز العمال ۳/ ۵۰]

''جس شخص نے زمین یا کوئی مکان فروخت کیا اور اس کی قیمت کو اسی جیسی کسی دوسری جائیداد میں نہیں لگایا اس کیلئے برکت نہیں۔''

رسول اللہ ﷺ کی اسی ترغیب کی وجہ سے اکثر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم تجارت کرتے تھے۔ سیدنا ابوبکرؓ، سیدنا عمرؓ اور سیدنا عثمانؓ وغیرہ تو پہلے ہی تاجر تھے اور اسی تجارت سے کمایا ہوا مال ان کے اسلام لانے کے بعد اسلام کے کام آیا جیسا کہ ہم نے ان کی سیرت کی کتابوں میں تفصیل سے ذکر کیا ہے۔ التراتیب الاداریہ میں ان صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی ایک فہرست دی گئی ہے۔ اسی کتاب میں سیدنا سعد بن عائذ موذن کی تجارت کا بھی ذکر ہے یہ سیدنا عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ کے آزاد کردہ غلام تھے۔ یہ قرظ کی تجارت کرتے تھے۔ قرظ ایک خاص قسم کے پتے تھے جن سے جانوروں کی کھالوں کو رنگا جاتا تھا۔ اسی تجارت کی وجہ سے ان کا نام ''سعد القرظ'' پڑ گیا تھا۔ (الاصابہ) روایت میں ہے کہ انہوں نے ایک مرتبہ سرکار دو عالم ﷺ سے اپنی تنگ دستی کی شکایت کی۔ آپ ﷺ نے انہیں تجارت کرنے کا حکم فرمایا۔ چنانچہ وہ بازار گئے اور تھوڑی سی قرظ خریدی، پھر اسے فروخت کیا جس سے نفع ہوا۔ اس نفع کا تذکرہ انہوں نے رسول اللہ ﷺ سے کیا۔ آپ ﷺ نے حکم فرمایا کہ اسی کی تجارت کرتے رہو۔

ان تمام روایات سے معلوم ہوا کہ اسلام نے تجارت کی بہت ترغیب دی ہے اور قومیں تجارت ہی سے ترقی یافتہ بنتی ہیں۔ اسی وجہ سے اسلام نے تجارت پر زور دیا اور رسول اللہ ﷺ نے ہر طریقہ سے اس کی ترغیب دی۔ اسلام یہ کسی صورت پسند نہیں کرتا کہ کوئی شخص بیکار بیٹھ کر کھائے۔ چنانچہ روزی کمانے کو بھی اس نے عبادت میں شمار کیا ہے۔ سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

﴿طلب الحلال فریضة بعد الفریضة﴾

[مجمع الزوائد ۱۰/ ۲۷۷، معجم کبیر طبرانی رقم، ۸۶۰۸]

''رزق حلال حاصل کرنا فرائض کے بعد ایک فریضہ ہے۔''

اسی وجہ سے اسلام نے کام کرنے پر زور دیا اور کسب رزق میں سب سے اچھا ذریعہ تجارت کو قرار دیا۔ سرمایہ یا مال اور جائیداد کو تجارتی، صنعتی یا زرعی کاروبار میں لگانے کے علاوہ اپنی منقولہ یا غیر منقولہ املاک کو کرایہ پر دینا بھی نفع آور کاروبار کی ایک جائز شکل قرار دیا گیا ہے۔

تجارت سے نفع کمانے کا ذریعہ زیادہ مال کا نقد سرمایہ ہوتا ہے۔ تاریخی طور پر نقد سرمایہ کو نفع آور کاموں میں لگانے کی چار شکلیں پائی جاتی رہی ہیں۔

(۱) اپنے سرمایہ سے خود تجارت کرنا اور اس سے ہونے والے نفع کو اپنا سمجھنا۔

(۲) کسی شخص کی تجارت یا کاروبار میں سرمایہ کے ساتھ شریک ہو جانا اور طے شدہ منافع کے مطابق حصہ دار بن جانا۔

(۳) خود کاروباری عمل اور تجارت میں حصہ نہ لینا بلکہ سرمایہ کو اس شرط پر کسی تاجر یا کاروباری کے سپرد کر دینا کہ وہ نفع کا ایک حصہ مالک کو دے۔

(۴) سرمایہ کو متعین شرح پر سود پر قرض دینا۔

سرمایہ کو نفع آور کاموں میں لگانے کی بعض جدید شکلیں اور بھی ہیں جیسے کمپنیوں کے حصے خریدنا یا سرکاری بانڈز (Bonds)، تمسکات (Securities) اور سیونگ سرٹیفکیٹ (Saving certificates) خریدنا بھی ہے۔ اگرچہ ان میں سے بعض شرعی طور پر سود کی وجہ سے ناجائز ہیں۔

پہلی شکل کو ذاتی کاروبار کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ یہ نفع کمانے اور تجارت کرنے کی ابتدائی اور فطری شکل ہے اور عام طور پر لوگ تجارت کے اس طریقے کو درست اور صحیح سمجھتے ہیں کیونکہ یہ نفع مالک کا اپنا کمایا ہوا نفع ہے۔

تجارت شروع کرنے سے پہلے ہر تاجر کو چند بنیادی اہمیت رکھنے والے فیصلے کرنے ضروری ہیں۔

(۱) وہ اپنا سرمایہ کس تجارت میں لگائے؟

(۲) کس چیز کی تجارت کرے؟

(۳) کس معیار کا سامان رکھے؟

(۴) کس مقدار میں رکھے؟

(۵) اپنی دکان یا دفتر کہاں قائم کرے؟

(۶) کس بازار یا شہر یا ملک میں اپنا مال فروخت کرے؟

یہ فیصلے اسے حال میں کرنے ہوتے ہیں جب کہ اس کا مال ایک عرصہ کے بعد مستقبل میں فروخت ہونا ہوتا ہے اس کی تجارت کی آمدنی کا انحصار اس قیمت پر ہے جس پر یہ مال مستقبل میں فروخت کیا جاسکے گا۔ اس قیمت کا انحصار اس وقت کے حالات، طلب اور اس مال کی مجموعی رسد پر ہے جس کا تعین قبل از وقت نہایت مشکل ہے۔

ایک کاروباری اور تاجر کی پوری پوری کوشش ہوتی ہے کہ وہ لاگت اور قوت خرید کو کم سے کم رکھے اور تیار شدہ مال کو اور قیمت فروخت کو زیادہ رکھے لیکن معاشیات کا طالب علم جانتا ہے کہ اس کی کوشش کی کامیابی کا پیمانہ بہت محدود ہے کیونکہ بازار کی قوتیں اور مسابقت کا عمل ایک کاروباری فرد کے لیے فیصلہ کن حیثیت رکھتا ہے لہٰذا حدود کے اندر رہتے ہوئے ایک کاروباری فرد اور تاجر کی پوری کوشش ہوتی ہے کہ وہ اپنا مال تیار کرنے کے لیے پیداوار کے ایسے طریقے استعمال کرے کہ لاگت کم سے کم آئے اور اس کی قیمت خرید قیمت فروخت سے کم سے کم ہو۔

یہ بات ہر شخص کے علم میں ہے کہ کاروبار میں نفع اور نقصان سے مفر نہیں۔ ایک کاروباری فرد اور تاجر سے اس بات کا مطالبہ نہیں کیا جاسکتا کہ وہ بہر صورت اپنے مال کو لاگت کے مساوی قیمت پر فروخت کرے۔ بعض حالات میں جبکہ طلب اس تاجر کی توقع سے کم ہوگئی ہو اور صارفین (Consumers) اس مال کو اس قیمت پر خریدنے کو تیار نہیں ہوں گے۔ اس صورت میں ایک تاجر اس بات پر مجبور ہوگا کہ مال کو لاگت سے کم داموں پر فروخت کر کے اپنے سرمایہ کا جو کچھ حصہ بھی بازیافت کرسکتا ہے کرلے۔ معاشرہ ایک تاجر کو اس بات کی ضمانت نہیں دے سکتا کہ اس کا مال لاگت کے داموں ضرور فروخت ہوجائے گا اور اسے کبھی خسارہ یا نقصان نہیں اٹھانا پڑے گا۔ اس حقیقت کے پیش نظر اگر حالات طلب

تاجر کی توقع کے مطابق یا اس سے کچھ زیادہ موافق ثابت ہوں اور اس کے لیے یہ ممکن ہو کہ لاگت اور قیمت خرید سے زیادہ داموں پر مال فروخت کر کے نفع کمائے تو اس سے اس بات کا مطالبہ نہیں کیا جا سکتا کہ وہ ایسا نہ کرے بلکہ لاگت اور قیمت خرید کے مساوی قیمت لینے پر اکتفا کرے۔

تجارت اور کاروبار میں ایک بات کو ایک اچھی خاصی اہمیت حاصل ہے کہ جب خارج کی کسی تبدیلی یا ذاتی غور و فکر اور مشاہدہ و تجربہ کی بناء پر مستقبل کے بارہ میں قائم کیے ہوئے اندازوں میں ترمیم و تبدیلی ہو تو اپنے کاروباری فیصلوں میں اسی مناسبت سے ترمیم و تبدیلی عمل میں لائی جائے اور نہایت پھرتی اور عجلت سے لائی جائے۔ مختلف افراد کے اندر پھرتی کے ساتھ نئے فیصلے کرنے کی صلاحیت ایک جیسی نہیں ہوتی۔

اسی طرح ایک فیصلہ کر لینے کے بعد اسے پوری طرح نافذ کرنا اور ایسے وقت پر نافذ کرنا تا کہ اس سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھایا جا سکے تجارت کی کامیابی کیلئے ضروری ہے۔ مختلف کاروباری افراد کے اندر یہ صلاحیت بھی یکساں نہیں ہوتی جن کے اندر یہ صلاحیتیں دوسرے افراد سے زیادہ ہوتی ہیں وہ نسبتاً زیادہ کامیابی کے ساتھ تجارت کر سکتے ہیں اور زیادہ نفع کما سکتے ہیں۔

عہد رسالت کے تجارتی بازار

رسول اللہ ﷺ کے عہد رسالت میں مکہ مکرمہ اور اس کے گردونواح میں بہت سے بازار لگا کرتے تھے جن میں لوگ اپنے مال کی خرید وفروخت کرتے تھے گویا وہ بازار تجارت کا ایک بہت بڑا مرکز تھے اور دور دور سے لوگ وہاں آ کر اپنا مال فروخت کرتے تھے۔ان بازاروں میں مشہور درج ذیل ہیں۔

(۱) سوق عکاظ:

ان بازاروں میں سب سے بڑا بازار ''سوق عکاظ'' تھا۔عکاظ کا یہ بازار اور جزیرہ عرب کے دوسرے بازار عربوں کی تجارت اور شان وشوکت کے مظہر ہوتے تھے۔ یہ بازار دراصل بہت بڑا میلہ ہوتا تھا جس میں مختلف قبائل، مختلف اغراض کے لیے کثرت سے شریک ہوتے تھے۔بعض کا مقصد تجارت ہوتا،بعض اپنے اشعار کی تشہیر کے لیے آتے اور بعض اپنے کرتب دکھانے وہاں آتے تھے۔ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کے بارہ میں بھی تاریخ میں آتا ہے کہ جب آپ نے لڑکپن کی منزلیں طے کر کے جوانی میں قدم رکھا تو شرفائے عرب کے تمام مشغلوں میں سے آپ کا گزر ہوا۔ چنانچہ ابھی عنفوان شباب ہی تھا کہ انہوں نے جسمانی ورزشوں میں مہارت پیدا کر لی۔سوق عکاظ کے میلہ میں عرب کے پہلوان اور شہ سوار اپنے اپنے کرتب دکھانے کیلئے ہر سال آتے۔سیدنا عمر رضی اللہ عنہ بھی اس میلے میں اپنی پہلوانی اور شہ سواری سے لوگوں کو محظوظ کرتے اور یہ کبھی دیکھنے میں نہیں آیا تھا کہ انہوں نے کبھی کسی پہلوان یا شہ سوار سے مات کھائی ہو۔ چنانچہ ایک دفعہ اسی عکاظ کے میلے میں ایک نوجوان پہلوان عرب کے کسی حصہ سے اپنی پہلوانی کے جوہر دکھانے کے لیے آیا اس نے تمام پہلوانوں کو پچھاڑ دیا۔ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ اپنے کچھ دوستوں کے ساتھ اس میلے میں گئے ہوئے تھے۔ آپ بلند قامت تھے اس وجہ سے تیز رفتار بھی تھے آپ کے دوستوں نے ان کی تیز رفتاری میں سستی پیدا کرنے کے لیے اس پہلوان کا ذکر چھیڑ دیا جس نے اس میلے میں

اپنی پہلی آمد ہی میں تمام پہلوانوں کو پچھاڑ دیا تھا۔ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے جب اس نئے پہلوان کا نام سنا تو ان کی آنکھیں سرخ ہو گئیں اور آواز میں شدت اور کرختگی پیدا ہو گئی۔ اور غیظ وغضب کے آثار ان کے چہرہ پر جھلکنے لگے۔ انہوں نے ایک گہرا سانس لے کر اپنی مونچھوں کو تاؤ دیا اور کہا۔

''تم مجھے اس لونڈے سے ڈراتے ہو، میں خطاب کا بیٹا ہوں اگر ہاتھ ملتے ہی اسے زمین پر نہ دے ماروں تو میرا نام عمر نہیں۔''

یہ کہہ کر آپ تیزی کے ساتھ اس اکھاڑے کی طرف چلے گئے جہاں کشتیاں ہو رہی تھیں جب آپ اپنے ساتھیوں کے ساتھ اکھاڑے میں پہنچے تو آپ کو دیکھ کر تمام لوگوں نے راستہ چھوڑ دیا اور اکھاڑہ میں کشتی لڑنے والے بھی الگ الگ ہو کر تماشائیوں کے ساتھ کھڑے ہو گئے کیونکہ انہیں یقین تھا کہ عمر تماشا دیکھنے نہیں بلکہ کشتی لڑنے آیا ہے۔ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کے چہرہ پر ابھی تک غصے کے آثار نمودار تھے۔ آپ نے اکھاڑے میں کھڑے ہو کر تمام حاضرین پر ایک نگاہ دوڑائی۔ پھر اس نوجوان پہلوان کو سر سے لے کر پاؤں تک دیکھا جس کے بارہ میں راستہ میں ساتھیوں نے بات کی تھی۔ عمر نے اسے مقابلہ کی دعوت دی۔ نوجوان پہلوان مسکراتا ہوا آگے بڑھا اور اکھاڑے کے وسط میں کھڑا ہو گیا۔ گویا اس نے عمر رضی اللہ عنہ کی دعوت کو قبول کر لیا۔ اسے اپنے اوپر پورا اعتماد اور اپنی جسمانی طاقت اور فن کشتی پر پورا بھروسہ تھا لیکن اس نے عمر رضی اللہ عنہ سے اس سے پہلے کبھی کشتی نہیں لڑی تھی۔ وہ عمر رضی اللہ عنہ کی طاقت اور ہمت سے آشنا نہیں تھا۔ وہ اپنے قبیلے کے ساتھ سوق عکاظ کے میلے میں آیا تھا لیکن اس پہلی بار ہی میں وہ ہر مقابلہ میں کامیاب رہا تھا اور سوق عکاظ کا ہر پہلوان اس کی ہمت و جرأت کا لوہا مان چکا تھا۔ مختلف مقابلوں میں کامیابی حاصل کرنے کے بعد اس کا دل بڑھا ہوا تھا وہ قامت و جسامت میں بھی عمر رضی اللہ عنہ کے قریب قریب ہی تھا۔ ادھر سے عمر رضی اللہ عنہ آگے بڑھے اور ادھر سے وہ بڑھا اور دونوں میں کشتی شروع ہو گئی۔ مرد تو مرد آس پاس کی لڑکیاں بھی اکٹھی ہو گئیں کیونکہ وہ اس سے قبل اس بدوی نوجوان کی پھرتی اور داؤ پیچ دیکھ چکی تھیں۔ چنانچہ اس کشتی کو دیکھنے کے لیے اتنے تماشائی جمع ہو گئے جو اس سے پہلے کبھی نہ

ہوئے تھے۔اب ہر شخص کو اس کشتی کے فیصلے کا انتظار تھا۔گزشتہ مقابلوں میں عمر رضی اللہ عنہ کو کبھی ناکامی کا منہ نہیں دیکھنا پڑا تھا۔جب سے یہ بدوی نوجوان آیا تھا یہ بھی اپنے حریفوں کو برابر پچھاڑ رہا تھا۔اس وجہ سے لوگوں کے ذہنوں میں یہ خیال آنے لگا تھا کہ شاید وہ عمر رضی اللہ عنہ کو بھی پچھاڑ دے۔مقابلہ کانٹے دار تھا اس وجہ سے دونوں طرف سے شرطیں بھی بندھی جا چکی تھیں۔

شروع میں تو عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے حریف کو زور آزمائی کا پورا موقع دیا اور خود وہ اس کے داؤ پیچ سے اپنا بچاؤ ہی کرتے رہے لیکن جب تھوڑی دیر کے بعد دیکھا کہ اس بدوی نوجوان کا سانس پھول گیا ہے تو آپ ایک دم شاہین کی طرح جھپٹ کر اس کے کندھوں پر سوار ہو گئے اور پھر نہایت پھرتی سے اسے زمین پر چاروں شانے چت گرا دیا۔اس بدوی نوجوان کا زمین پر گرنا تھا کہ چاروں طرف سے تحسین وآفرین کے ڈونگرے برسنے لگے اور پوری فضا مرحبا کے نعروں سے گونج اٹھی اور ہر دیکھنے والا مرد اور عورت حتیٰ کہ نوجوان لڑکیاں بھی اس نجیب الطرفین قریشی نوجوان عمر رضی اللہ عنہ کی تعریف وتوصیف کرنے لگیں اور فن پہلوانی کے اس کے گزشتہ کمالات بھی دہرائے جانے لگے۔[کتاب الاغانی:۲/۱۲۵]

سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کا یہ واقعہ ہم نے اس لیے نقل کیا ہے تاکہ پتہ چل جائے کہ سوق عکاظ میں صرف تجارت ہی نہ ہوتی تھی بلکہ فن پہلوانی کے کرتب بھی دکھائے جاتے تھے۔ عکاظ کے اس میلہ میں جلسے بھی منعقد ہوتے تھے جن پر ہر قبیلہ والے اپنے شعراء پیش کرتے اور وہ شعراء اپنے اشعار میں اپنی بڑائی اور اپنے آباء واجداد کے مناقب ومفاخر بیان کرتے تھے۔پھر ان اشعار پر تنقید یا تحسین وداد کا سلسلہ شروع ہوتا تھا۔کسی قبیلہ کے مفاخر اور مناقب کے اظہار کیلئے سب سے مؤثر اور بڑا ذریعہ شعر سمجھا جاتا تھا۔گویا یہ اس زمانہ کا ایک میڈیا تھا۔اس لیے ہر قبیلہ اپنے شاعر کی بادشاہ کی طرح تعظیم کرتا تھا گویا اس زمانہ میں شاعر بے تاج بادشاہ ہوتا تھا۔

سبع معلقات مشہور قصائد اسی سوق عکاظ میں عظیم فصاحت وسلاست وبلاغت کی وجہ سے عکاظ کے ایک خاص حصے میں لٹائے گئے تھے۔بازار عکاظ کا انتخاب آج بھی

مسلم ہے اور آج تک یہ سات قصائد ابلغ، افصح اور احسن شمار ہوتے ہیں۔

اسی طرح خطباء و فصحائے عرب اپنے خطبوں میں اپنے قبائل کی تعریف کرتے ہوئے اپنی فصاحت و بلاغت پر اتراتے تھے۔ چنانچہ ان جلسوں میں خطیبوں کے مقابلے بھی ہوتے تھے تاہم نثر کے مقابلے میں نظم کا چرچا زیادہ تھا۔ سوق عکاظ خصوصاً اور دیگر بازار عموماً لغت عربیہ کی فصاحت و بلاغت کی تہذیب و تنقیح اور عظمت کا منبع تھے۔

[ملاحظہ ہو دائرۃ المعارف لفرید وجدی ۶/ ۵۳۵، تاج العروس ۵/ ۲۵۴، لسان المیزان، ۹/ ۴۴۷، ابن خلدون ۱/ ۶۴۲ وغیرہ]

بازار عکاظ کے محل وقوع اور زمانہ انعقاد میں متعدد اقوال ہیں۔ مورخ ابن حبیب نے لکھا ہے کہ عکاظ عرفات کے قریب ہے۔ [محبر ص ۲۶۷] بعض مورخین کی رائے میں عکاظ ایک نخلستان کا نام ہے جو طائف سے ایک رات اور مکہ مکرمہ سے تین رات کے فاصلہ پر واقع ہے۔ اسی مقام پر یہ بازار اور میلہ لگتا تھا۔ [تاریخ العرب: ۷/ ۳۷۸]

[ملاحظہ ہو مراصد الاطلاع ۲/ ۹۵۳، اخبار مکہ ازرقی ۲/ ۳۹۶، تاج العروس ۵/ ۲۵۵]

سوق عکاظ کا انعقاد ہر سال ۱۵ ذی قعدہ سے آخر ذی قعدہ تک ہوتا تھا۔ ابن حبیب نے لکھا ہے کہ سوق رابیہ اور سوق عکاظ دونوں ایک ہی روز یعنی نصف ذی قعدہ سے شروع ہوتے تھے۔ رابیہ مکہ مکرمہ سے بہت دور ایک مقام کا نام ہے۔ رابیہ تک پہنچنا مشکل تھا [کتاب المحبر ص ۲۶۷] لیکن بعض اہل تاریخ سوق عکاظ یکم ذی قعدہ سے ۲۰ ذی قعدہ تک جاری رہنا لکھتے ہیں۔

[تفصیل کے ملاحظہ ہو مراصد الاطلاع ۲/ ۹۵۳، صبح الاعشی ۱/ ۴۱۰، الازمنۃ والامکنۃ ۲/ ۱۲۵، الیعقوبی ۱/ ۲۳۶، مفصل فی تاریخ العرب ۷/ ۳۷۸]

بعض علماء کے نزدیک یہ بازار شوال میں لگتا تھا محققین کے نزدیک یہ قول صحیح نہیں ہے۔ [بلوغ الارب ۱/ ۲۷۰، الاغانی، ۹/ ۱۷۶، العقد الفرید ۳/ ۳۷۷، ابن اثیر ۱/ ۳۵۸]

عرب کے عام بازاروں میں بازار کے نگران تاجروں سے باقاعدہ ٹیکس وصول کرتے تھے۔ جیسا کہ آج کل یورپ وغیرہ میں مارکیٹوں سے ٹیکس لیا جاتا ہے۔ اس ٹیکس کو

عربی میں ''عشور'' کہتے ہیں۔ اسی طرح بازاروں تک پہنچنے اور واپسی کیلئے ''خفارہ'' کی ضرورت ہوتی تھی۔ خفارہ کے معنی ہیں حفاظت کی ذمہ داری، راستے میں متعدد قبائل شرکاء کی حفاظت اور بخیریت پہنچنے کی ذمہ داری لیتے تھے تاکہ چوروں اور ڈاکوؤں سے وہ شرکاء محفوظ ومصؤن رہیں۔ اس کے برعکس سوق عکاظ میں نہ عشور تھا اور نہ خفارہ کی ضرورت۔ یہ ایک محفوظ مقام تھا اور اشہر حرم کی وجہ سے کسی کا خطرہ نہ تھا۔ عکاظ میں ہر قسم کی تجارت ہوتی تھی یعنی چمڑے، غلہ، کپڑوں، جانوروں اور غلاموں اور باندیوں وغیرہ مختلف اشیاء کی خرید وفروخت ہوتی تھی۔ چمڑے کی تجارت اس بازار میں بہت زیادہ ہوتی تھی۔

نبی اکرم ﷺ کے متبنیٰ سیدنا زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ کو اسی سوق عکاظ میں سے چار سو درہم میں سیدنا حکیم بن حزام رضی اللہ عنہ نے خریدا تھا اور پھر اسے اپنی پھوپھی سیدہ خدیجہ سلام اللہ علیہا کو ہبہ کر دیا تھا۔ سیدہ خدیجہؓ نے نکاح کے بعد زید رضی اللہ عنہ سرکار دو عالم ﷺ کو دے دیا تھا۔ [کتاب المعارف لابن قتیبہ ص ۶۳، اخبار مکہ الازرقی ۱/۱۲۵]

عکاظ کے اس بازار اور میلے کے انعقاد واجراء کی ابتداء واقعہ فیل کے پندرہ سال بعد ہوئی جب کہ نبی ﷺ کی عمر مبارک پندرہ برس تھی۔ چنانچہ مفصل فی تاریخ العرب میں ہے کہ سوق عکاظ کا انعقاد ۵۸۵ یا ۵۸۶ عیسوی میں ہوا اور لوگ سوق عکاظ سے فارغ ہونے کے بعد پھر دوسرے بازار کی طرف جاتے جس کا نام سوق مجنہ تھا۔ وہاں اس روز قیام کرتے اور پھر جب ذی الحجہ کا چاند دیکھتے تو سوق المجاز چلے جاتے۔ سوق المجاز بھی جاہلیت میں ایک بازار لگتا تھا۔ وہاں آٹھ روز رہتے اور خوب خرید وفروخت کرتے، پھر ترویہ (آٹھ ذی الحجہ) کے روز وہاں سے نکل کر ذوالمجاز آتے۔

بعض محققین کے نزدیک سوق عکاظ کی ابتداء ۵۴۰ء میں ہوئی اور ظہور اسلام کے بعد ۱۲۹ھ تک ہر سال باقاعدہ اس کا انعقاد ہوتا تھا۔ ۱۲۹ھ میں خوارج کے خوف سے یا ان کے حملے اور لوٹ مار کے بعد بازار ختم ہو گیا اور پھر کبھی اس کا اجرا نہ ہو سکا۔

[دائرۃ المعارف، فرید وجدی ۶/۵۳۶، مفصل فی تاریخ العرب ۷/۳۷۸، اخبار مکہ ازرقی ۱/۱۲۵]

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ سوق عکاظ اور ذوالمجاز وغیرہ زمانہ جاہلیت میں لوگوں کی تجارت اور خرید وفروخت کے لیے جاری کیے گئے تھے۔ لیکن جب اسلام آیا تو لوگوں نے ان بازاروں میں جانا چھوڑ دیا کیوں کہ ان کے خیال میں موسم حج میں تجارت کرنا اچھا نہیں تھا حتیٰ کہ یہ حکم آیا کہ

﴿لَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ اَنْ تَبْتَغُوْا فَضْلاً مِّنْ رَّبِّكُمْ فِىْ مواسم الحج﴾ [تفسیر جامع البیان ۲/۱۶۴]

المرزوقی وغیرہ نے لکھا ہے کہ سوق عکاظ نجد کے بالائی علاقہ میں عرفات کے قریب لگتا تھا۔ یہ پورے عرب کا سب سے بڑا بازار تھا۔ اس میں قریش مکہ، بنو ہوازن، غطفان، خزاعہ اور احابیش یعنی حارث بن عبدہ مناۃ، عضل، مصطلق اور دوسرے عرب قبائل آتے تھے۔ نصف ذی قعدہ سے غرۂ ذی الحجہ تک یہ جاری رہتا تھا۔ یہاں پر کسی قسم کا ٹیکس نہیں تھا۔ اس میں نہایت عمدہ اور نایاب سامان فروخت ہوتا تھا جو عرب کے کسی دوسرے شہر میں نہیں ملتا تھا۔ ملوک یمن اور ملوک حیرہ یہاں پر نہایت عمدہ تلواریں، نفیس حلّے، قیمتی سواریاں، مشک، عود اور دوسری قیمتی چیزیں تجارت کے لیے بھیجا کرتے تھے۔ عربوں میں جو ان کی بولی بولتا اور ان کو خریدتا، وہ بہت ہی معزز سمجھا جاتا تھا اور اسے ان بادشاہوں کے دربار میں باریابی کا شرف حاصل ہوتا۔

سوق عکاظ کے انعقاد میں اگر چہ ''قریش کا بہت بڑا دخل تھا لیکن اس بازار اور میلہ کے انعقاد میں زیادہ عمل دخل بنوتمیم کا تھا اور وہی اس کے نگران اور سرپرست اعلیٰ تھے۔ اس میلہ میں جھگڑوں اور خصومات کے فیصلے بنوتمیم کا رئیس اعلیٰ کرتا تھا۔ اسی طرح تجارت کی بعض اشیاء کے نرخ میں جب نزاع پیدا ہوتا تو بنوتمیم کا رئیس ہی نرخ طے کرتا تھا بنوتمیم کے رئیس کی یہ عدالت بڑی محترم اور بارعب ہوتی تھی۔ اور سب شرکاء عکاظ اس کی تعظیم کرتے اور اس کے ہر فیصلے کے سامنے سر تسلیم خم کرتے تھے۔

[صبح الاعشیٰ ۱/۴۱۰، المفصل فی تاریخ الادب ۷/۳۸۳]

رسول اللہ ﷺ کے صحابی اقرع بن حابس تمیمی رضی اللہ عنہ اس کے آخری حاکم تھے۔

سوق عکاظ میں تجارت کے علاوہ وعظ و تبلیغ اور اصلاح معاشرہ وغیرہ مقاصد کے لیے بڑے بڑے معزز لوگ بھی تشریف لے جاتے تھے۔ مشہور موحد و واعظ جاہلی قیس بن ساعدہ بھی اسی بازار میں تشریف لے جاتے تھے اور وعظ کی مجلس کراتے ہوئے لوگوں کو توحید و آخرت کی طرف دعوت دیتے تھے۔ سرکار دو عالم ﷺ بھی سوق عکاظ، مجنہ اور ذوالمجاز وغیرہ مواسم میں دعوت اسلام کے لیے تشریف لے جاتے تھے۔ رسول اللہ ﷺ سات سال تک سوق عکاظ میں دعوت و تبلیغ کے لیے جاتے رہے اور بنو عامر بن صعصعہ کو اسلام کی دعوت دی۔ [البکری ۵/۲۵۹، البدایہ والنہایہ ۳/۱۴۱]

قیس بن ساعدہ بازار میں وعظ کرتے ہوئے اور نبی آخر الزمان کی اطلاع دیتے ہوئے کہا کرتے تھے کہ نبی آخر الزمان خاتم الانبیاء ﷺ کے ظہور کا زمانہ قریب آ چکا ہے اور عن قریب وہ ظاہر ہوں گے۔ رسول اللہ ﷺ نے انہیں سوق عکاظ میں وعظ کرتے ہوئے دیکھا تھا، تاہم ظہور اسلام سے قبل ہی وہ وفات پا گئے۔ قیس بن ساعدہ کی بہت سی اولیات ہیں جن کی تفصیل کا یہاں موقع نہیں۔

[ملاحظہ ہو انسان العیون ۱/۱۹۶، البدایہ والنہایہ لابن کثیر وغیرہ]

اسی سوق عکاظ کے سفر کے دوران جنات نے نبی اکرم ﷺ کا قرآن سنا تھا جس کا ذکر قرآن حکیم میں بھی ہے۔ بیہقی نے سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی سند سے روایت کیا ہے کہ نبی اکرم ﷺ بطن نخلہ میں قرآن حکیم کی تلاوت فرما رہے تھے تو ۹ جنوں کا ایک قافلہ وہاں سے گزرا۔ انہوں نے آپ کا نہایت خاموشی سے قرآن سنا۔ چنانچہ اللہ نے یہ آیت نازل فرمائی۔

﴿اِذْ صَرَّفْنَا اِلَيْكَ نَفَراً مِّنَ الْجِنِّ الخ﴾

سرزمین عرب میں سوق عکاظ کے علاوہ کئی اور بازار بھی لگا کرتے تھے۔ سوق عکاظ، مجنہ، ذوالمجاز کے علاوہ اکثر بازاروں کا نگران اور سرپرست قبیلہ تاجروں سے ٹیکس وصول کرتا تھا۔ ہر بازار کا ضامن اور ذمہ دار ایک خاص قبیلہ ہوتا تھا جس کی کوشش سے وہ بازار کامیاب رہتا تھا۔ وہ ضامن قبیلہ ہی شرکاء بازار اور ان کے احوال کی حفاظت کا ذمہ دار

ہوتا تھا کیوں کہ بازار کے اندر چوروں اور ڈاکوؤں کا ہر وقت خطرہ رہتا تھا۔ اس ضامن قبیلہ کے رئیس کے کارندے بازار کے اندر اور ارد گرد حفاظت پر مامور ہوتے تھے۔ تاہم بازاروں اور دور دراز علاقوں پر سے گزرنے کے لیے خفارہ کے بغیر پہنچنا مشکل تھا، اس لیے راستہ میں واقع قبائل کی حفاظت اور امداد سے یہ کام آسان ہو سکتا تھا۔

یعقوبی نے لکھا ہے کہ عرب کے مشہور بازار دس ہیں۔ ان بازاروں میں لوگ تجارت اور خرید و فروخت کے لیے جمع ہوتے تھے اور ان کے اموال اور جانوں کی پوری پوری حفاظت کی جاتی تھی۔ [یعقوبی ۱/۲۳۹]

ان اسواق کے احوال کے لیے ملاحظہ ہو [بلوغ الارب ۱/۲۶۴، کتاب الازمنہ والامکنہ، مرزوقی ۲/۱۶۱، معجم البکری ۳/۹۵۹، العقد الفرید ۱۲/۱۶، ۱۵/۲۴۰، الاغانی ۱۴/۱۴۵، کتاب المحرص ۲۶۳، الاغانی ۱۱/۶، ۸۴، ۱۲، ۱۴/۱۶، ۱۴/۲۳]

ان بازاروں کی حفاظت کرنے والے محرمون اور ان میں فساد اور لوٹ مار کرنے والے محلوق کہلاتے تھے۔ محرمون میں بنی کلب ابن وبرہ، بنی عمرو بن تمیم، بنی حنظلہ بن زید اور ہذیل اور بنی شیبان کے لوگ لوگوں کو لوٹ مار اور ظلم و تشدد سے روکنے کے لیے ہر وقت مسلح رہتے اور محلون میں بنو اسد، طے، بنی بکر اور بنی عامر بن صعصعہ کے کچھ لوگ محلون تھے۔ [یعقوبی ۱/۲۴۰، العقد الفرید ۲/۲۰۶]

عرب کے مشہور بازاروں کے نام حسب ذیل ہیں۔

(۱) سوق دومتہ الجندل (۲) سوق ہجر (۳) سوق عمان (۴) سوق المشقر (۵) سوق عدن ربین (۶) سوق صنعا (۷) سوق حضر موت (۸) سوق ذوالمجاز (۹) سوق مجنہ (۱۰) سوق عکاظ (۱۱) سوق حباشتہ (۱۲) سوق صحار (۱۳) سوق بدر (۱۴) سوق بنی قینقاع (۱۵) سوق الشحر (۱۶) سوق عشر۔

یہ تو عام بازار تھے۔ ان کے علاوہ بعض چھوٹے بازار بھی تھے جو کسی خاص قبیلہ سے متعلق ہوتے تھے۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ سب سے پہلا بازار جو منعقد ہوا وہ دومتہ الجندل تھا۔ [مرزوقی: الازمنہ والامکنہ ۱/۱۶۱، صبح الاعشیٰ ۱/۴۰۱]

(۲) سوق دومۃ الجندل

یہ شام اور حجاز کے درمیان ایک مقام ہے۔ ہر سال یکم ربیع الاول کو اس کا انعقاد ہوتا تھا اور ۱۵ روز تک یہ زور شور سے جاری رہتا تھا۔ ویسے تھوڑا بہت ربیع الاول کے آخر بھی جاری رہتا تھا۔ بنو کلب بنو جدیلہ اور بنو طے اس سوق کے جیران اور پڑوسی تھے۔ اس بازار کی تولیت دو رئیسوں اکیدر عبادی اور قنافۃ کلبی میں بدلتی رہتی تھی۔ اس بازار میں بیع القاء الحصاۃ والحجر رائج تھی۔ یہ وہ بیع ہے جس سے سرکار دو عالم ﷺ نے منع فرمایا ہے اور اسلام نے اسے ختم کر دیا[کتاب المحبر ص ۱۲۶۳]

چنانچہ سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے بیع الحصاۃ اور بیع الغرر سے منع فرمایا ہے۔ [مسلم ۲/۲]

اکیدر ان لوگوں سے جو وہاں دوکان لگاتے تھے ان سے ٹیکس لیتا تھا۔ [المفصل تاریخ العرب ۷/۳۷۱، الیعقوبی ۱/۲۲۶، ابن خلدون ۲/۲۷۳]

بعض وہ قبائل جو دور رہتے تھے ان کو سوق دومۃ الجندل تک پہنچنے میں بڑی دشواری ہوتی تھی کیوں کہ راستہ میں کچھ قبائل ایسے تھے جن سے لوٹ مار کا خطرہ تھا، چنانچہ وہ خفارہ ادا کرتے تھے، یہ ایک ٹیکس ہوتا تھا جو امن و امان سے پہنچنے کی ضمانت ہوتا تھا کیوں کہ اس کے بغیر تاجر اور شرکائے سوق چوروں اور ڈاکوؤں کے خطرہ کے پیش نظر بازار میں شریک نہیں ہو سکتے تھے۔ چنانچہ کتاب محبر میں ہے جو تاجر یمن اور حجاز سے اس میں شرکت کے لیے آتے تھے تو خفارہ ادا کرتے تھے۔ [کتاب المحبر ص ص ۲۶۴] یہ بازار اپنے محل وقوع کے لحاظ سے بڑی اہمیت کا حامل تھا۔ یہاں سے دمشق دس مرحلے پر تھا اور مدینہ اور کوفہ تیرہ تیرہ مرحلے پر تھے۔

(۳) سوق المشقر

یہ بازار مقام ہجر (بحرین) میں تھا۔ سوق دومۃ الجندل کے بعد لوگ اس بازار میں چلے جاتے تھے کیوں کہ سوق مشقر یکم جمادی الاخری سے آخر ماہ تک پورا ایک مہینہ لگتا

تھا۔اس بازار میں اہل فارس بھی سمندر پار کر کے شریک ہوتے تھے۔ بنو عبدالقیس اور بنو تمیم اس بازار کے قرب وجوار میں رہتے تھے۔اس بازار کے نگران بنو تمیم میں سے ہوتے تھے۔ ملوک فارس ہی نے یہاں پر مختلف قبائل کے لیے اپنی طرف سے بادشاہ اور رؤسا مقرر کیے تھے۔ بازار مشقر کا انتظام بھی دومتہ الجندل کی طرح تھا۔ یہاں کا رئیس تاجروں سے ٹیکس وصول کرتا تھا۔ مفصل میں ہے کہ یہ ایک مضبوط قلعہ تھا۔ کہتے ہیں اس کا وارث امراء القیس تھا۔ چنانچہ اس نے اپنے شعر میں اس کی طرف اشارہ بھی کیا ہے۔اس قلعہ میں شاہ فارس کی کچھ فوج بھی رہتی تھی اور یہاں غلہ جمع کرنے کے گودام بھی تھے جو بوقت ضرورت عرب میں تقسیم کرتے تھے اور اسی قلعہ کے ذریعہ وہ عربوں کی شرارتوں سے مملکت فارس کی سرحدات کی حفاظت کرتے تھے۔

اس بازار میں زیادہ تر خرید وفروخت بیع الملامسہ کے ذریعہ ہوتی تھی جس کو اسلام میں منع کیا گیا ہے۔[مسلم ۲/۲]

[تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو الیعقوبی ۱/۲۲۶، معجم البکری ۴/۱۱۹۳، مذروقی الازمنہ والامکنہ ۲/۱۶۲، مراصد الاطلاع ۳/۱۲۷۵]

(۴) سوق صحار

یہ سوق عمان میں یکم رجب سے صرف پانچ روز تک منعقد ہوتا تھا۔ جلندی بن مستکبر اس کا متولی تھا اور وہی اس بازار کا ٹیکس وصول کرتا تھا۔ یہ بازار سوق مشقر کے فوراً بعد منعقد ہوتا تھا۔[محبر ص ۲۶۵] اس بازار میں خرید وفروخت پتھر پھینکنے (القاء الحجارة) سے ہوتی تھی۔[الیعقوبی ۱/۲۳۶، مرزوقی الازمنہ والامکنہ ۲/۱۶۳]

(۵) سوق دبا

یہ عرب کا خاص بازار تھا کیوں کہ اس میں عربوں کے علاوہ سندھ وہند، چین اور مشرق ومغرب کے تاجر بھی شرکت کرتے تھے۔سوق دبا سوق صحار کے بعد منعقد ہوتا تھا۔ یہ بازار رجب کے آخری روز شروع ہوتا تھا۔اس کا متولی بھی جلندی بن مستکبر تھا۔سوق دبا

اور سوق صحار دونوں کا ٹیکس وصول کرتا تھا۔ [کتاب المحبر ص ۲۶۵] یہاں مال کی بڑی خرید و فروخت ہوتی تھی۔

(۶) سوق الشحر (شحر مہرہ)

سوق دبا کے بعد سوق شحر اس پہاڑ کے دامن میں منعقد ہوتا تھا جس میں بقول بعض اہل تاریخ سیدنا ہود علیہ السلام کی قبر ہے۔ یہ نصف شعبان کو منعقد ہوتا تھا اور بازار میں کوئی ٹیکس وغیرہ نہیں لیا جاتا تھا کیونکہ یہ علاقہ کسی مملکت کے تحت نہیں تھا، لیکن تاجر حضرات خفارہ دیتے تھے۔ اس بازار میں خشکی اور بحری دونوں راستوں سے تاجر آتے تھے اور یہ تجارت کا ایک بہت بڑا مرکز تھا۔

(۷) سوق عدن

سوق شحر کے بعد سوق عدن یکم رمضان سے دس روز تک لگتا تھا۔ شحر مہرہ سے تاجر اور خریدار اٹھ کر عدن آتے تھے۔ تاجروں میں وہی لوگ یہاں آتے تھے جن کا تمام مال پہلے بازاروں میں فروخت نہیں ہوتا تھا۔ وہی یہاں آ کر اپنا باقی مال فروخت کر دیتے تھے۔ اسی طرح خریداروں میں بھی وہی زیادہ ہوتے جو دوسرے بازاروں میں نہیں پہنچ سکتے تھے۔ سوق عدن کے منتظم ملوک حمیر تھے جو ٹیکس (عشور) لیتے تھے۔ آخر میں ابنائے فارس سے یہ رقم وصول کرنے لگے تھے۔ ان کے حسن انتظام کی دھوم دھام ہندوستانی تاجروں میں اس قدر تھی کہ پورے ہندوستان میں اس کا چرچا تھا۔ مرزوقی نے لکھا ہے کہ

> ''بحری تاجر یہاں کی حسن کارکردگی کا فخریہ تذکرہ سندھ اور ہندوستان میں کرتے تھے اور بری تاجر اسے فارس میں جا کر بیان کرتے تھے۔'' [کتاب الازمنہ والامکنہ ۱/۱۶۴] [تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو الیعقوبی ۱/ ۲۳۶، کتاب الازمنہ والامکنہ ۱/ ۱۶۴، المفصل فی تاریخ العرب ۷/ ۳۷۵]

(۸) سوق صنعاء

سوق عدن کے بعد سوق صنعاء ۱۵ رمضان کو شروع ہوتا اور آخر رمضان تک

جاری رہتا۔ یہاں پر کپڑے، لوہے، روئی، زعفران اور مختلف رنگوں میں بڑے پیمانے پر تجارت ہوتی تھی۔ اس سوق میں بھی بیع الملامسہ ہوتی تھی جس کو اسلام نے حرام قرار دیا ہے۔ [صبح الاعشیٰ ۱/۴۱۰، کتاب الازمنہ والامکنہ ۵/۱۶۵، الیعقوبی ۱/۲۳۶]

(۹) سوق الرابیہ

سوق الرابیہ اور سوق عکاظ ایک ہی روز یعنی ۱۵ ذی قعدہ تک جاری رہتا تھا۔ پھر ۲۱ ذی قعدہ سے لوگ سوق مجنہ میں چلے جاتے تھے۔ سوق مجنہ دس روز تک قائم رہتا تھا۔ سوق مجنہ اسفل مکہ میں منعقد ہوتا تھا اور سوق بنو کنانہ کی تولیت میں تھا کیوں کہ یہ بنو کنانہ کی سرزمین میں لگتا تھا۔ [الازرقی، اخبار مکہ ۱/۱۲۴]

(۱۱) سوق ذوالمجاز

سوق ذوالمجاز سوق مجنہ کے بعد یکم ذی الحجہ سے آٹھ روز تک جاری رہتا تھا۔ ذوالمجاز ایک مقام کا نام ہے جو عرفات سے تین میل کے فاصلہ پر واقع ہے۔ ذوالمجاز سے ۸ ذی الحجہ کو لوگ تجارت بند کر کے حج کے لیے عرفات اور منیٰ کی طرف چلے جاتے تھے۔ عرب کے حجاج اور دوسرے بازاروں میں نہ شریک ہونے والے افراد عام طور پر سوق ذوالمجاز میں شریک ہوتے تھے۔ [کتاب الازمنہ والامکنہ ۵/۱۶۵]

(۱۲) سوق حباشتہ

یہ عرب کے مشہور اور قدیم اسواق میں سے ہے۔ اس میں اہل حجاز، اہل یمن ہوتے اس بازار میں رسول اللہ ﷺ نے بھی تجارت کی ہے۔ یہ سوق الازدبھی کہلاتا تھا اور یہ مکہ سے چھ روز کی مسافت پر تھا۔ یہ وہ بازار ہے جو جاہلی اسواق میں سب سے آخر میں بند ہوا۔ یہ لفظ حباشہ حا کے ضمہ اور فتحہ دونوں سے درست ہے۔ [معجم البلدان ۱/۱۰]

دوسرے اسواق

ان بازاروں کے علاوہ اور بھی کئی بازار تھے جیسے سوق نطاۃ خیبر اور سوق

حجر یمامہ۔ ان میں بھی خرید وفروخت کی سرگرمیاں ہوا کرتی تھیں۔ سوق دیرایوب بھی ایک بازار تھا اور سوق بصریٰ بھی ۲۵ روز تک قائم رہتا تھا جو بنوامیہ کے زمانہ تک جاری رہا۔ نیز سوق اذرعات پانچویں صدی تک جاری رہا۔ یہ اس زمانہ میں عرب کے بازاروں میں سب سے بڑا بازار تھا۔ [کتاب الازمنہ والامکنہ ۲/۱۶۲۔۱۶۶]

﴿تجارت کے چند بنیادی اصول﴾

دنیا میں ہر چیز چند بنیادی اصولوں پر مبنی ہوتی ہے۔ اسی طرح اسلام کے معاشی اور اقتصادی نظام میں تجارت اور کاروبار کی صحت اور درستی کا مدار بھی چند اصولوں پر مبنی ہے۔ جن میں سے چند ایک حسب ذیل ہیں۔

(۱) تجارت کا جواز چونکہ باہمی تعاون پر مبنی ہوتا ہے، لہٰذا تجارت کے تمام معاملات میں بھی جانبین سے تعاون کا وجود ضروری ہے یعنی یہ نہیں ہونا چاہیے کہ ایک فریق کی طرف سے تعاون ہو اور دوسرے کی طرف سے تعاون نہ ہو۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ فریقوں میں سے ایک کا زیادہ سے زیادہ نفع اور دوسرے کا زیادہ سے زیادہ نقصان ہو۔ ارشاد خداوندی ہے۔

﴿تَعَاوَنُوْا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوٰى وَ لَا تَعَاوَنُوْا عَلَى الْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ﴾ [المائدہ: ۱]

"یعنی نیکی اور پرہیزگاری پر ایک دوسرے سے تعاون کرو اور گناہ اور ظلم پر کسی کے ساتھ ہرگز تعاون نہ کرو۔"

(۲) تجارت میں جانبین سے حقیقی رضا کا وجود ضروری ہے، اضطراری رضا معتبر نہیں ہے۔ یعنی یہ نہ ہو کہ ایک شخص تو برضا ورغبت اس معاملہ کے لیے آمادہ ہو اور دوسرا برضا ورغبت اس معاملہ کے لیے آمادہ نہ ہو، مگر اس کی اضطراری کیفیت اس کی رضا کے قائم مقام بن گئی ہو جب کہ قرآن حکیم نے تجارت میں باہمی رضامندی کی شرط عائد کی ہے۔

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُوْا لَاتَأْكُلُوْا أَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ إِلَّا أَنْ تَكُوْنَ تِجَارَةً عَنْ تَرَاضٍ مِّنْكُمْ﴾ [النساء: ۲۹]

الا ان تکون تجارۃ عن تراض منکم ﴾[النساء: ۲۹]

''اے ایمان والو! تم آپس میں ایک دوسرے کے مال کو باطل طریق سے نہ کھاؤ مگر یہ کہ تجارت کی راہ سے باہمی رضا مندی کے ساتھ معاملہ ہو۔''

(۳) پھر اہل معاملہ معاملہ کی اہلیت بھی رکھتے ہوں یعنی عاقل، بالغ یا ممیز اور آزاد ہوں، مجبور، مجنون اور مکرہ نہ ہوں کیوں کہ حدیث میں آتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا۔

﴿رفع القلم عن ثلاثة، عن النائم حتى يستيقظ، و عن الصبي حتى يحتلم، و عن المجنون حتى يعقل﴾

[مسند احمد ۶/۱۰۰، نیل الاوطار ۱/۳۲۳]

تین آدمیوں سے قلم اٹھایا گیا ہے، سوئے ہوئے آدمی۔ جب تک وہ بیدار نہ ہو جائے، بچے سے جب تک وہ بالغ نہ ہو جائے اور پاگل سے جب تک کہ وہ صحیح العقل نہ ہو جائے۔ یہ حدیث الفاظ کے کچھ اختلاف کے ساتھ ابوداؤد وغیرہ میں بھی آئی ہے اور حدیث کی دوسری کتابوں میں اس کا ذکر ہے۔

ایک اور روایت میں ہے کہ

﴿نهى رسول الله ﷺ عن بيع المضطر﴾

[ابوداؤد باب فی بیع المضطر، شرح السنہ ۸/۱۳۲]

رسول اللہ ﷺ نے زبردستی اور جبر کی بیع سے منع فرمایا ہے۔

کسی معاملہ میں جانبین میں سے کسی ایک جانب میں حقیقی رضا مندی نہ پائی جاتی ہو بلکہ جبری اور اضطراری رضا ہو، مثلاً سود یا کسی مزدور کی اس محنت کے مقابلہ میں غیر واجبی اجرت چنانچہ حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی جبری راضطراری رضا کو اسلامی نقطہ نظر سے

غیر معتبر قرار دیتے ہیں۔ وہ فرماتے ہیں۔

''اس لیے کہ ''مفلس'' مضطر اور مجبور ہوتا ہے کہ جس شئی کے پورا کرنے پر قدرت نہیں رکھتا اس کو اپنی بے چارگی کی وجہ سے اپنے ذمہ واجب کر لیتا ہے اور یہ رضا ہرگز حقیقی رضا نہیں ہے پس سود جیسا معاملہ ناپسندیدہ معاملات میں سے ہے نہ کہ کاروبار کے صالح اور درست معاملات میں سے ہے اور بلاشک وشبہ یہ معاملہ باطل اور ظلم ہے۔

﴿وانما هو باطل و سحت﴾ [حجة الله البالغه ۲/۱۰۳]

(۴) تجارت کے معاملہ میں کسی قسم کا دھوکہ، بددیانتی، خیانت، ضرر، نقصان اور معصیت پر عمل دخل نہ ہو اور نہ ہی ان اشیاء کا کاروبار ہو جن کا استعمال شریعت اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے معصیت اور حرام قرار دیا ہے۔ چنانچہ علامہ عبدالرحمٰن الجزائری رحمتہ اللہ علیہ نے لکھا ہے۔

''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ بہترین کسب بیع مبرور ہے اور آدمی کا اپنے ہاتھ سے کام کر کے روزی کمانا۔''

[رواہ احمد والبزار والطبرانی]

''اور بیع مبرور ایسی بیع وشراء کو کہتے ہیں جس میں متعاقدین ایک دوسرے سے تعاون اور بھلائی کا معاملہ کریں یعنی نہ اس میں دھوکہ ہو اور نہ خیانت اور نہ ہی اللہ تعالیٰ کی نافرمانی اور معصیت لازم آتی ہو۔'' [کتاب الفقہ ۲/۲۰۲]

پھر ایک اور حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

﴿لاضرر ولاضرار فی الاسلام﴾

''اسلام میں نہ نقصان اٹھانا ہے اور نہ نقصان پہنچانا ہے۔

[ابن ماجہ رقم ۲۳۴۰۔۲۳۴۱، مسند احمد ۱/۳۱۳، بیہقی ۶/۶۹، ۱۰/۴۵۷، ۱۳، طبرانی کبیر ۲/۸۱]

ایک اور حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

﴿من غشنا فلیس منّا﴾ [مسند احمد ۲/ ۶۹، طبرانی اوسط رقم ۲۴۸۸، کشف الاستار رقم: ۱۲۵۵، امام مسلم نے اس کو کتاب الایمان میں اور ابوداؤد اور ترمذی نے کتاب البیوع میں نقل کیا ہے۔ علاوہ ازیں ابن حبان ۱۱/ ۲۷۰، شرح السنہ ۸/ ۱۶۶، سنن کبری بیہقی ۵/ ۳۲۰، ابوعوانہ ۱/ ۵۷، مسند احمد ۲/ ۳۴۲ میں بھی روایت کیا ہے]

یعنی ''جو ہم سے دھوکہ کرے اس کا ہمارے ساتھ کوئی تعلق نہیں۔''

وجہ یہ ہے کہ ایک مومن کے ایمان کا تقاضا یہ ہے کہ وہ کسی سے دھوکہ نہ کرے کیوں کہ جس طرح وہ رزق کو ڈھونڈ رہا ہے، رزق بھی اس کو اسی طرح تلاش کر رہا ہے۔ چنانچہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

﴿من فتر احدکم من رزقہ ادرکہ کما یدرکہ الموت﴾

[مجمع الزوائد: ۴/ ۸۵]

''جو شخص رزق سے بھاگتا ہے رزق اس کو پالیتا ہے جیسے موت اس کو پالیتی ہے۔''

مال دار ہونا کوئی برائی کی بات نہیں اور نہ اسلام یہ چاہتا ہے کہ اس کے ماننے والے نادار اور قلاش ہوں۔ چنانچہ ایک مرتبہ سرکار دو عالم ﷺ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی ایک مجلس میں تشریف لائے۔ اس وقت آپ کے سر مبارک پر پانی کے اثرات تھے۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے عرض کی: ''یا رسول اللہ! ہم آپ کو خوش دیکھتے ہیں؟'' فرمایا! ''ہاں''۔ پھر مال دار اور متمول لوگوں کا ذکر چل نکلا تو آپ نے فرمایا:

﴿لا بأس بالغنی لمن التقیٰ اللہ عزوجل، و الصحۃ لمن التقی خیر من الغنی و طیب النفس من النعیم﴾

[رواہ احمد فی مسندہ ۵/ ۳۷۲]

''جو شخص اللہ عزوجل سے ڈرتا ہے اس کے لیے مالداری میں کوئی حرج نہیں اور ایک متقی شخص کے لیے تندرستی مالداری سے بہتر ہے، اور دل کا خوش ہونا بھی نعمتوں میں سے ایک نعمت ہے۔''

امام بخاریؒ نے بھی اس حدیث کو الادب المفرد رقم ۳۰۱، اور حاکم نے مستدرک ۲/ ۳، بیہقی نے شعب الایمان ۳/ ۳۵۱، اور ابن سعد نے الطبقات الکبریٰ ۴/ ۳۵۱ میں نقل کیا ہے۔

(۵) تجارت کرنے والے کو خرید و فروخت کے وقت نرمی سے کام لینا چاہیے کیوں کہ مزاج کی سختی خرید و فروخت میں مزاحمت کا باعث بنتی ہے۔ چنانچہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

﴿رحم الله عبداً، سمحاً "اذا باع، سمحاً اذا اشترىٰ، سمحاً اذا اقتضىٰ﴾

"اللہ تعالیٰ رحم فرمائے اس بندے پر جو نرم ہو جب فروخت کرے، نرم ہو جب فروخت کرے اور نرم ہو جب تقاضا کرے۔"

[اخرجہ البخاری والترمذی فی البیوع، ابن حبان ۱۱/ ۲۶۷، سنن کبریٰ بیہقی ۵/ ۳۵۷، ابن حبان ۱۱/ ۲۶۷، شرح السنہ بغوی ۸/ ۳۵، معجم الاوسط طبرانی ۵/ ۳۵۶، مسند احمد ۳/ ۳۴۰]

ترمذی کی ایک روایت میں ہے کہ حق تعالیٰ شانہ نے ایک شخص کو بخش دیا جو تم سے پہلے تھا، نرم تھا جب تقاضا کرتا تھا۔

اور ترمذی ہی میں ہے کہ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ اس شخص کو محبوب رکھتے ہیں جو نرم فروخت کرنے والا ہو، نرم خریدنے والا ہو اور نرم تقاضا کرنے والا ہو۔

امام احمد نے سیدنا ابن عباس سے روایت نقل کی ہے کہ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

﴿اسمح يسمح لك﴾ [مسند احمد ۱/ ۲۴۸، زوائد مسند رقم ۱۸۸۶]

"تم لوگوں سے نرمی سے پیش آؤ تمہارے ساتھ بھی نرمی کی جائے گی۔"

ایک اور روایت میں سیدنا جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ سرکار دو عالم

صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

﴿الا اخبر کم باھل الجنۃ؟ کل ھین لین سھل قریب﴾

[معجم الاوسط طبرانی رقم ۸۳۷، مسند ابی یعلی ۳/۳۷۹]

''کیا میں تمہیں جنتی آدمی کے بارہ میں نہ بتاؤں؟ فرمایا: ہر متواضع، نرم خو اور ملنسار جنتی ہے۔''

مسلمانوں کی تجارت اکثر و بیشتر تند خوئی اور تیز مزاجی کی وجہ سے ناکام ہوتی ہے۔ انہیں اپنے مزاج میں نرمی پیدا کرنی چاہیے۔ نرمی میں بڑی جاذبیت ہے اور نرم خوئی سے جب گاہک زیادہ آئیں گے تو تجارت کو دن دگنی رات چوگنی ترقی ہوگی۔

(۶) مال فروخت کرتے وقت ایک تاجر کو اپنے مال کا عیب اور نقص کبھی نہیں چھپانا چاہیے۔ وہ اگر وقتی طور پر مال کے عیب چھپائے گا بھی لیکن بالآخر گاہک کو علم ہو جائے اور پھر کبھی بھی اس سے خرید و فروخت نہیں کرے گا۔ علاوہ ازیں عیب چھپانا گاہک کو دھوکہ دینا ہے اور دھوکہ دینے والے کے بارہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بڑی تہدید فرمائی ہے جس کا ذکر گزشتہ سطور میں کیا گیا ہے۔ علاوہ ازیں واثلہ بن الاسقع رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

﴿من باع عیباً لم یبنیه، لم یزل فی مقت اللّٰہ، و لم تزل الملائکۃ تلعنه﴾ [ابن ماجہ رقم ۲۲۴۷، معجم کبیر طبرانی ۲۲/۵۴]

''جس نے کسی عیب والی چیز کو فروخت کیا اور گاہک سے اس کا عیب ظاہر نہ کیا وہ ہمیشہ اللہ کے غضب میں رہے گا اور اللہ کے فرشتے ہمیشہ اس پر لعنت کرتے رہیں گے۔''

اس مضمون کی اور بھی روایات الفاظ کے اختلاف کے ساتھ مروی ہیں۔ ملاحظہ ہو سنن کبریٰ بیہقی ۵/۳۲۰، مستدرک حاکم ۲/۸، مسند احمد ۴/۱۵۸، معجم کبیر طبرانی: ۱۷/۳۱۶ وغیرہ)

(۷) ایک تاجر کو ناپ تول میں کمی نہیں کرنی چاہیے یہ شرعی طور پر ایک بہت بڑا

گناہ ہے اور تجارتی نقطۂ نظر سے بھی ایک نہایت قبیح حرکت ہے۔ چنانچہ نبی کریم ﷺ جب ہجرت کر کے مدینہ طیبہ تشریف لے گئے تو وہاں کے لوگ ناپنے تولنے میں بہت برے تھے۔ اس وقت "ویل للمطففین" یعنی جہنم ہے کم ناپنے اور کم تولنے والے لوگوں کے لیے۔ اس کے نزول کے بعد لوگوں نے صحیح اور درست ناپ تول شروع کر دیا۔

[جامع البیان، طبری، ۱۵/۹۱، مستدرک حاکم ۲/۳۳، معجم کبیر طبرانی ۱۱/۲۷۱]

اور ترمذی کی ایک روایت میں سرکار دو عالم ﷺ نے ناپ تول کر دینے والوں کو فرمایا: "تم لوگ ایسا کام دیئے گئے ہو جس میں تم سے پہلے بہت امتیں ہلاک ہو چکی ہیں۔" مطلب یہ کہ اگر تم بھی ناپ تول میں کمی کرو گے تو ہلاک ہو جاؤ گے۔

(۸) ایک تاجر کو خرید و فروخت کرتے وقت ہمیشہ سچ بولنا چاہیے۔ کذب بیانی تجارت کے لیے نہایت نقصان دہ ہے۔ اور پھر جو شخص تجارت میں جھوٹ بولتا ہے، حدیث میں اس کو فاجر کہا گیا ہے۔ چنانچہ ایک مرتبہ سرکار دو عالم ﷺ عید گاہ کی طرف تشریف لے گئے جہاں بازار تھا۔ آپ ﷺ نے دیکھا کہ لوگ خرید و فروخت میں مصروف ہیں۔ آپ نے انہیں مخاطب کر کے فرمایا: "اے تاجروں کے گروہ!" انہوں نے سرکار دو عالم ﷺ کی پکار کا جواب دیا اور گردنیں اور نظریں آپ کی طرف اٹھائیں۔

آپ ﷺ نے فرمایا:

﴿ان التجار یبعثون یوم القیامة فجاراً الا من اتقی و برّ و صدق﴾

"تاجر لوگ قیامت کے روز بہت گنہ گار (فاجر) اٹھائے جائیں گے سوائے ان کے جو پرہیز گار رہے اور انہوں نے نیکی اختیار کی اور سچ کو اپنایا۔"

[ابن ماجہ رقم ۲۱۴۶، ترمذی، سنن کبریٰ بیہقی ۵/۲۶۶، ابن حبان ۱۱/۲۷۶، مصنف عبدالرزاق ۱۱/۴۵۸، مستدرک حاکم ۲/۶، مسند الداری ۲/۱۶۳، معجم کبیر طبرانی ۵/۲۶، حلیۃ الاولیاء ۷/۱۱۴]

(۹) تاجروں کو خرید و فروخت کرتے وقت قسمیں اٹھانے سے منع کیا گیا، کیوں کہ قسم اگر جھوٹی ہوگی تو یہ حرام ہے اور اگر سچی ہوگی تو تاجر کو قسم اٹھانے کی عادت پڑ جائے گی اور پھر جھوٹی قسم بھی اٹھائے گا۔ چنانچہ سرکار دو عالم ﷺ نے فرمایا:

﴿ایاکم و الحلف فی البیع، فانّه ینفق ثم یمحق﴾

[ابن ماجه رقم ۲۲۰۹]

''مال کی خرید و فروخت میں قسم کھانے سے بچو، کیوں کہ قسم کھانے سے مال تو بک جائے گا لیکن برکت ختم ہو جائے گی۔''

ایک اور روایت میں رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ تین آدمی ایسے ہیں کہ حق تعالیٰ شانہ قیامت کے روز ان کی طرف نگاہ اٹھا کر بھی نہیں دیکھیں گے۔ بوڑھا زانی، متکبر فقیر اور تیسرا وہ تاجر جو مال خریدتے وقت بھی قسمیں اٹھاتا ہے اور فروخت کرتے وقت بھی قسمیں اٹھاتا ہے۔ [مجمع الزوائد۴/۹۳، معجم کبیر طبرانی رقم ۶۱۱۱]

(۱۰) تجارت سے بہت سے گناہ معاف ہوتے ہیں چنانچہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

﴿ان من الذنوب ذنوباً لاتکفرها الصلاة، ولا الصیام، ولا الحج، ولا العمرة، قالوا فما یکفرها یارسول اللّٰه! قال: الهموم فی طلب المعیشة﴾

''بہت سے گناہ ایسے ہیں جن کا کفارہ نہ نماز ہے اور نہ روزہ، نہ حج ہے اور نہ عمرہ۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے پوچھا: ''یارسول اللہ! پھر اس کا کفارہ کیا ہے؟ آپ نے فرمایا: ''طلب معاش کی فکر اور غم''۔

[مجمع الزوائد۴/۷، معجم الاوسط طبرانی رقم ۱۰۲]

معیشت کی طلب میں جس قدر فکر و غم تجارت میں ہوتا ہے اتنا فکر نہ ملازمت میں ہوتا ہے اور نہ زراعت اور صنعت و حرفت میں، خصوصی طور پر اس زمانہ جب میں کہ ہر شخص کو مال و دولت کی فکر لاحق ہے کیوں کہ موجودہ زمانہ میں مال و دولت کے بغیر کسی شخص کی

معاشرہ میں نہ عزت و وقار اور نہ ہی اس کی کہیں شنوائی ہوتی ہے۔ چنانچہ رسول اللہ ﷺ نے بھی ارشاد فرمایا:

﴿لیاتین علی الناس زمان، لاینفع فیه الاّ الدینار والدرهم﴾

''یقیناً لوگوں پر ایک زمانہ ایسا آئے گا جس میں درہم و دینار (یعنی مال و دولت) کے سوا اسے اور کوئی چیز فائدہ نہ دے گی۔''

[مجمع الزوائد ۴/۷۴، مسند احمد ۴/۱۳۳، معجم کبیر ۲۰/۲۷۹]

بیع کی تعریف

قبل اس کے کہ ہم بیع اور خرید و فروخت پر کچھ مزید بحث کریں اور اس کی باطل اور فاسد صورتوں کو بیان کریں، یہ جاننا نہایت ضروری ہے کہ بیع کے لغوی اور شرعی معنی کیا ہیں؟ اس بارہ میں علامہ راغب اصفہانی فرماتے ہیں کہ قیمت والی شئی کو دے کر اس کی قیمت لے لینا بیع اور خریدنے اور فروخت کرنے دونوں پر بیع کا اطلاق ہوتا ہے، گویا بیع لغۃً اضداد میں سے ہے۔ اس بارہ میں رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا۔

﴿لایبیع احدکم علیٰ بیع اخیه﴾

''کوئی شخص اپنے بھائی کی بیع کو نہ خریدے''

یہاں خریدنے پر بیع کا اطلاق کیا گیا ہے۔ (المفردات ص ٦٧)

علامہ ابن نجیم مصباح کے حوالے سے بیع کا لغوی معنی بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

''ایک چیز کے بدلہ میں دوسری چیز دینا عام ازیں کہ وہ مال ہو یا مال نہ ہو، جیسا کہ قرآن حکیم میں ہے۔

﴿وَ شَرَوْهُ بِثَمَنٍ بِخْسٍ دَرَاهِمَ مَعْدُوْدَةٍ﴾ [یوسف : ۲۰]

یعنی انہوں نے اس کو (سیدنا یوسف علیہ السلام کو) معدودے چند درہموں کے عوض

فروخت کر دیا حالانکہ سیدنا یوسف علیہ السلام آزاد شخص تھے۔ ''مال'' نہ تھے۔ ہر چند کہ لغت میں بیع کا اطلاق خریدنے اور بیچنے دونوں پر ہوتا ہے لیکن بائع کا متبادر بیچنے والا ہے۔''

[البحر الرائق ۵/۲۵۶]

بیع کے شرعی معنی کے بارہ میں ابن نجیم لکھتے ہیں کہ صاحب کنز الدقائق علامہ نسفی رحمتہ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ

﴿البیع تبادلة المال بالمال بالتراضی﴾

''یعنی باہمی رضامندی کے ساتھ مال کے بدلہ میں مال دینے کو بیع کہتے ہیں، اور الکشف الکبیر میں لکھا ہے کہ جس شئے کی طرف طبیعت مائل ہو اور اس کو ضرورت کے وقت ذخیرہ کیا جا سکے، اس کو مال کہتے ہیں۔ کسی شئ کا مال ہونا اس وقت ثابت ہوتا ہے جب عرف میں اس کی کوئی قیمت ہو اور جس چیز سے بغیر قیمت کے نفع حاصل کرنا مباح ہو (جیسے گندم کا ایک دانہ) وہ مال نہیں ہے علامہ کاسانی کی بدائع الصنائع میں ہے کہ کسی مرغوب شئ کا دوسری مرغوب شئ سے تبادلہ اگر قولاً ہو تو یہ ایجاب وقبول بیع ہے اور اگر فعلاً ہو تو یہ بیع تعاطی ہے۔''

[البحر الرائق شرح کنز الدقائق ۵/۲۵۶]

خرید وفروخت کی چند ناجائز صورتیں

رسول اللہ ﷺ نے چند قسم کی خرید وفروخت اور بیع کو ناجائز قرار دیا اور مسلمانوں کو ایسی بیع کرنے سے منع فرمایا۔

(۱) بیع ملامسہ اور منابذہ

سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان فرماتے ہیں کہ سرکار دو عالم ﷺ نے بیع ملامسہ اور بیع منابذہ سے منع فرمایا ہے۔ [مسلم رقم ۳۷۸۰، بخاری رقم ۲۱۴۶، نسائی رقم ۴۵۲۱، تحفتہ الاشراف رقم ۱۳۸۲۷، ۱۳۹۶۴، نسائی ۴۵۲۹، بخاری ۲۱۴۴، ابن ماجہ رقم ۲۱۶۹]

ملامسہ کیا ہے؟ اس کی تعریف امام نووی نے یہ فرمائی ہے کہ کوئی شخص تاریکی اور اندھیرے میں ایک کپڑا لائے یا لپٹا ہوا کپڑے لائے اور خریدار سے یہ کہے کہ میں یہ کپڑا تم کو اس شرط پر فروخت کرتا ہوں کہ جب تم اس کو ہاتھ لگا دو گے تو تمہارا اس کو چھونا اس کو دیکھنے کے قائم مقام ہوگا اور بعد میں تمہیں اس کو واپس کرنے کا اختیار نہیں ہوگا۔

اس کی دوسری تعریف یہ ہے کہ صرف چھونے سے بیع لازم ہو جائے۔ فروخت کرنے والا مشتری سے کہے جب تم نے اس کو چھو لیا تو بیع واجب ہو جائے گی۔

[نووی شرح مسلم ۱۰/۳۹۳۔۳۹۴]

احناف کے نزدیک بیع ملامسہ کی تعریف یہ ہے کہ فروخت کرنے والا کہے کہ میں تم کو یہ چیز اتنی رقم کے عوض فروخت کرتا ہوں۔ جب تم اس چیز کو چھو لو گے تو بیع واجب ہو جائے گی۔ یا مشتری اس طرح کہے۔ [عمدۃ القاری ۱۱/۲۶۶]

اور منابذہ کی تعریف یہ ہے کہ بائع اور مشتری کسی چیز کی قیمت پر راضی ہو جائیں یا بائع یہ کہے کہ جب میں یہ چیز تمہارے پاس پھینک دوں گا تو بیع لازم ہو جائے گی اور تمہیں اس کو واپس کرنے کا اختیار نہیں ہوگا۔ [عنایۃ علی ہامش فتح القدیر ۶/۵۵]

ان دونوں قسم کی خرید و فروخت کے ناجائز ہونے کی وجہ علماء نے یہ لکھی ہے کہ غائب چیز کی بیع جائز ہے اور اس میں مشتری کو دیکھنے کے بعد اس کو مسترد کرنے کا اختیار ہے خواہ وہ بیان کردہ اوصاف کے مطابق ہو یا نہ ہو۔ چنانچہ علامہ بدر الدین عینی رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ اس کے باطل ہونے کی وجہ یہ ہے کہ جب مشتری سودے کو نہیں دیکھے گا تو اس بیع میں دھوکا ہوگا اور یہ قمار یعنی جوئے کے مترادف ہے۔

[عمدۃ القاری ۱۱/۲۶۷، فتح الباری ۱۰/۶۱۳]

(۲) کنکری پھینکنے والی اور دھوکہ کی بیع

زمانہ جاہلیت میں خرید و فروخت کا ایک طریقہ یہ تھا کہ بائع کے پاس مثلاً کپڑوں کا ایک ڈھیر ہے اور بائع اور مشتری جب قیمت پر متفق ہو جائیں تو مشتری جس کپڑے پر

بھی کنکری رکھ دے اور اس کپڑے کو دیکھے اور جانچے بغیر اس کی بیع واجب ہو جاتی تھی اور فریقین کو اس کے رد کرنے کا کوئی اختیار نہ ہوتا تھا۔ [ہدایہ مع فتح القدیر ۶/۵۵]

اسی طرح دھوکہ (غرر) کی بیع کا معاملہ ہے کہ کوئی شخص کسی دوسرے شخص کو یہ کہے کہ میرے جال میں جس قدر مچھلیاں آئیں گی وہ اتنے کی ہوں گی۔ یہ دھوکے کی بیع کہلاتی ہے کیوں کہ اس بات کا کوئی علم نہیں کہ اس کے جال میں مچھلیاں آتی بھی ہیں یا نہیں؟ اور اگر آتی ہیں تو کتنی آتی ہیں یا کوئی یہ کہے کہ اس گائے کے تھنوں میں جو دودھ ہے وہ اتنے روپوں کا ہے۔ یہ بھی دھوکے کی بیع ہے۔ یہ بیع اسلام میں جائز نہیں۔ کیونکہ اس کی مقدار مجہول ہے۔ اسی وجہ سے سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان فرماتے ہیں کہ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کنکری پھینکنے کی بیع اور دھوکے کی بیع سے منع فرمایا ہے۔

[مسلم رقم ۳۷۸۷، ابو داؤد رقم ۳۳۷۶، ترمذی رقم ۱۲۳۰، نسائی رقم ۴۵۳۰، ابن ماجہ ۲۱۹۴، سنن کبریٰ بیہقی ۵/۲۶۶، معرفتہ، السنن والآثار، بیہقی ۴/۲۷۵، سنن الدارقطنی ۳/۱۵، مصنف ابن ابی شیبہ ۶/۱۳۲، حلیتہ الاولیاء ۷/۹۴، کامل لابن عدی ۷/۲۴۸، معجم کبیر طبرانی ۱۱/۲۵۴]

علامہ نووی رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ بیع غرر (وہ بیع جس میں دھوکہ ہو) ممانعت، بیع کا ایک اہم اصول ہے اور اس اصول کے تحت بہت سے مسائل داخل ہیں۔ جیسے معدوم شئے کی بیع، مجہول چیز کی بیع، جس چیز کے دینے پر بائع قادر نہ ہو، جس شئی پر بائع کی ملکیت نہ ہو۔ دریا یا سمندر میں مچھلیوں کی بیع، جانوروں کے تھنوں میں دودھ کی بیع جانوروں کے پیٹ میں حمل کی بیع، غلہ کے ڈھیر کی بیع جس کی مقدار مجہول ہو وغیرہ ان سب چیزوں کی بیع باطل ہے کیوں کہ اس میں دھوکہ ہے۔ [نووی مع مسلم ۱۰/۳۹۶]

بیع پر بیع کرنا

حدیث میں بیع پر بیع کرنے کی بھی ممانعت آئی ہے، چنانچہ سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔

﴿لایبیع بعضکم علیٰ بیع بعض﴾

''تم میں سے کوئی شخص دوسرے کی بیع پر بیع نہ کرے''

[بخاری رقم ۲۱۳۹، ۲۱۶۵، مسلم رقم ۳۴۴۰، ۳۴۴۰، ۳۷۹۰، ۳۸۹۹، ابو داؤد رقم ۳۴۳۶، ترمذی رقم ۱۲۹۲، نسائی رقم ۴۴۲۸، ۴۵۱۵، ابن ماجہ رقم ۲۱۷۱، ابن حبان ۱۱/۳۳۹، سنن کبریٰ بیہقی ۵/۳۴۴، معرفۃ السنن والآثار بیہقی ۴/۳۸۴، سنن الدارمی ۲/۲۵۵، شرح السنہ لبغوی ۸/۱۱۷، کتاب الام، شافعی ۳/ ۹۱، مسند احمد ۲/۱۵۸، ۲/۷، مسند ابی یعلی ۱۰/۱۷۶، حلیۃ الاولیاء لابی نعیم ۹/۱۵۸، اتحاف السادۃ المتقین ص ۳۹]

ایک اور روایت میں رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

﴿لايبيع الرجل علىٰ بيع اخيه، ولا يخطب علىٰ خطبة اخيه، الا ان يأذن له﴾

''کوئی شخص اپنے مسلمان بھائی کی بیع پر بیع نہ کرے اور نہ کوئی اپنے بھائی کی منگنی پر منگنی کرے مگر یہ کہ وہ اجازت دے دے (بعض روایات میں اجازت کی قید نہیں ہے)۔'' [ملاحظہ ہو مسلم حدیث نمبر ۳۴۴۰]

[بخاری رقم ۲۱۳۹، ۲۱۲۵، ۳۷۹۰، ۳۸۹۹، ابوداؤد رقم ۳۴۳۶، ترمذی رقم ۱۲۹۲، نسائی رقم ۴۴۲۸، ۴۵۱۵، ابن ماجہ ۲/۷۶۱ مختصراً، نسائی سنن کبریٰ ۴/۱۳، المصنف لابن ابی شیبہ ۴/۳۰۳، سنن کبریٰ بیہقی ۵/۳۴۴، معرفۃ السنن والآثار بیہقی ۴/۳۸۴، المصنف لعبد الرزاق، ۸/۱۹۸، شرح السنہ بغوی ۸/۱۲۲، مسند احمد ۲/۲۷۴، مسند حمیدی ۲/۴۴۵، طحاوی ۴/۳]

ایک اور روایت میں جو سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، سرکار دو عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

﴿لا يسم المسلم علىٰ سوم المسلم﴾

''کوئی مسلمان دوسرے مسلمان کے نرخ کرتے وقت نرخ نہ کرے۔''

[مسلم رقم ۳۴۴۷، ترمذی رقم ۱۲۹۲، نسائی رقم ۴۴۲۹، ۴۵۱۶، سنن کبریٰ بیہقی ۵/۳۴۴،

کتاب الام للشافعی ۳/۹۱/۷]

بیع پر بیع کرنے کی جو ممانعت حدیث میں آئی ہے کہ کسی شخص نے مدت خیار میں کوئی چیز خریدی۔ اب اس سے کوئی شخص کہے کہ اس بیع کو فسخ کر دو میں تم کو یہ چیز کم دام اور قیمت پر فروخت کروں گا، یہ ناجائز ہے۔ یا خریدار کہے کہ تم اس بیع کو فسخ کر دو میں اس شے کی تم کو اس سے زیادہ قیمت دوں گا۔ یہ بھی ناجائز صورت ہے۔

اور نرخ پر نرخ کی ممانعت کا مطلب یہ ہے کہ خریدار اور فروخت کنندہ دونوں کسی شے کی بیع پر راضی ہوں لیکن ابھی عقد بیع نہ ہوا ہو کہ ایک شخص بائع سے کہے میں زیادہ قیمت دوں گا قیمت ہو جانے کے بعد یہ بھی ناجائز ہے۔ البتہ نیلام میں زیادہ بولی دینا جائز ہے، کیوں یہ حدیث سے ثابت ہے۔ [ابوداؤد، نسائی، ترمذی]

(۴) بیع نجش کی ممانعت:

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بیع نجش کی ممانعت فرما دی ہے۔ بیع نجش کیا ہوتی اس بارہ میں سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ بیان فرماتے ہیں کہ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

﴿نهى عن النجش﴾

''آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے نجش سے منع فرمایا۔''

[مسلم رقم ۳۷۹۷، بخاری رقم ۲۱۴۲، ۶۹۶۳، نسائی رقم ۴۵۱۷، ابن ماجہ رقم ۲۱۷۳، سنن کبریٰ نسائی ۴/۱۴، سنن کبریٰ بیہقی ۵/۳۴۳، معرفۃ السنن والآثار ۳/۳۸۳، ابن حبان ۱۱/۳۴۲، شرح السنہ بغوی ۸/۱۲۱، مسند احمد ۲/۷، مسند ابی یعلیٰ ۱۰/۱۷۱، کتاب الام للشافعی ۳/۹۱]

نجش کے بارہ میں علامہ ابن ہمام فرماتے ہیں کہ جب کسی چیز کی اصل قیمت لگا دی جائے اس کے بعد اگر کوئی شخص اس کی قیمت بڑھائے حالانکہ اس کا خود خرید کرنے کا ارادہ نہیں ہوتا بلکہ اس کا مقصد صرف دوسرے شخص کو ترغیب دینا ہے تو یہ ''نجش'' ہے اور شریعت اسلامیہ نے اسے ممنوع قرار دیا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس کو روکا ہے۔ کیونکہ

اس کا مقصد ایک مسلمان کو دھوکہ دینا ہے لیکن اگر کسی چیز کی قیمت لگائی گئی ہو اور وہ خریدنے کا ارادہ کیے بغیر اصل قیمت لگوانے کے لیے اس کی قیمت بڑھائے تو یہ جائز ہے کیونکہ اس میں کسی دوسرے کو ضرر پہنچائے بغیر ایک مسلمان کو فائدہ اور نفع پہنچانا مقصود ہے۔ یہ اس وقت ہے جب دوسرا شخص اس چیز کو کم قیمت سے خریدنا چاہتا ہو۔[فتح القدیر:۶/ ۲۱۰۷]

نجش کے ممنوع ہونے پر تمام علماء کا اتفاق ہے۔ آئمہ اربعہ کے نزدیک یہ حرام اور ناجائز ہے۔

نجش کے ناجائز ہونے کی وجہ سے بعض فقہاء نے نیلام کی بیع کو بھی مکروہ قرار دیا ہے کیونکہ نیلام میں بھی لوگ خریداری کی بولی پر بڑھ چڑھ کر لگاتے ہیں۔ چنانچہ امام ابراہیم نخعیؒ کے نزدیک بھی نیلام کی بیع مکروہ ہے لیکن جمہور فقہاء کے نزدیک یہ بیع مطلقاً جائز ہے۔

[فتح الباری ۴/۳۵۴]

جمہور فقہاء کی دلیل یہ ہے کہ سرکار دو عالم ﷺ نے ایک چادر اور ایک پیالہ فروخت کیا اور فرمایا: ''اس چادر اور پیالے کو کون خریدے گا؟'' ایک شخص نے کہا کہ میں اس کو ایک درہم میں خریدوں گا۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ''ایک درہم سے زیادہ کون دے گا'' ایک دوسرے شخص نے دو درہم کہا آپ نے وہ چادر اور پیالہ اس شخص کو دے دیئے۔ امام ترمذی فرماتے ہیں کہ یہ حدیث حسن ہے۔

[ترمذی رقم ۱۹۶، ابوداؤد ۱/ ۲۳۲، نسائی ۲/ ۱۹۰، مجمع الزوائد ۳/ ۸۴، ابن ماجہ رقم ۲۱۹۸، سنن کبریٰ بیہقی ۷/ ۲۵، شعب الایمان بیہقی ۳/ ۴۰۳، شرح السنہ بغوی ۸/ ۱۱۹، مسند احمد ۳/ ۱۰۰، مسند ابوداؤد الطیالسی ۲۸۵، حلیۃ الاولیاء ۳/ ۱۳۲]

(۵) تلقی جلب کی ممانعت:

رسول اللہ ﷺ نے تلقی جلب سے بھی منع فرمایا۔ تلقی جلب کا مطلب یہ ہے کہ کوئی شخص شہر سے باہر نکل کر ان تاجروں کا استقبال کرے جو شہر میں مال فروخت کرنے کے لیے آتے ہیں اور وہ شخص ان اجناس اور مال لانے والوں کے شہر میں داخل ہونے اور شہر کا

نرخ معلوم ہونے سے قبل ان سے ان کا مال خرید لے۔ اس ممانعت کی وجہ یہ ہے کہ تاجروں کو ضرر سے بچایا جائے کیونکہ جب وہ شہر کا بھاؤ معلوم ہونے سے قبل اپنا مال فروخت کر دیں گے تو بسا اوقات ان سے مال خریدنے والا شہر سے کم قیمت پر مال خرید لے گا۔ اس طرح وہ تاجر نفع سے محروم ہو جائیں گے۔ چنانچہ سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے سودا فروخت کرنے والوں کی ملاقات سے منع فرمایا تاوقتیکہ وہ بازار نہ آ جائیں۔

[مسلم رقم ۳۷۹۸، نسائی رقم ۴۵۱۰، بخاری رقم ۲۱۴۹، ۲۱۶۴، ترمذی رقم ۱۲۲۰، ابن ماجہ ۲۱۸۰، سنن کبریٰ بیہقی ۵/ ۳۴۸، معرفۃ السنن والآثار ۴/ ۳۹۰، سنن الدارمی ۲/ ۱۷۰، طحاوی ۴/ ۹، مسند احمد ۲/ ۲۴۸، مسند ابی یعلی ۱۰/ ۴۵۹، معجم اوسط طبرانی ۱/ ۵۱۶، ابن حبان ۱۱/ ۳۴۴، مسند حمیدی ۲/ ۴۴۶]

امام محمد ابن سیرین فرماتے ہیں کہ میں نے سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ نبی اکرم ﷺ نے یہ ارشاد فرمایا:

"سودا بیچنے والوں سے آگے جا کر نہ ملو، جس نے پہلے آگے جا کر سودا خرید لیا پھر سودے کا مالک (تاجر) بازار گیا اور اس کو بازار کا نرخ معلوم ہو گیا تو اس کو بیع فسخ کرنے کا اختیار ہے۔"

[مسلم رقم ۳۸۰۲، نسائی ۴۵۱۳، تحفۃ الاشراف ۱۴۵۳۸]

(۶) شہری کو دیہاتی کا مال فروخت کرنا

رسول اللہ ﷺ نے اس قسم کی بیع سے بھی منع فرمایا ہے۔ جس میں شہری دیہاتی کا مال فروخت کرے۔ [مجمع الزوائد ۴/ ۹۹، طبرانی کبیر رقم ۳۵۴۵]

چنانچہ امام نووی اور حافظ ابن حجر وغیرہ نے لکھا ہے کہ شہری کی دیہاتی سے بیع حرام ہے اور وہ یہ ہے کہ دیہاتی اس وقت کے نرخ پر سودا فروخت کرنے کے لیے شہر میں لائے اور اس کے پاس شہری آ کر کہے کہ اپنا مال میرے پاس رکھو تاکہ میں تمہارے سامان کو موجودہ نرخ سے زیادہ تدریجاً فروخت کر دوں۔ اس بیع کے ممنوع ہونے کی حسب ذیل

شرائط ہیں۔

(۱) بیع کرنے والے کو علم ہو کہ یہ بیع منع ہے اور یہ شرط تمام ممنوعات کو شامل ہے۔

(۲) جو مال وہ لایا ہو اس کی لوگوں کو عام ضرورت ہو جیسے خورد و نوش کا سامان اور چیزیں جن کی عام ضرورت نہیں ہے وہ اس ممانعت میں داخل نہیں ہیں۔

(۳) اس شے کی بیع سے شہر میں وسعت ہو۔ اگر شہر کے بڑے ہونے یا اس شے کے کم ہونے یا اس شے کے عام ہونے اور نرخ کے کم ہونے کی وجہ سے یہ وسعت نہ ہو تو پھر بھی بیع جائز نہیں۔

(۴) شہری دیہاتی پر بیع پیش کرے اور اس کو بیع کی دعوت دے لیکن اگر دیہاتی نے خود شہری سے بیع کی درخواست کی ہے یا اس شے کو فروخت کرنے کیلئے شہری کے پاس ٹھہرنے کا قصد کیا ہے اور شہری نے کہا کہ یہ معاملہ میرے سپرد کر دو تو اس میں کوئی حرج نہیں ہے۔

ان چاروں شرطوں کے باوجود اگر شہری دیہاتی سے سودا خریدے تو اس کا یہ فعل حرام ہے اور بیع صحیح ہے۔ خریدنے والے کیلئے خیار شرط نہیں ہوگا۔ [روضۃ الطالبین ۳/۴۱۲]

(۷) قبضہ سے قبل کسی چیز کا فروخت کرنا

اسلام میں اناج اور دوسرے سامان کا قبضہ سے قبل فروخت جائز نہیں کیونکہ اس سے بائع اور مشتری کے درمیان بہت سی خرابیاں جنم لیتی ہیں۔ چنانچہ سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ بیان فرماتے ہیں کہ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

''جو شخص اناج خریدے وہ قبضہ سے قبل اس کو فروخت نہ کرے۔''

[مسلم رقم ۳۸۲۱، ۳۸۲۲، ۳۸۲۳، تحفۃ الاشراف رقم ۷۹۵۸]

اسی سلسلہ میں ایک اور روایت سیدنا ابن عمر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ ہم سواروں سے ناپ تول کے بغیر اندازاً اناج خریدتے تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ہمیں اس اناج کو وزن کرنے سے قبل فروخت کرنے سے منع فرمایا۔

سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے ایک مرتبہ سیدنا مروان سے کہا کہ کیا تم نے سود کی بیع کو حلال کر دیا ہے۔ مروان نے کہا: میں نے کیا کیا ہے؟ سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا: تم نے ہنڈی (Bill of Exchange) کی بیع کو جائز کر دیا ہے جبکہ رسول اللہ ﷺ نے قبضہ سے قبل اناج کی بیع سے منع فرمایا ہے۔ پھر مروان نے لوگوں کو خطبہ دیا اور لوگوں کو ہنڈی کی بیع سے منع کر دیا۔ سلیمان (راوی حدیث) کہتے ہیں کہ میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ سپاہی لوگوں کے ہاتھوں سے ہنڈیاں چھین رہے تھے۔ [مسلم رقم ۳۸۲۷]

علماء نے قبضہ سے قبل چیز کی بیع کی ممانعت کی بڑی حکمتیں بیان کی ہیں جن میں سے چند ایک حسب ذیل ہیں۔

(۱) بیع قبل القبض میں دھوکا کا امکان ہوتا ہے کیونکہ ممکن ہے کہ بیع (فروخت شدہ چیز) بائع کے پاس ہلاک ہو جائے۔

(۲) جب خریدار مبیع پر قبضہ کر لے گا تو پھر اس میں بائع کے تصرف کرنے کا امکان ختم ہو جائے گا۔ ورنہ ہو سکتا ہے کہ فروخت کرنے کے بعد بائع کو زیادہ قیمت دینے والا کوئی اور گاہک مل جائے تو وہ خریدار کو بیع پر قبضہ نہ دے اور بیع فسخ کر دے۔

(۳) اس زمانہ میں بیع قبل القبض کی وجہ سے سٹے کو فروغ ہوتا ہے اور اجناس اور دیگر اشیائے ضروریہ کی قیمت کئی گنا زیادہ ہو جاتی ہے جس سے صارفین کا استحصال ہوتا ہے۔

(۴) ہمارے ملک میں اسٹاک ایکسچینجوں (Stock Exchanges) میں روزانہ کروڑوں روپے کا سٹے کا کاروبار ہوتا ہے۔ سٹے میں چونکہ صرف کاغذات اور ٹیلی فون پر بیع ہوتی ہے اور عملی طور پر فروخت نہیں ہوتی اور نہ بیع پر قبضہ کیا جاتا ہے اس لیے اس حدیث کی رو سے یہ کاروبار ناجائز ہے۔

(۵) بیع قبل القبض میں ایک شخص کسی سے کوئی شے دس روپے میں خریدتا ہے اور اس شے پر قبضہ کیے بغیر وہی شے پندرہ روپے میں کسی اور شخص کو فروخت کر دیتا ہے جبکہ وہ شے ابھی بائع کے پاس ہے تو اس نے دس روپے کو پندرہ روپوں میں

فروخت کردیا اور یہی شے حکماً سود ہے۔

(۸) مجہول ڈھیر کی بیع ممنوع ہے

کھجور، گندم، جو یا کسی اور شے کا ڈھیر لگا ہوا ہو لیکن اس کی مقدار مجہول ہو، یہ معلوم نہ ہو کہ کھجور اور گندم کتنے من ہے۔ شریعت میں اس کی بیع ممنوع اور ناجائز ہے۔ چنانچہ سیدنا جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں۔

''کھجوروں کے جس ڈھیر کی مقدار پیمائش کے معروف طریقہ سے معلوم نہ ہو اس کو معین کھجوروں کے عوض فروخت کرنے سے رسول اللہ ﷺ نے منع فرمایا۔'' [مسلم رقم ۳۸۲۹، نسائی رقم ۴۵۶۱، ۴۵۶۲]

اس مضمون کی اور احادیث بھی کتابوں میں مرقوم ہیں۔ ملاحظہ ہو

[ابن حبان ۱۱/۳۵۴، شرح السنۃ بغوی ۸/ ۱۰۷، سنن کبریٰ بیہقی ۵/ ۳۱۲، معرفۃ السنن والاثار ۴/ ۳۴۷، مسند حمیدی ۱/ ۲۳۶، معجم کبیر طبرانی ۱۱/ ۲۲، مسند ابی داؤد طیالسی ص ۳۴۰]

(۹) ظہور صلاحیت سے قبل درختوں پر پھلوں کی بیع:

اسلام میں ظہور صلاحیت سے پہلے درختوں پر پھلوں کی بیع سے منع فرمایا گیا۔ ظہور صلاحیت کا مطلب یہ ہے کہ پھل اس مقدار کے ہو جائیں کہ وہ قدرتی آفات سے محفوظ ہو جائیں۔ فقہائے شافعیہ کے نزدیک اس کا معنی پھلوں کا پک جانا اور اس میں مٹھاس کا آ جانا ہے۔ [فتح القدیر، لابن ہمام: ۵/ ۴۸۹]

علامہ ابن ہمامؒ اس بارہ میں مزید لکھتے ہیں کہ ''پھلوں کے ظاہر ہونے کے بعد ان کی صلاحیت ظاہر ہونے سے قبل اگر یہ شرط لگائی جائے کہ پھلوں کو درختوں پر رہنے دیا جائے گا اور توڑا نہیں جائے گا تب بھی اس بیع کے عدم جواز میں کسی کو اختلاف نہیں۔

[فتح القدیر ۵/ ۴۸۹]

موجودہ زمانہ میں اکثر اسلامی ملکوں میں باغات کے پھلوں کی بیع کا طریقہ یہ ہے کہ درختوں پر لگے ہوئے پھلوں کی بیع کی جاتی ہے اور درختوں سے پھلوں کو توڑ کر بیع نہیں

کرتے۔ کبھی ان پھلوں کی صلاحیت کے ظہور سے قبل بیع ہو جاتی ہے اور زیادہ تر بیع اس وقت ہوتی ہے جب پھلوں کا ظہور بھی نہیں ہوتا اور صرف اس کا بور ظاہر ہوتا ہے۔ کبھی اس کے ظہور سے بھی پہلے بیع ہو جاتی ہے۔ پھلوں کی بیع کی یہ تمام صورتیں باطل اور ناجائز ہیں کیونکہ حدیث میں ان کا جائز نہ ہونا آیا ہے۔ نیز پھلوں کے ظہور سے قبل ان کی بیع کے عدم جواز پر تمام فقہاء کا اجماع ہے کیونکہ یہ معدوم کی بیع ہے اور معدوم کی بیع اسلام میں ناجائز ہے۔

باغوں کے پھلوں کی مروجہ بیع کے باطل ہونے کی دوسری وجہ یہ ہے کہ خریدار ان پھلوں کو ایک معینہ مدت تک درختوں پر برقرار رکھتا ہے۔ اگر خریدار پھلوں کو درختوں پر برقرار رکھنے کی شرط سے بیع کرے تو یہ بیع بالا جماع باطل ہے لیکن آج کل پھلوں کی بیع کا یہی طریقہ ہے۔ اگر عدم جواز کے اس حکم کو اپنے ظاہر پر رکھا جائے تو آج دنیا میں کسی جگہ بھی پھل کھانا جائز نہ ہوگا، مگر یہ کہ کوئی شخص اپنے باغ سے خود پھل توڑ کر کھائے، یہ طریقہ اگرچہ اسلام کے خلاف ہے اور مدتوں سے لوگ اسی قسم کی بیع کرتے چلے آرہے ہیں لہٰذا ان کے اس طریقہ کو تبدیل کرنا نہایت مشکل ہے۔ اس لیے اس بیع کے جواز کا حل یہ تلاش کیا گیا ہے۔

اگر بور کے ظہور سے قبل باغ کو خریدا ہے تو اس کے جواز کی صورت یہ ہے کہ ایک مدت معینہ تک باغ کی زمین کرایہ پر مالک سے لے لے۔ پھر پھلوں کے اتارنے تک جو زمین سے افزائش اور روئیدگی ہوگی وہ کرایہ کے عوض اس کا جائز حق ہوگا جیسا کہ علامہ سرخسی نے المبسوط ۱۱/ ۱۹۹ میں لکھا ہے۔

اگر درختوں پر جس قدر بور یا پھل ہوں اس کو مشتری خریدے اور اس کے فصل تک جس قدر بھی پھل آئیں ان سب کو باغ کا مالک خریدار پر حلال کر دے۔ فی الواقع باغوں کے پھلوں کی مروجہ بیع اسی طرح ہوتی ہے۔ خریدار موجود پھل خرید لیتا ہے اور باغ کا مالک فصل پکنے تک پھل اس کے لیے حلال کر دیتا ہے۔

[ملاحظہ ہو المبسوط ۱۲/ ۱۹۷، فتح القدیر ۵/ ۴۹۲]

باقی رہا مسئلہ دیر تک پھلوں کو درختوں کے ساتھ رکھنا کیوں کہ فقہاء کا اس بات پر اجماع ہے کہ پھل خریدنے کے بعد ان کا درختوں سے اتارنا واجب ہے۔ اگر خریدار یہ شرط لگائے کہ وہ پکنے تک پھلوں کو برقرار رکھے گا تو یہ شرط باطل ہے کیونکہ یہ سودا وہ سودا ہے جس کی حدیث میں ممانعت ہے۔ یا یہ اس وجہ سے ممنوع اور ناجائز ہے کہ بیع میں ایسی شرط لگائی گئی ہے جس کا عقد تقاضا نہیں کرتا اور رسول اللہ ﷺ نے بیع اور شرط سے منع فرمایا ہے۔

اس اشکال کا حل یہ ہے کہ بیع بغیر شرط ترک کے کی جائے اور پھر اگر بائع پھلوں کو درخت پر رہنے دینے کی اجازت دے دے تو جائز ہے اور چونکہ عرف یہ ہے کہ بیع میں یہ شرط نہیں لگائی جاتی اور ایک معینہ مدت تک پھلوں کے درختوں پر برقرار رہنے پر بائع کو کوئی اعتراض نہیں ہوتا اس لیے یہاں حکماً بائع کی اجازت حاصل ہے۔

(۱۰) ہنڈی کی بیع

ہنڈی کی بیع بھی اسلام میں جائز نہیں ہے۔ اس میں ہوتا یہ ہے کہ زید نے حبیب سے مال خریدا اور تین ماہ بعد رقم ادا کرنے کا وعدہ کیا۔ اس کیلئے زید نے حبیب کو ایک دستاویز ہنڈی (Bill of Exchange) دی جس میں اس نے لکھ دیا کہ وہ تین ماہ بعد حبیب کو ایک ہزار روپیہ ادا کرنے کا پابند ہے۔ بائع حبیب یہ ہنڈی لے کر بینک گیا اور پانچ فیصد کمیشن پر نو سو پچاس روپے میں یہ ہنڈی کی دستاویز فروخت کر دی۔ پھر بینک مقررہ تاریخ پر حبیب سے ایک ہزار روپے وصول کر لیتا ہے۔ بینک کو اس کاروبار میں پچاس روپے کا فائدہ ہوا اور حبیب کو اپنی رقم جلد مل جاتی ہے۔ کبھی یہ بھی ہوتا ہے کہ بینک وہ ہنڈی دوسرے بینک کو فروخت کر دیتا ہے۔

شرعی طور پر یہ بیع جائز نہیں۔ اس کے عدم جواز کی وجہ یہ ہے کہ اس بیع میں غرر (دھوکہ) ہے کیونکہ اگر مشتری دیوالیہ ہو جائے تو بینک کی رقم ماری جائے گی۔ یا وہ اپنی تمام املاک فروخت کر کے بیرون ملک چلا جائے تو بینک کی رقم ہلاک ہو جائے گی۔ اس کے ناجائز ہونے کی دوسری وجہ علماء نے یہ بیان کی ہے کہ یہ تاخیر اور زیادتی کے ساتھ نقود کا نقود

سے تبادلہ ہے اور اس کی حرمت ربا الفضل میں منصوص ہے۔

(۱۱) مال کی افزونی اور حصول نفع کا ہر ایسا معاملہ جس میں باہمی تعاون قطعاً مفقود ہو اور ایک طرف کا فائدہ دوسری طرف کے یقینی نقصان پر مبنی ہو جیسے جوا، لاٹری اور سٹہ وغیرہ۔ اس میں متعاقدین میں سے ایک جانب کا فائدہ اور دوسری جانب کے مکمل نقصان کا باعث اور سبب بنتا ہے۔ چنانچہ قرآن حکیم میں ہے۔

﴿یَسْئَلُوْنَکَ عَنِ الْخَمْرِ وَالْمَیْسِرِ قُلْ فِیْهِمَا اِثْمٌ کَبِیْرٌ وَ مَنَافِعُ لِلنَّاسِ﴾ [بقرہ:۲۱۹]

''یہ لوگ آپ سے شراب اور جوا کے بارہ میں دریافت کرتے ہیں؟ آپ فرما دیجئے کہ ان دونوں باتوں میں بہت بڑا گناہ ہے اور لوگوں کیلئے کچھ فائدہ بھی ہے۔''

اس آیت میں جوئے کیلئے ''میسر'' کا لفظ استعمال ہوا ہے جو یسار سے ماخوذ ہے جس کے معنی تقسیم کے ہیں۔ جوئے میں بھی مال حصہ داروں میں تقسیم ہوا کرتا ہے اس لیے اس کو ''میسر'' کہتے ہیں۔ بعض حضرات نے لکھا ہے کہ عربی میں جوئے کے لئے میسر اور قمار کے الفاظ استعمال کیے جاتے ہیں۔ ''میسر'' کا لفظ یسر سے بنا ہے جس کے معنی آسانی کے ہے چونکہ جوئے میں جیتنے والا آسانی سے رقم حاصل کر لیتا ہے اس لیے اس کو میسر کہتے ہیں۔

میر سید شریفؒ قمار کی تعریف میں لکھتے ہیں:

''ہر وہ کھیل جس میں یہ شرط ہو کہ مغلوب کی کوئی چیز غالب کو دی جائے گی، قمار ہے۔'' [التعریفات ص ۷۷]

علامہ شامی نے لکھا ہے کہ قمار قمر سے ماخود ہے جو کبھی کم ہوتا ہے اور کبھی زیادہ اور جوئے کو قمار اس لیے کہتے ہیں کہ جوا کھیلنے والوں میں سے ہر ایک اپنا مال اپنے ساتھی کو دینے اور اپنے ساتھی کا مال لینے کو (شرط کے ساتھ) جائز سمجھتا ہے۔ اور یہ نص قرآن سے حرام ہے اور اگر صرف ایک جانب سے شرط لگائی جائے تو جائز ہے۔ [ردالمختار ۵/ ۲۵۸]

چنانچہ لاٹری، معمہ بازی، ریس کورس کی گھڑ دوڑ، تاش، شطرنج، کیرم بورڈ اور دیگر کھیلوں میں ہار جیت پر رقمیں لگانا، کرکٹ، فٹ بال اور سکوائش وغیرہ کے ملکی اور بین الاقوامی کھیلوں میں سٹہ کھیلنا یہ سب قمار اور میسر ہیں۔ گناہ کبیرہ اور حرام قطعی ہیں۔ تمام صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور تابعین عظام کا اس پر اتفاق ہے کہ جوئے کی تمام صورتیں قمار میں داخل اور حرام ہیں اور بقول حافظ ابن کثیر اور ابوبکر جصاص رازی سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ، سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ وغیرہ فرماتے ہیں کہ

﴿المیسر القمار حتی لعب الصبیان بالکعاب والجوز﴾

''یعنی کمار اور جوئے کی سب صورتیں میسر میں داخل ہیں حتیٰ کے بچے گٹوں اور اخروٹوں وغیرہ سے جو کھیلتے ہیں وہ بھی اس میں داخل ہے۔''

مخاطرہ خطرہ سے ماخوذ ہے جس میں نفع نقصان دونوں کا خطرہ ہو۔ چنانچہ یہ بھی ہوتا ہے کہ بہت مال ہاتھ آ جائے اور یہ بھی ممکن ہے کہ کچھ ہاتھ نہ آئے بلکہ اپنے پاس سے کچھ دینا پڑے جیسا کہ آج کل لاٹریوں میں ہو رہا ہے۔ مختلف قسم کے معمے اور لاٹریوں کی قسمیں ایجاد ہو رہی ہیں وہ سب ناجائز ہیں۔ پچھلے زمانہ میں اس میں جس قدر صورتیں اور آئندہ بھی جتنی صورتیں آئیں گی وہ سب ناجائز اور حرام ہیں کیونکہ جوئے میں معاملہ ڈانواں ڈول رہتا ہے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ مال کا سارا تاوان زید پر پڑ جائے اور یہ بھی ممکن ہے کہ تمام خسارہ عمر کے حصہ میں آ جائے۔ البتہ انعام اگر صرف ایک طرف سے مقرر کیا جائے کہ جو شخص فلاں کام کرے گا اس کو یہ انعام ملے گا ایسی صورت میں اگر اس سے کوئی فیس وصول نہیں کی گئی تو اس کو جائز کہا جائے گا کیونکہ اس میں نفع نقصان کے درمیان معاملہ دائر نہیں بلکہ نفع ہونے نہ ہونے کے درمیان دائر ہے۔ چنانچہ صحیح روایات میں شطرنج اور چوسر وغیرہ کو حرام کہا گیا ہے جن میں ہار جیت پائی جاتی ہے تاش میں بھی اگر روپیہ کی ہار جیت ہے تو وہ حرام ہے ورنہ ''لہو'' ہے۔

جوئے میں نفع نقصان کے دونوں پہلو ہیں مگر نقصان کا پہلو غالب ہے اس لیے

اس کی ممانعت کر دی گئی۔ چنانچہ اس میں نفع کا پہلو تو سب کے سامنے ہے کہ ایک بدحال، کنگال اور فقیر بے نوا دم کے دم میں مال دار اور سرمایہ دار بن جاتا ہے مگر معاشی، سماجی، اجتماعی اور روحانی طور پر اس میں کس قدر خرابیاں اور برائیاں ہیں وہ کم ہی لوگ جانتے ہیں۔ اجمالی طور پر اگر ان پر نظر ڈالی جائے تو معلوم ہوگا کہ جوئے کا سارا کھیل اس پر گھوم رہا ہے کہ ایک شخص کا نفع دوسرے شخص کے نقصان پر موقوف ہے۔ گویا جیتنے والے کا نفع ہی نفع ہے اور ہارنے والے کا نقصان ہی نقصان ہے۔ اس طرح ایک کی دولت اس کھیل کی بدولت دوسرے کی طرف منتقل ہو جاتی ہے لہٰذا اس کاروبار سے دولت بڑھتی نہیں بلکہ منجمد ہو جاتی ہے اس لیے مجموعی لحاظ سے قمار قوم کی تباہی اور اخلاق انسانی کی بربادی کا سب سے بڑا ذریعہ ہے۔

انسان کو تو دوسرے انسان کے درد دل اور اس کی ہمدردی اور خیر خواہی کرنے کیلئے پیدا کیا گیا تھا نہ کہ وہ دوسروں کے نقصان میں اپنا نفع اور دوسروں کی مصیبت میں اپنی راحت اور دوسروں کی موت میں اپنی زندگی دیکھتا ہو۔ جو ایسا کرتا ہے وہ انسان نہیں بلکہ انسانوں کا خون چوسنے والا خون خوار درندہ ہے۔ وہ اپنی توانائی اور طاقت اور قابلیت اپنی خودغرضی کی نذر کر دیتا ہے۔ خرید وفروخت اور جائز کاروبار میں چونکہ یہ سب خرابیاں نہیں اس لیے شریعت نے اس کی اجازت تو دے دی ہے کیونکہ تجارت سے مال بڑھتا ہے بیچنے والے اور خریدنے والے دونوں مال کے تبادلہ میں اپنا نفع محسوس کرتے ہیں۔

پھر جوا کھیلنے والا محنت اور مشقت کا عادی نہیں رہتا بلکہ چاہتا ہے کہ بیٹھے بٹھائے منٹوں میں دوسروں کا مال ہتھیا لے اور وہ اسی کا عادی بن جاتا ہے یہاں تک کہ ایک وقت ایسا بھی آتا ہے کہ جس طرح آسانی سے یہ مال اس کے پاس آیا تھا اسی طرح آناً فاناً یہ نکل بھی جاتا ہے گویا ''مال حرام بود بجائے حرام رفت'' جب اس طرح کسی کا بھٹہ بیٹھ جاتا ہے اور وہ دیوالیہ ہو جاتا ہے تب اسے عقل آتی ہے۔

جوئے کا معاملہ اگر دو چار آدمیوں کے درمیان ہو تو اس میں بھی یہ نقصانات بالکل نمایاں نظر آتے ہیں لیکن آج کل جیسے شروب کی نئی نئی قسمیں نکل آئی ہیں اسی طرح

جوئے کی بھی بہت سی قسمیں وجود میں آ گئی ہیں جن میں بہت سی قسمیں اجتماعی ہیں کہ لوگوں کا تھوڑا تھوڑا روپیہ جمع ہو جاتا ہے اور اس میں جو نقصان ہوتا ہے وہ سب پر تقسیم ہو کر نمایاں نہیں رہتا لیکن جس کو یہ رقم ملتی ہے اس کا فائدہ نمایاں ہوتا ہے۔ اس لیے بہت سے لوگ اس شخص کے نفع کو تو دیکھ لیتے ہیں مگر قوم اور لوگوں کے اجتماعی نقصان پر دھیان نہیں دیتے اس لیے ان کا خیال ان نئی قسموں کے جواز کی طرف چلا جاتا ہے۔

حالانکہ اس میں بھی وہ تمام مضرتیں اور خرابیاں موجود ہیں جو چند آدمیوں کے جوئے میں پائی جاتی ہیں بلکہ ایک لحاظ سے اس کا ضرر اس قدیم قسم کے قمار سے بہت بڑھ کر اور اس کے خراب اثرات دوررس اور پوری قوم کی بربادی کا سامان ہیں، کیونکہ ان طریقوں کا لازمی اثر یہ ہوگا کہ ملت کے عام افراد کی دولت گھٹتی جائے گی اور چند سرمایہ داروں کے سرمایہ میں مزید اضافہ ہوتا رہے گا کہ پوری قوم کی دولت سمٹ کر محدود افراد اور محدود خاندانوں میں مرتکز ہو جائے گی اور ارتکاز دولت معاشرہ کی ایک بہت بڑی خرابی ہے جس کا مشاہدہ اور تجربہ سٹہ بازار اور قمار کی دوسری قسموں میں روزمرہ ہوتا رہتا ہے۔

اسلامی معاشیات کا ایک اہم اصول

اس بارہ میں اسلامی معاشیات کا ایک اہم ترین اصول یہ ہے کہ ایسے ہر معاملہ کو حرام قرار دیا گیا ہے جس کے ذریعہ دولت بیشتر لوگوں سے سمٹ کر چند سرمایہ داروں کے ہاتھوں میں آ جائے۔ تقسیم دولت کا اصول بیان کرتے ہوئے اس کا اعلان خود اللہ تعالیٰ نے قرآن حکیم میں ان الفاظ کے ساتھ کیا:

﴿لِئَلَّا یَکُوْنَ دُوْلَةً بَیْنَ الْاَغْنِیَاءِ مِنْکُمْ﴾ [حشر]

یعنی مختلف طبقوں میں مال تقسیم کرنے کا جو اصول قرآن کریم نے مقرر کیا ہے۔ اس کا مقصد اور منشا یہ ہے کہ دولت سمٹ کر چند سرمایہ داروں میں جمع نہ ہو جائے۔

جوا میں بہت سی تمدنی خرابیاں بھی پائی جاتی ہیں کہ شراب کی طرح قمار بھی آپس کے لڑائی جھگڑے اور فتنہ وفساد کا باعث ہے۔ ہار جانے والے کو طبعی طور پر جیت جانے

والے سے نفرت اور عداوت پیدا ہو جاتی ہے اور یہ تمدن اور معاشرت کیلئے سخت مہلک چیز ہے۔

اسی طرح قمار بازی میں مست ہو کر انسان نماز و ذکر اللہ اور عبادت الٰہی سے بھی غافل ہو جاتا ہے اور پھر اس نشہ میں جوئے باز کو بھلے برے کی تمیز بھی نہیں رہتی۔ ممکن ہے کہ انہی مشترک اثرات کی وجہ سے دونوں کو اس آیت میں یک جان بیان فرمایا گیا ہے۔

جوئے میں ایک اصولی خرابی یہ بھی ہے کہ اس میں بغیر کسی معقول معاوضہ کے دوسرے بھائی کا مال لے لیا جاتا ہے گویا لوگوں کا مال غلط طریقہ سے ہڑپ کرنے کا ایک ذریعہ ہے۔ قمار میں ایک بہت بڑی خرابی یہ بھی ہے کہ اس سے بہت سے گھر ایک دم برباد ہو جاتے ہیں، کروڑ پتی کنگال اور قلاش بن جاتا ہے جس سے جوئے باز ہی متاثر نہیں ہوتا بلکہ اس کا پورا گھرانہ اور خاندان بلکہ اگر بنظر غور دیکھا جائے تو پوری قوم متاثر ہوتی ہے۔ کیونکہ اس کی مالی ساکھ دیکھ کر جن لوگوں نے اس سے معاہدات کیے تھے یا قرضے دیئے تھے اب اس کے دیوالیہ ہو جانے سے سب پر اس کی بربادی کا اثر پڑتا ہے۔

جوئے کی ایک خرابی یہ بھی کہ اس سے انسان کی قوت عمل سست ہو کر فوری منافع پر لگ جاتی ہے اور وہ بجائے اس کے کہ اپنی دماغی صلاحیت اور ہاتھ پاؤں کی محنت اور مشقت سے دولت کمائے بڑھائے وہ اس فکر میں بندھ کر رہ جاتا ہے کہ کسی طرح دوسرے کی کمائی پر اپنا قبضہ جمالے۔ غرض کہ اس قسم کی بہت سی خرابیاں جوئے میں پائی جاتی ہیں۔

اوپر دی گئی آیت سے ایک فقہی قاعدہ یہ مستنبط ہوتا ہے کہ کسی شے میں اگر کچھ دنیوی منافع اور فائدے ہوں لیکن نقصانات زیادہ ہوں تو ان غالب نقصانات کی وجہ سے اس کی ممانعت اور بندش کر دی جاتی ہے اور معمولی فائدوں کا خیال نہیں کیا جاتا ہے ورنہ دنیا کی کوئی بری سے بری چیز بھی کچھ نہ کچھ فوائد سے خالی نہیں ہوتی۔ جیسے چوری، ڈاکہ، زنا، اغوا، دھوکہ اور فریب وغیرہ تمام جرائم میں کچھ نہ کچھ فوائد بھی ہوتے ہیں۔ مگر ان میں فوائد نہ ہوتے تو معمولی عقل و خرد اور ہوش و حواس رکھنے والا انسان ان کے پاس نہ پھٹکتا، حالانکہ ان جرائم میں بڑھ چڑھ کر وہی لوگ حصہ بھی لیتے ہیں جو عقل میں بڑھ چڑھ کر سمجھے جاتے ہیں۔

ان کے فوائد سے نقصان چونکہ بڑھے ہوئے ہیں اس لیے اسلام نے ان کی ممانعت کر دی ہے۔ اور واقعی درحقیقت دانش منداور اہل عقل اس سے اجتناب کرتے ہیں۔

اس آیت سے ایک اور فقہی ضابطہ یہ مستنبط ہوا کہ نفع حاصل کرنے کے مقابلہ میں نقصان سے بچنا زیادہ ضروری ہے ایک کام میں نفع نقصان کے دونوں پہلو ہوں تو نقصان کا پہلے خیال کیا جائے گا اور اس کو چھوڑ دینا ضروری ہوگا۔ یہ نہیں کہا جائے گا کہ اس میں چونکہ نفع ہے اس لیے اس کام کو کر لینا چاہیے۔ [معارف القرآن]

آخر میں شراب اور جوا کو قطعی طور پر حرام قرار دے دیا گیا۔ چنانچہ فرمایا:

﴿إِنَّمَا الْخَمْرُ وَالْمَيْسِرُ وَالْأَنْصَابُ وَالْأَزْلَامُ رِجْسٌ مِّنْ عَمَلِ الشَّيْطَانِ فَاجْتَنِبُوهُ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ﴾ [المائدہ:۹۱]

علامہ ابن عابدین شامیؒ نے لکھا ہے کہ اس آیت میں شراب اور جوا کی حرمت پر دس دلیلیں ہیں:

(۱) شراب اور جوا کا ذکر بت اور تیروں کے پانسوں کے ساتھ کیا گیا اور یہ سب حرام ہیں۔

(۲) جوا اور شراب کو رجس (ناپاک) فرمایا گیا اور ناپاک شے حرام ہوتی ہے۔

(۳) شراب اور جوا کو "عمل شیطان" فرمایا اور عمل شیطان حرام ہے۔

(۴) شراب اور جوا سے اجتناب کا حکم دیا جس سے اجتناب فرض ہوا اور اس کا ارتکاب حرام ہے۔

(۵) فلاح کو شراب اور جوئے کے اجتناب سے معلق کیا گیا اس لیے اجتناب فرض اور ارتکاب حرام ہوا۔

(۶) شراب اور جوا کی وجہ سے شیطان عداوت پیدا کرتا ہے اور عداوت حرام ہے۔

(۷) شراب اور جوا کے ذریعے شیطان بغض پیدا کرتا ہے اور بغض حرام ہے۔

(۸) شراب اور جوا کی وجہ سے شیطان اللہ کے ذکر سے روکتا ہے اور اللہ کے ذکر سے روکنا حرام ہے۔

(۹) شراب اور جوا کے سبب سے شیطان نماز سے روکتا ہے جو حرام ہے۔

(۱۰) اللہ تعالیٰ نے صیغۂ استفہام کے ساتھ نہی بلیغ کرتے ہوئے فرمایا: ''کیا تم (شراب پینے اور جوا کھیلنے سے) باز آنے والے ہو؟'' [ردالمختار: ۵/۳۹۶]

(۱۲) ایسا کاروبار بھی اسلام کی نگاہ میں حرام اور ناجائز ہے جس میں معصیت ہو یا حرام اشیاء کی خرید وفروخت ہو یا ان اشیاء کی خرید وفروخت ہو جو اپنی ذات میں نجس ہوں۔ جیسے مردار، خون اور خنزیر کا گوشت وغیرہ۔ شراب بھی ناپاک ہے، اس وجہ سے اس کی تجارت اور خرید وفروخت بھی حرام اور ناجائز ہے۔ چنانچہ سیدہ عائشہ سلام اللہ علیہا فرماتی ہیں کہ جب سود کے بارہ میں سورۃ البقرہ کی آخری آیات نازل ہوئیں تو سرکار دو عالم ﷺ مسجد میں تشریف لے گئے اور شراب کی تجارت حرام فرمادی۔

سیدنا جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ سرکار دو عالم ﷺ نے فتح مکہ کے سال مکہ مکرمہ میں یہ فرمایا: ''اللہ اور اس کے رسول ﷺ نے خمر، مردار، بتوں کی بیع کو حرام کر دیا ہے۔

﴿ان اللہ ورسولہ حرم بیع الخمر والمیتة والخنزیر والاصنام﴾

عرض کیا گیا: ''اے اللہ کے رسول ﷺ! یہ فرمایئے کہ مردار کی چربی کا کیا حکم ہے کیونکہ اس کو کشتیوں میں ملا جاتا ہے اور وہ کھالوں پر لگائی جاتی ہے اور لوگ چراغ جلا کر اس سے روشنی حاصل کرتے ہیں؟ آپ ﷺ نے فرمایا: نہیں، وہ بھی حرام ہے۔ پھر آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''اللہ تعالیٰ یہود کو ہلاک کرے، جب اللہ تعالیٰ نے ان پر مردار کی چربیوں کو حرام کیا تو انہوں نے اس کو پگھلا کر فروخت کر دیا اور اس کی قیمت کھالی۔''

[مسلم رقم ۴۰۲۴، بخاری رقم ۲۲۳۲، ۴۶۳۳، ۴۶۹۶، ابوداؤد رقم ۳۴۸۶، ۳۴۸۷، ترمذی رقم ۱۲۹۷، نسائی رقم ۴۲۶۷، ۴۶۸۳، ابن ماجہ رقم ۲۱۶۷، نیل الاوطار ۵/۱۴۷، سنن کبریٰ، نسائی ۴/۵۴، سنن کبریٰ بیہقی ۹/۳۵۴، ابن حبان ۱۱/۳۱۱، شرح السنۃ بغوی ۸/۲۶، مسند احمد ۳/۳۲۴، مسند ابی یعلیٰ ۳/۳۹۵ وغیرہم]

تجارتی بدعنوانیاں

موجودہ دور میں جب قریباً پوری دنیا میں سرمایہ دارانہ نظام نافذ ہے۔ اس معاشی نظام میں بہت سی تجارتی سہولتیں اور جائز آسانیاں بھی ہیں لیکن بہت سی تجارتی بدعنوانیاں بھی اس نظام میں موجود ہیں جن کی وجہ سے غریب دن بدن غریب تر اور امیر دن بدن امیر تر ہوتا جا رہا ہے۔ اسلام کا اقتصادی نظام ان تمام بدعنوانیوں کا سدباب کرتا ہے جو عام بدحالی اور قابل نفرت سرمایہ داری کو فروغ دیتی ہیں ان بدعنوانیوں میں زیادہ اہم اور مشہور درج ذیل ہیں۔

(۱) احتکار و اکتناز

احتکار کا مطلب یہ ہے کہ دولت سمٹ کر کسی ایک ہی طبقہ میں محدود و محصور ہو کر رہ جائے۔ اسلام نے احتکار کی سخت مذمت کی ہے کیوں کہ اسلام کے معاشی نظام میں یہ بات ہرگز برداشت نہیں کی جاسکتی کہ دولت چند ہاتھوں میں سمٹ کر رہ جائے۔ اس کے اثرات معاشرہ پر نہایت برے پڑتے ہیں۔ جس طرح خون جب تک تمام جسم میں دورہ نہیں کرتا اس وقت تک جسم صحیح طور پر تندرست نہیں رہ سکتا ہے۔ اسی طرح جب تک دولت تمام معاشرہ میں گردش نہ کرے اور ہر شخص کی جیب تک پیسہ نہ جائے معاشرہ صحیح اور تندرست نہیں رہ سکتا۔ سرمایہ داری کے اس کافرانہ نظام میں دولت چند ہاتھوں میں سمٹ کر رہ جاتی ہے اور غریبوں کی جیبوں تک روپیہ نہیں پہنچتا۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ غریب غریب تر اور امیر امیر تر ہوتا رہتا ہے جس سے غریبوں کی قوت خرید کم اور امیروں کی قوت خرید زیادہ ہو جاتی ہے۔

دولت چند ہاتھوں میں سمٹ کر رہ جانے سے غریب کو اپنی غریبی کا احساس ہوتا ہے کیونکہ جب وہ دیکھتا ہے کہ میرا بیٹا فٹ پاتھ پر ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مر گیا اور اس کو کوئی دوا نصیب نہ ہو سکی اور اس کے برعکس امیروں کے کتوں کا علاج ہسپتالوں میں ہو رہا ہے تو اس وقت اس کے دل سے اپنی غریبی کے احساس کی اک ہوک سی اٹھتی ہے کہ میں کیوں غریب ہوا اور

میرے غریب ہونے کے باعث میرا بچہ ہسپتال میں دوائی کے لیے گیا ڈاکٹر نے اس کو دوا نہ دی۔ وہ بغیر دوا کے اس دنیا سے انتقال کر گیا۔ ایک تو وہ غریب تھا اور غریب تو خیر ہر زمانے اور ہر نظام میں رہے ہیں لیکن اسلامی نظام معیشت میں غریب کو اپنی غریبی کا احساس نہیں ہوتا۔ پھر جب غریب یہ دیکھتا ہے کہ ایک طرف امراء اور دولت مند لوگ عیش وعشرت کی زندگی بسر کر رہے ہیں اور دوسری طرف ہم غریب لوگ ڈھور ڈنگروں کی زندگی گزار رہے ہیں تو اس وقت بھی اسے اپنی غریبی کا سخت احساس ہوتا ہے کہ میں غریب کیوں پیدا ہوا۔ اسلام نے اس چیز کو نہایت سختی سے روکا ہے اور پیدائش دولت اور صرف دولت اور تقسیم دولت پر کچھ پابندیاں عائد کیں۔

پیدائش دولت کے باب میں رزق حلال کی تاکید کی کیونکہ سرمایہ دارانہ نظام میں جو لوگ زیادہ سرمایہ دار ہوتے ہیں ان کی پیدائش دولت کے طریقے اکثر وبیشتر ناجائز اور حرام ہوتے ہیں۔ چنانچہ اسلام نے رزق حلال کی تاکید کی۔ رزق حلال کی جدوجہد ذاتی اغراض کے ٹکراؤ سے معاشرہ کو محفوظ کر دیتی ہے اور انسانی توانائیاں مثبت اور مفید تعمیری کاموں پر مرکوز ہو جاتی ہیں جس سے دولت کی پیدائش کا عمل تیز اور مفاسد سے محفوظ ہو جاتا ہے۔ معاشرہ کے تمام افراد کو اپنی صلاحیتیں بے کار چھوڑنے کے بجائے مفید پیداواری کاموں میں صرف کرنی چاہئیں گداگری اور طفیلی پن کی ہر شکل معاشرہ کے توازن کو خراب کر دیتی ہے۔

اسلام نے اکتساب مال کے تمام ناجائز ذرائع کی سختی سے ممانعت کر دی ہے۔ منشیات، سود، جواء، رشوت، لاٹری، چوری، ذخیرہ اندوزی، بلیک مارکیٹ، فحش اور مخرب اخلاق اشیاء کی پیدائش اور فروخت، قحبہ گری، عصمت فروشی، رقص وسرود، کلب اور اس طرح کی دیگر اشیاء کی سرگرمیوں کے ذریعہ روزی کمانا اور ان کی خرید وفروخت اور ان کی پیدائش میں کسی قسم کی معاونت کو حرام اور ناجائز قرار دے دیا گیا ہے کیونکہ اس سے لاتعداد اور ان گنت معاشی، اقتصادی، معاشرتی، سماجی اور اخلاقی مفاسد جنم لیتے ہیں اور معاشرہ کے حسن اور اس کے سکون کو تہ وبالا کر کے رکھ دیتے ہیں۔ علاوہ ازیں اسلامی نظام معیشت میں ضرر اور غرر، جبر واکراہ اور بے گار اور اس قسم کے دیگر ذرائع آمدنی کی بھی ممانعت کر دی گئی

کیونکہ اس سے نہ صرف انسانی عظمت پر دھبہ لگتا ہے بلکہ معاشی سرگرمیوں کا توازن بھی یک قلم بگڑ جاتا ہے جب دولت کی پیدائش پر اس قدر پابندیاں اور قدغنیں ہوں تو یقین جانئے کہ اس زمانہ میں کوئی شخص کروڑ پتی اور ارب پتی ہوسکتا ہے اور نہ ہی کوئی غریب ایسی غربت کی زندگی بسر کرسکتا ہے جس میں اس کو اپنی غربت کا احساس ہو۔

پھر اگر کوئی شخص اتنی پابندیوں کے باوجود کروڑ پتی اور ارب پتی ہو بھی جائے تو شریعت نے صرف دولت پر بہت سی پابندیاں لگا دیں اور دولت کو خرچ کرنے کے ہر ایسے ذریعہ سے منع فرما دیا جس میں بخل اور اسراف کی بو آتی ہو۔ اسلام نے دولت کے خرچ کرنے کے باب میں کفایت شعاری اور میانہ روی کو اپنانے کا مشورہ دیا۔ چنانچہ سرکار دو عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''جس نے مال خرچ کرنے میں میانہ روی اختیار کی وہ کبھی تنگ دستی سے دوچار نہیں ہوگا۔'' کفایت شعاری سے مراد جائز حاجات پر جائز حد تک مال صرف کرنا ہے۔ کفایت شعاری اور میانہ روی انسان کو بہت سے معاشی، معاشرتی اور ذہنی عوارض سے محفوظ کردیتی ہے۔ اس سے بچتیں (Savings) بڑھتی ہیں اور پیداواری عمل کو تیز کرنے کیلئے وسائل میسر آتے رہتے ہیں جو جدید معاشیات میں از حد ضروری ہیں۔

کفایت شعاری اور میانہ روی کی تلقین کے ساتھ ساتھ اسلام نے اسراف اور تبذیر کی شدت کے ساتھ ممانعت کردی۔ ان دونوں سے نہ صرف وسائل کا بے دریغ ضیاع عمل میں آتا ہے بلکہ دولت پیداواری وسائل اور کاموں میں صرف ہونے کے بجائے نام ونمود، فخر وریا اور فسق وفجور کی شیطانی راہوں پر بہ جاتی ہے۔ اسراف وتبذیر سے انسان عیش کوشی کا رسیا ہوکر خلیفۃ اللہ کے بلند مقام سے اخلاقی پستی کی اتھاہ گہرائیوں میں گرکر اپنے انسانی جوہر سے محروم ہوجاتا ہے۔

اسراف وتبذیر کی مذمت کے ساتھ ساتھ اسلام نے بخل اور شح کی بھی مذمت کی اور اس پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے عذاب وسزا کی سخت وعید بھی اسی سلسلہ کی کڑی ہے چنانچہ قرآن حکیم میں ارشاد خداوندی ہے۔

﴿إِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ مَنْ كَانَ مُخْتَالًا فَخُوْرًا o الَّذِيْنَ يَبْخَلُوْنَ

وَ یَاْمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبُخْلِ وَ یَکْتُمُوْنَ مَا اٰتٰهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ وَ اَعْتَدْنَا لِلْکَافِرِیْنَ عَذَاباً مُّهِیْناً﴾ [نساء: ۳۶ - ۳۷]

''بے شک اللہ تعالیٰ ایسے لوگوں کو پسند نہیں کرتا جو (دل میں) اپنے آپ کو بڑا سمجھتے ہوں (زبان سے شیخی اور فخر ومباہات کی باتیں کرتے ہوں) جو خود بھی بخل کرتے ہوں اور دوسروں کو بھی بخل کی تعلیم دیتے ہوں اور جوشئی اللہ تعالیٰ نے ان کو اپنے فضل سے دی ہے اس کو چھپاتے ہوں اور ہم نے ایسے ناشکروں کیلئے اہانت والا عذاب تیار کر رکھا ہے۔''

آیت میں ہے ''دوسروں کو بخل کی تعلیم دیتے ہوں'' عام ہے کہ اپنی زبان سے ان کو ترغیب دیتے ہوں یا اپنے عمل سے تعلیم دیتے ہوں کہ ان کے عمل کو دیکھ کر دوسروں کو بخل کی ترغیب ہوتی ہو۔ بعض علماء نے لکھا ہے کہ مختالاً فخوراً سے مراد وہ متکبر ہے جو اللہ تعالیٰ کی عطاء کی ہوئی چیزوں کو گن گن کر رکھتا ہے اور اللہ تعالیٰ کا شکر ادا نہیں کرتا۔ مولانا تھانوی قدس سرہ نے لکھا ہے کہ آیت میں ''مختال فخور'' آیا ہے جس کا ترجمہ اترانے والا شیخی باز کیا ہے۔ اترانا اپنے آپ ہوتا ہے یعنی دوسرے کے بغیر بھی ہوتا ہے اور شیخی دوسرے کے سامنے اور دوسرے کے مقابلہ میں ہوا کرتی ہے اور بعض علماء نے لکھا ہے کہ ''اختیال'' تو ایسی چیزوں پر اترانا ہوتا ہے جو آدمی کے اندر ذاتی کمال ہوں اور فخر ایسی چیزوں پر ہوتا ہے جو خارجی ہوں جیسے مال اور جاہ وغیرہ۔ [بیان القرآن]

ایک اور مقام پر اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

﴿وَالَّذِیْنَ یَکْنِزُوْنَ الذَّهَبَ وَالْفِضَّةَ وَ لَا یُنْفِقُوْنَهَا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ اَلِیْمٍ، یَوْمَ یُحْمٰی عَلَیْهَا فِیْ نَارِ جَهَنَّمَ فَتُکْوٰی بِهَا جِبَاهُهُمْ وَ جُنُوْبُهُمْ وَ ظُهُوْرُهُمْ هٰذَا مَا کَنَزْتُمْ لِاَنْفُسِکُمْ فَذُوْقُوْا مَا کُنْتُمْ تَکْنِزُوْنَ﴾

[توبہ: ۳۴- ۳۵]

''اور جو لوگ سونا چاندی جمع کر کے خزانہ کے طور پر رکھتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کی راہ میں خرچ نہیں کرتے آپ ان کو بڑے دردناک عذاب کی خوشخبری سنا دیجئے وہ اس دن ہوگا جس دن ان کو (سونے چاندی کو) اول جہنم کی آگ میں تپایا جائے گا پھر ان سے ان لوگوں کی پیشانیوں اور پہلوؤں اور پشتوں کو داغ دیا جائے گا اور کہا جائے گا کہ یہ وہ ہے جس کو تم نے اپنے واسطے جمع کر رکھا تھا۔''

علماء نے لکھا ہے کہ پیشانیوں وغیرہ سے چاروں طرف مراد ہے پیشانی سے اگلا حصہ، پہلوؤں سے دایاں بایاں اور پشت سے پچھلا حصہ مراد ہے اور اس کا مطلب یہ ہے کہ سارے بدن کو داغ دیا جائے گا۔

سیدنا ثوبان رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ جب یہ آیت نازل ہوئی تو ہم اس وقت سرکار دو عالم ﷺ کے ساتھ ایک سفر میں تھے۔ اس آیت کے نزول کے بعد بعض صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے خدمت نبوی ﷺ میں عرض کیا: یا رسول اللہ ﷺ! سونا چاندی جمع کرنے کا تو یہ حشر ہے اگر ہمیں معلوم ہو جائے کہ بہترین مال کیا ہے جس کو ہم جمع کر کے خزانہ کے طور پر رکھیں؟ سرکار دو عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''اللہ کا ذکر کرنے والی زبان، اللہ کا شکر ادا کرنے والا دل اور نیک بیوی جو آخرت کے کاموں میں معین و مددگار ہو۔''

سیدنا عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ جب یہ آیت نازل ہوئی تو وہ رسول اللہ ﷺ کی خدمت اقدس میں حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ یہ آیت تو لوگوں پر بہت بار ہو رہی ہے۔ سرکار مدینہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''اللہ تعالیٰ نے زکوٰۃ اس لیے مشروع فرمائی ہے کہ بقیہ مال پاک ہو جائے اور میراث تو اسی مال میں جاری ہوگی جو بعد میں باقی رہے اور بہترین چیز جس کو آدمی خزانہ کی طرح محفوظ رکھے وہ نیک بیوی ہے جس کو دیکھ کر جی راضی ہو جائے جب اس کو حکم دیا جائے تو فوراً اطاعت کرے اور جب خاوند غائب ہو (یعنی سفر وغیرہ میں ہو) تو وہ اپنی اور اس کے مال کی حفاظت کرے۔''

سیدنا علی رضی اللہ عنہ سرکار دو عالم ﷺ کا ایک ارشاد نقل فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے

مسلمانوں کے امیر اور اغنیاء کے مالوں میں وہ مقدار فرض کر دی ہے جو ان کے فقراء کیلئے کافی ہے۔ فقراء کو بھوکے یا ننگے ہونے کی مشقت صرف اس وجہ سے جھیلنی پڑتی ہے کہ اغنیاء ان کو مال دیتے نہیں۔ خبردار رہو کہ حق تعالیٰ شانہ قیامت کے روز ان امیروں اور اغنیاء سے سخت مطالبہ کریں گے یا سخت عذاب دیں گے۔

سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی ایک حدیث میں ہے کہ اگر اللہ جل شانہ کے علم میں یہ بات ہوتی کہ اغنیاء کی زکوٰۃ فقراء کو کافی نہ ہوتی تو زکوٰۃ کے علاوہ اور کوئی چیز ان کیلئے تجویز فرماتے جو ان کو کافی ہو جاتی۔ پس اب جو فقراء بھوکے ہیں وہ اغنیاء کے ظلم کی وجہ سے ہیں۔ (کہ وہ زکوٰۃ پوری نہیں دیتے)۔ [کنز العمال]

دنیا میں امیری اور غریبی روز اول سے ہی چلی آ رہی ہے کیونکہ امیر اور غریب دونوں ہی اس دنیا کیلئے باعث زینت ہیں۔ ذوق نے سچ کہا

گلہائے رنگا رنگ سے ہے زینت چمن
اے ذوق اس چمن کو ہے زیب اختلاف سے

کسی کو امیر بنانے یا کسی کو غریب رکھنے میں اللہ تعالیٰ کی کوئی نہ کوئی حکمت پوشیدہ ہوتی ہے۔ چنانچہ قرآن حکیم میں ایک مقام پر فرمایا:

﴿وَلَوْ بَسَطَ اللّٰهُ الرِّزْقَ لِعِبَادِهٖ لَبَغَوْا فِي الْاَرْضِ وَلٰكِنْ يُّنَزِّلُ بِقَدَرٍ مَّا يَشَاءُ اِنَّهٗ بِعِبَادِهٖ خَبِيْرٌ بَصِيْرٌ﴾ [شوریٰ: ۲۷]

''اگر اللہ تعالیٰ اپنے سب بندوں کیلئے روزی میں وسعت کر دیتا تو وہ دنیا میں بغاوت (اور فساد) کرنے لگتے، لیکن اللہ تعالیٰ (جس کے لیے) جتنا رزق مناسب سمجھتا ہے اتارتا ہے۔ بے شک وہ بندوں (کی مصالح) سے باخبر (اور ان کے احوال کو) دیکھنے والا ہے۔''

اس آیت سے معلوم ہوا کہ سب پر رزق کی وسعت کا ہونا دنیا میں سرکشی اور فساد کا سبب ہے۔ اگر اللہ تعالیٰ اپنے لطف و کرم سے سب لوگوں کو مال دار بنا دیں تو پھر اس دنیا کا نظام چلنا مشکل ہو جائے۔ سب مل مالکان ہو جائیں اور ملوں میں کام کون کرے؟ سب

آقا اور مالک بن جائیں غلام اور مزدور کون ہو؟ علاوہ ازیں خود قرآن نے کہا ہے کہ ''انسان سرکش ہوتا ہے جب وہ اپنے میں استغناء دیکھتا ہے۔'' [علق: ۶۔۷] گویا استغنا سے اس میں سرکشی اور بغاوت کے جذبات پیدا ہوتے ہیں۔ چنانچہ کتابوں میں ہے کہ عرب میں جس سال پیداوار کی کثرت ہوتی تو عرب ایک دوسرے کو قید کرنا اور قتل کرنا شروع کر دیتے اور جب قحط پڑ جاتا تو یہ سب کچھ چھوڑ دیتے۔

قرآن میں ان آیات کے علاوہ اور بھی بہت سی آیات آئی ہیں جن میں بخل اور شح کی مذمت کی گئی ہے اور لوگوں کو اللہ کے راستہ میں مال خرچ کرنے کی ترغیب دی گئی اور جو اللہ کے راستہ میں مال خرچ نہیں کرتا اس کے لیے دردناک عذاب کی نوید سنائی گئی ہے۔ قرآنی آیات کے علاوہ حدیث کا بھی بہت بڑا ذخیرہ ہے جس میں لوگوں کو غرباء پر مال خرچ کرنے کی ترغیب دی گئی ہے۔ بخاری اور مسلم میں حدیث ہے کہ سیدنا ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: ''میں ایک مرتبہ رسول اللہ ﷺ کی خدمت اقدس میں حاضر ہوا آپ ﷺ اس وقت بیت اللہ کی دیوار کے سایہ میں تشریف فرما تھے۔ مجھے دیکھ کر سرکار دو عالم ﷺ نے فرمایا: ''رب کعبہ کی قسم! وہ لوگ بڑے خسارے میں ہیں؟ میں نے عرض کیا! ''میرے ماں باپ آپ پر قربان وہ کون لوگ ہیں؟'' آپ ﷺ نے فرمایا: ''جن کے پاس مال زیادہ ہو مگر وہ لوگ جو اس طرح اس طرح خرچ کریں اپنے دائیں سے بائیں سے آگے سے پیچھے سے لیکن ایسے آدمی بہت کم ہیں۔

[وقلیل ماھم] [مسلم ۱/ ۲۱۰، ترمذی ۱/ ۷۸]

اس روایت میں یہ بیان کیا گیا کہ مال و دولت کی کثرت فی ذاتہ کوئی محبوب چیز نہیں ہے بلکہ بڑے خسارے اور نقصان کی چیز ہے کیونکہ یہ اللہ تعالیٰ سے غفلت کا سبب بنتی ہے۔ روزمرہ کا یہ مشاہدہ ہے کہ تنگ دستی کے بغیر اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع بہت کم ہوتا ہے اور جو لوگ چاروں طرف اپنی جود و سخا کا ہاتھ پھیلاتے ہوں ان کے لیے مال مضر نہیں ہے۔ لیکن آپ نے حدیث کے آخر میں یہ بھی ارشاد فرمایا کہ ایسے آدمی بہت کم ہیں۔ عام طور سے یہی ہوتا ہے کہ جہاں مال و دولت کی کثرت ہوتی ہے فسق و فجور، آوارگی، عیاشی اور

طرح طرح کی اور کئی برائیاں اپنے ساتھ لاتی ہے اور بے محل خرچ کرنا اور نام ونمود پر صرف کرنا تو دولت کے ادنیٰ کرشموں میں سے ہے۔ شادی بیاہ اور دوسری فضول رسموں میں روپیہ خرچ کرتے وقت اکثر لوگوں کو یہ کہتے ہوئے سنا گیا کہ آخر روپیہ کمایا کس لیے جاتا ہے اگر ان چیزوں پر روپیہ خرچ نہیں کرنا، لیکن اگر انہیں لوگوں کو یہ کہہ دیا جائے ضرورت مندوں، بھوکوں اور حاجت مندوں پر بھی کچھ رقم صرف کردو کیونکہ قرآن کے مطابق اللہ تعالیٰ نے تمہارے مالوں میں ان کا حق رکھا ہے تو اس بات کو سن کر ان کی زبانیں گنگ ہو جاتی ہیں ان کی تجوریاں خالی ہو جاتی ہیں اور غرباء اور مساکین پر خرچ کرنے کے لیے ان کے پاس کوئی مال نہیں ہوتا اور ان پر خرچ کرنے کے لیے ان کے پاس مال کی کوئی گنجائش نہیں ہوتی۔

امام غزالیؒ نے سیدنا یحییٰ علی نبینا وعلیہ الصلوٰۃ والسلام سے ایک روایت نقل کی ہے کہ ایک مرتبہ انہوں نے شیطان سے پوچھا کہ تجھے سب سے زیادہ کون شخص محبوب ہے اور سب سے زیادہ کس شخص سے نفرت ہے؟ اس نے کہا کہ مجھے سب سے زیادہ محبت بخیل مومن سے ہے اور سب سے زیادہ نفرت فاسق سخی سے ہے۔ انہوں نے فرمایا: ''اس کی وجہ کیا ہے؟'' شیطان نے کہا: ''بخیل تو اپنے بخل کی وجہ سے مجھے بے فکر رکھتا ہے یعنی اس کا بخل ہی اس کو جہنم میں لے جانے کے لیے کافی ہے لیکن فاسق سخی پر مجھے ہر وقت فکر سوار رہتی ہے کہ کہیں اللہ تعالیٰ اس کی سخاوت کی وجہ سے اس سے درگزر نہ فرمادیں۔ [احیاء العلوم]

معلوم ہوا کہ سخی اللہ کو محبوب ہے۔ اس کی سخاوت کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کسی وقت بھی اس کے گناہوں سے درگزر فرما کہ اس سے راضی ہو سکتے ہیں۔

اس ساری بحث کا خلاصہ یہ ہے کہ اسلام نے جہاں پیدائش دولت پر پابندیاں لگائیں وہاں صرف دولت پر بھی پابندیاں اور قدغنیں لگائیں کہ مال کو کفایت شعاری اور میانہ روی سے خرچ کرو۔ اسراف وتبذیر سے اجتناب کرو اور اللہ کے راستہ خرچ میں بخل سے کام نہ لو کیونکہ بخل وسائل پیدائش کو روک کر سخاوت کرنے والے خون کو منجمد کر دیتا ہے جس سے سارا نظام معیشت جمود اور تعطل کا شکار ہو کر رہ جاتا ہے۔ ذاتی احتیاجات کی تسکین

کے بعد بچ جانے والے وسائل مستحق حاجت مندوں کی حاجت روائی کیلئے خرچ کیے جائیں یہ انفاق نہ صرف خیر و برکت اور رضائے الٰہی کے حصول اور غرباء ومساکین اور حاجت مندوں کی پرخلوص دلی دعاؤں کا باعث بنے گا بلکہ اس سے مؤثر طلب (Effective Demand) میں بھی اضافہ ہوگا اور پیداواری سرگرمیوں میں تیزی کا رجحان بھی پیدا ہوگا۔

یہ ساری وہ چیزیں ہیں جن سے احتکار کا قلع قمع ہوگا اور دولت سمٹ کر کسی ایک طبقہ میں یا چند ہاتھوں میں محصور اور محدود نہ ہوگی بلکہ پورے معاشرہ میں گردش کرے گی اور ہر شخص اس سے مستفید ہوگا اسلام ہی وہ دین ہے جس نے سرمایہ داروں کو احتکار سے روکا۔ چنانچہ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

﴿لا يحتكر الا خاطئ﴾

[ابو داؤد، جلد ۲ ص ۱۳۲، ابن ماجه نمبر ۲۱۵۴]

''احتکار کرنے والا گناہ گار اور خطا کار ہے۔''

[والحديث اخرجه ايضاً مسلم في المساقاة والترمذي في البيوع، وابن حبان جلد ۱۱ ص ۳۰۸، وابن ابي شيبه جلد ٦ ص ۱۰۲، والبيهقي في السنن الكبرىٰ جلد ٦ ص ۲۹، والبغوي في شرح السنه جلد ۸ ص ۱۷۹، والحاكم جلد ۲ ص ۴۷]

امام ابوحنیفہؒ، امام مالکؒ، امام شافعیؒ اور امام محمدؒ کے نزدیک احتکار صرف غذائی اشیاء میں ہے۔ [ملاحظہ ہو مغنی ابن قدامہ جلد ۴ ص ۲۴۴، نووی شرح مسلم جلد ۱۱ ص ۴۳] لیکن امام ابو یوسفؒ کے نزدیک احتکار کی حرمت صرف غذائی اشیاء میں نہیں ہے بلکہ ہر وہ شی جس سے عامۃ الناس کو ضرر پہنچے اس کا چند لوگوں میں سمٹ جانا اور اس کا روک رکھنا احتکار ہے اور حرام ہے۔ [ردالمختار جلد ۵ ص ۲۸۲] امام شوکانیؒ نے لکھا ہے کہ اس شی کا روک رکھنا احتکار کہلاتا ہے جس سے انسانوں اور جانوروں کو تکلیف پہنچے۔

ایک اور حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے احتکار کرنے والے کے بارہ میں ارشاد فرمایا:

﴿المحتکر ملعون﴾

[ابن ماجه نمبر ۲۱۵۳، مسند دارمی جلد ۲ ص ۱۶۵]

''احتکار کرنے والے پر خدا کی پھٹکار۔''

ابن ماجہ ہی نے ایک اور حدیث نقل کی ہے کہ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ

''جو شخص احتکار کا جرم کرے اور مسلمانوں پر کھانے کی اشیاء کو روک دے اللہ تعالیٰ اس کو جذام اور افلاس میں مبتلا کرے۔''

اس حدیث کے بارہ میں محدث عبدالرؤف مناویؒ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جذام اور افلاس کا ذکر اس لیے کیا کہ **محتکر** کا مطلب احتکار سے یہ ہوتا ہے کہ اس کی صحت اچھی رہے اور اس کے مال میں اضافہ ہو، چنانچہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ اس کے بدن کو جذام ہو اور اس کا مال تباہ و برباد ہو کر وہ مفلس و کنگال ہو جائے۔ [فیض القدیر جلد ۶ ص ۳۵]

احتکار و اکتناز قریباً ہم معنی ہیں لیکن فقہ کی اصطلاح میں احتکار سے مراد یہ ہے کہ کوئی شخص غلہ وغیرہ کو بڑی مقدار میں خرید کر ذخیرہ کر لے اور جب بازار میں غلہ گراں ہو جائے اور عوام میں اس کی طلب اور مانگ کا مرکز صرف وہی بن جائے۔ اور عوام اس کے مقررہ نرخ پر لینے پر مجبور ہو جائیں اور وہ اپنی مرضی کے مطابق گراں فروشی کر سکے۔ اس احتکار کی مثال آج برصغیر پاک وہند میں عام ملتی ہے بلکہ ہندوستان میں تو شاید کم ہو اب پاکستان کے تاجر اس ذخیرہ اندوزی اور گراں فروشی میں بھارت کے تاجروں سے دس قدم آگے ہیں، لہٰذا پاکستان میں اب زیادہ کنج دکاؤ کی چنداں ضرورت نہیں۔ ہر شہر میں آپ کو اس قسم کے ذخیرہ اندوز ملیں گے۔ رمضان کی آمد سے قبل ذخیرہ اندوز اپنے گودام سستے داموں اشیائے خوردنی اور دوسری استعمال کی اشیاء خرید لیتے ہیں اور پھر جونہی رمضان آیا ہر چیز کے دام آسمان سے باتیں کرنے لگتے ہیں۔ رمضان میں ان ذخیرہ اندوزوں کی عید ہو جاتی ہے جبکہ صارفین کا محرم ہوتا ہے۔ غریب عوام ان گراں فروشوں اور ذخیرہ اندوزوں کے ہاتھوں لٹتے ہیں اور غریب دن بدن غریب تر اور امیر امیر تر ہوتا جاتا ہے۔ اسی وجہ سے

احتکار کرنے والے کو حدیث میں ملعون کہا گیا کہ وہ اپنی گراں فروشی کی وجہ سے کتنے غریبوں کی بددعائیں لیتا ہے۔ کیونکہ اس گروہ کی وجہ سے کاشتکار اور غریب عوام اقتصادی اور معاشی بدحالی کا شکار بنتے رہتے ہیں۔ سود کے بعد سب سے زیادہ غرباء کو بدحالی اور پریشان کرنے والی چیز یہی احتکار و اکتناز ہے۔ جب دولت اور کھانے پینے کی اشیاء چند ہاتھوں میں سمٹ جاتی ہیں اور پھر وہ طلب پر منہ مانگی قیمت لوگوں سے وصول کرتے ہیں اور غریب اپنی جان بچانے کیلئے مجبوراً قرض لے کر یا اپنی دوسری ضرورتوں کو بالائے طاق رکھ کر کھانے پینے کی اشیاء مہنگے داموں خریدتے ہیں تو اس وقت ان کے دلوں کی اتھاہ گہرائیوں سے ان ذخیرہ اندوزوں کیلئے بددعاؤں کا جو دھواں اٹھتا ہے وہ عرش الٰہی کو ہلا کر رکھ دیتا ہے۔

اسلام نے اس ذخیرہ اندوزی کو ناجائز اور حرام قرار دیا کیونکہ اس سے دولت کا ارتکاز ہوتا ہے اور اسی ارتکاز دولت کی وجہ سے روز بروز غربت میں اضافہ ہوتا جارہا ہے۔ ایک طرف لاکھوں کروڑوں حاجت مند اور غریب ہیں اور دوسری طرف زمین کی پیداوار اور کارخانوں اور فیکٹریوں کی مصنوعات کے انبار لگے ہوئے ہیں مگر خریدے نہیں جاسکتے یہاں تک کہ لاکھوں من گیہوں اور چاول سمندر میں پھینکا جاتا ہے لیکن وہ بھوکے انسانوں کے پیٹ نہیں بھرتا۔ سمندر میں وہ غلہ اس لیے پھینکا جاتا ہے کہ منڈی میں اس کا بھاؤ نہ گر جائے۔

علامہ اقبالؒ نے فرمایا ہے کہ ''اسلام وہ دین ہے جس میں غرباء، امراء اور اغنیاء پر ٹیکس عائد کرتے ہیں اور یہ کوئی بھیک اور خیرات نہیں بلکہ غرباء اور مساکین اور مالی محرومین کا قانونی حق ہے جو امراء کے ذمہ عائد ہے اور جب تک امراء اس حق کو ادا نہ کریں وہ خدا اور رسول اللہ ﷺ اور تمام غرباء اور مساکین کے مجرم اور مقروض ہیں۔''

موجودہ معیشت میں بھی ماضی کی طرح لوگ اپنی دولت کاروبار میں لگانے کے بجائے تاکہ پورے معاشرہ میں دولت گردش کرے، دفینوں کی صورت میں رکھنا پسند کرتے ہیں لیکن اسلام اس کا سدباب بھی نظام زکوٰۃ کے ذریعہ کرتا ہے کیونکہ دفینوں اور بینکوں میں جمع شدہ رقوم پر زکوٰۃ عائد ہوتی ہے اور اگر اس دولت کو کاروبار میں نہ لگایا جائے تو چند

سالوں میں اس دولت کے ختم ہونے کا اندیشہ ہوتا ہے۔اس لیے اس دولت کولوگ کاروبار میں لگانا پسند کریں گے یا پھر کسی دوسرے شخص کے ساتھ شراکت اور مضاربت کا معاملہ کریں گے جس کے نتیجہ میں دولت کے ارتکاز واکتناز کے بجائے معیشت میں پھیلاؤ اور وسعت پیدا ہوگی اور غرباء کو روزگار کے مواقع بھی میسر ہوں گے جس کی تفصیل زکوٰۃ کے باب میں آئے گی۔(تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو احقر کی کتاب ''اسلام کا نظام زکوٰۃ۔''

قمار یا سٹہ:

احتکار کی دوسری جزئی ''قمار'' ہے اس سے مراد جوئے کی وہ عام شکل نہیں ہے جو مال سے کھیلا جاتا ہے بلکہ اس میں جوئے کی وہ تمام صورتیں داخل ہیں جو موجودہ زمانہ میں تجارت کے نام پر کی جاتی ہیں۔مثلاً سٹہ وغیرہ اس کو تجارتی جواء کہا جاتا ہے جو تجارت کے نام پر موجودہ نظام معیشت میں کھیلا جاتا ہے۔یہ تجارتی جواء ملک کے معاشی نظام کو کس طرح تباہ و برباد اور پراگندہ کرتا ہے، آپ اس کا اندازہ نہیں لگا سکتے اور بغیر محنت کے نفع حاصل کرنے کے لالچ میں کس طرح ہزاروں گھر خانمان برباد ہو جاتے ہیں۔زمانہ جاہلیت میں بھی اس قسم کی بہت سی شکلیں رائج تھیں جیسے ملامسہ، منابذہ وغیرہ جس کا ذکر گزشتہ صفحات میں کیا جا چکا ہے۔اسلام نے اس قسم کی خرید وفروخت کو حرام اور ناجائز قرار دیا ہے بلکہ اس کو میسر اور قمار (جوا) قرار دیا ہے اور اس قسم کے تمام معاملات کو ایک بااصول تجارت کیلئے تباہ کن سمجھتا ہے اور سوسائٹی کے اخلاق اور کریکٹر کے باعث ذلت ورسوائی جانتا ہے۔علاوہ ازیں ان کو معاشرتی تباہی کا پیش خیمہ یقین کرتا ہے۔

اسلام کا ایک اصول ہے جس کا ذکر گزشتہ صفحات میں کیا گیا ہے کہ ''مسلمان نہ کسی کو نقصان پہنچائے اور نہ کوئی اس کو نقصان پہنچائے۔'' ہر وہ کاروبار اور تجارت اسلام کی نگاہ میں درجہ جواز سے گری ہوتی ہے جس میں منازعت کا اندیشہ ہو۔سٹے اور قمار و میسر کے معاملات میں اکثر و بیشتر جنگ وجدل کا اندیشہ ہوتا ہے اور یہ مواسات، رواداری، ہمدردی اور مروت کے جذبات کو تباہ اور دوسرے کی تباہی میں اپنا فائدہ سمجھنے کی ترغیب دے کر جو ہر

انسانی کو تباہ و برباد کرتے ہیں۔ احتکار کی یہ دوسری قسم ہے جو اس لیے ممنوع ہے کہ یہ بھی دولت اور سرمایہ کو بعض افراد یا گروہ میں مخصوص کر دینے کا باعث بنتی ہیں اور ایک کو تباہ و برباد کر کے دوسرے کے فائدہ کی صورت نکالتی ہے۔ یہ ایک ایسا گناہ اور جرم ہے جس کو اسلام یک قلم پسند نہیں کرتا اور اسلام تو کیا یہ انسانیت اور اخلاق کی نگاہ میں بھی ایک بہت بڑا جرم ہے کہ آدمی دوسرے کو تباہ و برباد کر کے اپنے کو بنائے۔ یہ جرم سوسائٹی کی نظر میں بھی ایک ناقابل معافی گناہ ہے۔

سٹہ کیا ہے؟ سٹہ دراصل بیع قبل القبض کا نام ہے یعنی ایک چیز جاپان سے پاکستان میں درآمد ہونے کے لیے چلی ہے۔ اس کے پاکستان پہنچنے سے پہلے ہی اس کی کئی ہاتھوں میں خرید و فروخت ہو جاتی ہے یا اسٹاک ایکسچینج (Stock Exchange) میں مختلف فرموں کے حصص کی خرید و فروخت ہوتی ہے حالانکہ ان کا صرف زبانی زبانی اس پر قبضہ ہوتا ہے۔ اسلام نے بیع قبل القبض کو ناجائز قرار دیا، چنانچہ سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جو شخص اناج (غلہ) خریدے وہ اس کو وزن کرنے سے پہلے فروخت نہ کرے۔ سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ:

﴿احسب کل شی مثلہ﴾ [مسلم نمبر: ۳۷۳۲]

''یعنی میں ہر شے کو اناج پر قیاس کرتا ہوں۔''

سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا: ''جو شخص اناج خرید لے وہ قبضہ سے پہلے اس کو فروخت نہ کرے۔'' [مسلم نمبر ۳۷۳۲]

اور اس کی حکمت واضح ہے کہ جب خریدار بیع پر قبضہ کر لے گا تو اس میں بائع کے تصرف کرنے کا امکان ختم ہو جائے گا ورنہ ہو سکتا ہے کہ فروخت کرنے کے بعد بائع کو زیادہ منافع والا کوئی اور گاہک مل جائے اور وہ خریدار کو مبیع پر قبضہ نہ دے اور بیع فسخ کر دے۔ موجودہ زمانے میں بیع قبل القبض سے سٹے کو فروغ ہوتا ہے اور اجناس کی قیمت دس بیس گنا زیادہ ہو جاتی ہے جس سے صارفین کا استحصال ہوتا ہے۔ جس کی مثال ہم نے جاپان سے

درآمد کے سلسلہ میں دی ہے۔ ہمارے ملک میں ہر روز لاکھوں روپے کا سٹے کا کاروبار ہوتا ہے اور سٹے میں چونکہ کاروباری ساکھ اور کمپنیوں کے لمیٹڈ ہونے کی بنیاد پر صرف کاغذات اور ٹیلی فون پر سونے، روئی وغیرہ کی بیع ہوتی ہے اور عملی طور پر کوئی خرید وفروخت نہیں ہوتی اور نہ مبیع پر قبضہ کیا جاتا ہے اس لیے شریعت میں یہ کاروبار نا جائز ہے۔

سٹے کا یہ کام قمار میں شمار ہوتا ہے اور قمار کے بارہ میں ارشاد ربانی ہے:

﴿يَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الْخَمْرِ وَالْمَيْسِرِ قُلْ فِيْهِمَآ اِثْمٌ كَبِيْرٌ وَّ مَنَافِعُ لِلنَّاسِ وَ اِثْمُهُمَآ اَكْبَرُ مِنْ نَّفْعِهِمَا﴾ [بقرہ: ۲۱۹]

''لوگ آپ سے شراب اور جوئے کے بارہ میں دریافت کرتے ہیں آپ فرما دیجئے کہ ان دونوں میں بڑا گناہ ہے اور لوگوں کیلئے کچھ فائدے بھی ہیں لیکن ان دونوں کا گناہ ان کے فائدے سے کہیں زیادہ بڑھا ہوا ہے۔''

شراب اور جواء عربوں کی گھٹی میں پڑا ہوا تھا اور عرب شاعروں نے اپنے قصائد میں جوئے اور شراب کا کثرت سے ذکر کیا ہے۔ عرب لوگ شراب پیتے اور جواء کھیلتے اس غرض سے اونٹوں کو ذبح کر کے ان کے گوشت کو دس ٹکڑوں میں منقسم کرتے اور انہی ٹکڑوں پر پانسے ڈال کر لاٹری نکالتے۔ ان پانسوں کی صورت یہ تھی کہ دس تیر مقرر کر لیتے تھے جن کے نام یہ ہیں۔

فذ، توام، رقیب، حلس، سبل، معلی، منافس، منیح، سفیح، وغد، ان میں سے ہر تیر کے مختلف حصے معین کر لیے تھے اور جب جواء کھیلتے تو ان کو ایک تھیلے میں ڈال کر ایک منصف شخص کے ہاتھ میں دے دیتے۔ وہ ایک ایک تیر کو ایک ایک نام پر نکالتا جن کے نام پر وہ تیر نکلتے تھے اور جن جن کے حصے مقرر تھے وہ کامیاب ہوتے تھے اور جن تیروں پر کوئی حصہ نہ ہوتا تھا وہ جن کے نام پر نکلتے وہ ناکام ہوتے۔ اس طرح جو گوشت اکٹھا ہوتا وہ فقیروں، غریبوں اور محتاجوں میں تقسیم کر دیتے چونکہ یہ فیاضی کے اظہار کا ایک طریقہ تھا اس لئے قمار

بازی کی مجلسوں میں شریک نہ ہونا ایک قومی عار سمجھا جاتا تھا اور وہ اس قسم کے لوگوں کو نہایت بخیل خیال کرتے تھے۔

رفتہ رفتہ اس جوا بازی کا مذاق ان میں اس قدر عام ہوگیا تھا کہ لوگ مال و دولت کھو چکنے کے بعد بیوی اور اولاد پر بازی لگا دیتے۔ یہ قمار بازی اور وہ بھی شراب کی بدمستی میں اکثر مار پیٹ اور لڑائی پر ختم ہوتی۔ آپ یہ سن کر حیران ہوں گے اور عبس اور ذبیان چہل سالہ گھوڑ دوڑ بھی قمار بازی کا نتیجہ تھی۔ حصول دولت اور کسب شہرت کے اس غلط طریقہ سے خاندان کے خاندان تباہ ہو جاتے تھے۔ [سیرۃ النبی جلد ۴ ص]

حضرت شیخ الہندؒ نے اس جوئے اور شراب کے بارہ میں فرمایا:

''شراب اور جوئے کے حق میں کئی آیتیں اتری ہیں ہر ایک میں ان کی برائی ظاہر کی گئی ہے۔ آخر سورۃ المائدہ کی آیت میں صاف صاف ممانعت کردی گئی۔ اب جو چیزیں نشہ لاویں وہ سب حرام ہیں اور جو شرط باندھی جائے کسی چیز پر جس میں ہار جیت ہو وہ محض حرام ہے اور ایک طرف کی شرط حرام نہیں۔'' [فوائد عثانی: ص ۴۳]

اس آیت میں ''فیھما اثم کبیر'' میں بڑی گہری معنویت ہے۔ معاشرے میں آج تک جتنے فسادات شراب نوشی سے پیدا ہو چکے ہیں اظہر من الشمس ہیں۔ گالیاں یہ بکوائے بے حیائی یہ پھیلائے، حرام کاری کی طرف یہ بلائے، بلوے اور دنگے یہ کرائے، چوری ٹھگی پر یہ آمادہ کرے، قتل کی نوبت یہ لے آئے، ہر عبادت سے، طہارت سے اور پاکیزہ نفسی سے یہ روک دے اور قمار بازی کی لائی ہوئی مصیبتیں بھی اس سے کچھ کم نہیں۔

[تفسیر ماجدی]

اس فقرے کے ذریعہ قرآن حکیم نے اصل سوال کا جواب یہ دیا ہے کہ اس میں بعض رفاہی فائدے بھی ہیں لیکن ان دونوں سے معاشرہ کو جو نقصان پہنچتا ہے وہ ان کے فوائد سے کہیں زیادہ ہے۔ اس وجہ سے اخلاقی بہبود کے نقطہ نظر سے یہ ناجائز ہیں گویا قرآن

حکیم نے اسلامی قانون کا یہاں یہ مزاج بتادیا کہ جن چیزوں کا نقصان ان کے نفع سے زیادہ ہو وہ اسلامی قانون میں ممنوع ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ جو چیزیں اخلاقی اعتبار سے مضر ہیں اگر ان سے بظاہر کوئی فائدہ لوگوں کو پہنچتا بھی ہو یا پہنچایا بھی جاسکتا ہو تب بھی اس کے ضرر کے پہلو کے غلبہ کی وجہ سے اسلام میں اس سے احتراز و اجتناب ضروری ہے۔ مثلاً ہوسکتا ہے کہ کسی جگہ لوگ لاٹری ڈالیں تا کہ اس کی آمدنی سے ایک شاندار مسجد تعمیر کی جائے یا ایک امدادی شو منعقد کریں تا کہ ان کے ٹکٹ فروخت کر کے کسی مصیبت زدہ علاقے کے مسلمانوں کی مدد کریں۔ بظاہر یہ کام نیکی اور خدمت خلق کے ہیں لیکن اسلام اس قسم کی نیکی کے جواز کو تسلیم نہیں کرتا کیونکہ اس نیکی کے پردے میں جو بدی پرورش پاتی ہے یا اس مصلحت کی آغوش میں جو مقاصد پروان چڑھ رہے ہیں ان کا وزن مصلحت اور نیکی سے کہیں زیادہ ہے۔ ہمارے فقہاء اور قانون دان طبقہ نے اسی کو ''درء المفاسد الی من جلب المصالح'' کے عنوان سے پیش کیا ہے۔ مفاسد کی حیثیت فقہاء کی نظر میں وباء کی ہے۔ وباء کو دور کرنے کا بہر حال بندوبست کیا جائے گا خواہ اس کے نتیجہ میں کچھ مصالح اور منافع خطرے میں پڑ جائیں۔ اسی وجہ سے قرآن حکیم نے منشیات سے روکنے کا زیادہ اہتمام کیا ہے اور اسی بناء پر فقہاء نے منشیات کی تجارت پر قدغن قائم کی ہے خواہ اس میں تجارتی منافع موجود ہو اور اسی لیے کسی مالک مکان کو ایسی جگہ کھڑکی وغیرہ رکھنے کی اجازت نہیں دی جہاں سے پڑوسیوں کی مستورات پر نظر پڑتی ہو۔

اللہ تعالیٰ کی پیدا کی ہوئی کائنات میں سرے سے مضر ہی مضر اور ہر طرح کے نفع اور مصلحت سے خالی کوئی شے نہیں مثلاً شراب سے بعض بیماریوں کا علاج ہوسکتا ہے۔ بعض شرابیں خوشبو رکھتی ہیں شراب سے فوری لذت اور سرور حاصل ہوتا ہے بعض قوتوں میں عارضی طور پر تحریک پیدا ہوتی ہے اور اسی طرح جوئے میں جو جیتتا ہے اسے بلا مشقت و تعب تھوڑی سی دیر میں آمدنی ہو جاتی ہے۔ قرآن نے یہاں شراب اور جوئے کے جن منافع کا ذکر کیا ہے وہ ان کے مادی اور طبی فوائد ہیں جیسا کہ بعض لوگوں کا خیال ہے۔ ہمارے

نزدیک ان کی یہ بات درست نہیں ہے بلکہ یہ دراصل ان فوائد کی طرف اشارہ ہے جو اس وقت کی عرب سوسائٹی میں مخصوص روایات کی بناء پر پائے جاتے تھے یعنی شراب پی کر جوا کھیلنا اور جوئے کے نتیجہ میں جو کچھ دریافت ہوا سے غریبوں میں تقسیم کر دینا۔ یہ ان کے یہاں بڑی اونچی بات تھی اور اسے کمالات میں شمار کیا جاتا تھا۔ قرآن حکیم یہاں انہی رفاہی فوائد کی طرف اشارہ کر رہا ہے ورنہ قرآن کو اشیاء واعمال کے طبی اور مادی فوائد سے کوئی سروکار نہیں ہے۔ قرآنی بلاغت کا بھی یہی تقاضا ہے۔ اگر طبی اور مادی فوائد قرآن حکیم کے پیش نظر ہوتے تو آیت میں نفع کا مقابلہ اثم سے نہیں ضرر سے ہوتا۔ اثم کا لفظ کبھی نقصانات کے لیے استعمال نہیں ہوتا بلکہ اخلاقی مقاصد اور گناہوں کے لیے آتا ہے۔ اگر شراب کے طبی نفع کی وضاحت کرنی پیش نظر ہوتا تو نفع کے مقابلہ میں ضرر کا لفظ آتا ''اثم'' نہ آتا۔

اس آیت کے علاوہ قرآن حکیم میں سورۃ المائدہ میں فرمایا:

''بے شک شراب، جواء، بت اور پانسے یہ سب سرتا سر نجاست ہیں اور کار شیطان ہیں پس تم ان سے بچو۔'' [المائدہ:۹۰]

قمار بازی جس میں لاکھوں اور کروڑوں کی دولت لوگوں کو اس طرح مل جاتی ہے کہ ملک کے کسی باشندے کو اس کے معاوضہ میں کچھ نہیں ملتا۔ جوئے میں جتنے غصہ اور غیظ وغضب سے بھرے ہوئے دل سے مال دیا جاتا ہے شاید اتنا غصہ اور اتنا غیظ تو چور اور ڈاکو پر بھی اس کو نہیں ہوتا جس کا مال چوری ہو جاتا ہے۔

حکیم الامت حضرت شاہ ولی دہلوی قدس سرہ اس قسم کے جواء کے معاملات کی حکمت بیان فرماتے ہوئے لکھتے ہیں۔

''حق تعالیٰ شانہ نے جب مخلوق کو پیدا فرمایا اور اس کرہ اغبر پر ان کی معاش کا انتظام فرمایا اور ان سے فائدہ اور نفع حاصل کرنے کا ان کو موقع فراہم کیا تو انسانوں کے درمیان جنگ وجدل اور کش مکش برپا ہوگئی۔ تب حق تعالیٰ شانہ کے قانون کا یہ فیصلہ ہوا کہ جو شخص ذاتی

محنت، وراثت یا دوسرے کسی جائز اور صحیح طریق سے کسی شے کا مالک ہے اس کی چیز میں دوسرا کوئی شخص مزاحمت اور کش مکش کا حق دار نہیں ہے۔ البتہ دوسرے کو بدل کے ذریعہ خریداری اور معتبر وصحیح رضامندی کے ساتھ معاملہ سے اس شے کو حاصل کرنے کا حق ہے بشرطیکہ خرید وفروخت کرنے والوں کے درمیان اس معاملہ کا علم ویقین ہو، اور فریب، چال بازی اور دھوکہ دہی کا اس میں کوئی شائبہ نہ ہو اور جب کہ انسان مدنی الطبع ہے اور اس کی معیشت باہمی تعاون کے بغیر ناممکن ہے تو اللہ تعالیٰ نے باہمی تعاون کو بھی ضروری قرار دیا ہے پس اگر کوئی معاملہ اس طرح کیا جائے جس میں نہ صحیح بدل موجود ہو اور نہ ہی باہمی تعاون پایا جاتا ہو بلکہ دوسرے کو نقصان دے کر نفع حاصل کرنا مقصود ہو۔''

جیسے قمار (جوا) یا اس میں صحیح رضامندی موجود نہ ہو جیسے سود تو یہ تمام طریقے باطل اور ظلم ہیں اور ایسے معاملات ناجائز اور حرام ہیں۔

[حجۃ اللہ البالغہ: جلد۲ ص۱۰۳]

ایک اور مقام پر حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ فرماتے ہیں:

''جوئے میں لوگوں کے مال کو اس طرح اچک لیا جاتا ہے کہ اس میں بالکلیہ جہالت، حرص اور جھوٹی آرزوؤں کے ہاتھوں آدمی گرفتار ہو جاتا ہے اور دھوکہ کی گاڑی پر سوار ہو کر اس میدان میں کودتا ہے اور حرص اور غلط آرزو وغیرہ اس کو ان شرائط کے مان لینے پر آمادہ کر دیتی ہیں جنہیں نہ شہری زندگی کی تعمیر میں اور نہ باہمی امداد وتعاون میں دخل ہے۔ ہارنے والا اگر ہارنے کے بعد خاموش ہوتا ہے تو اس کی یہ خاموشی غصہ اور ایسی ناکامی ونامرادی کی چنگاریوں پر ہوتی ہے جن میں وہ بالا رادہ گیا تھا۔ یوں ہی جیتنے والا اپنی جیت سے لذت اندوز ہوتا ہے اور اس کا

کاروبار اور اس کی چھوٹی مقدار بڑی مقدار کو دعوت دیتی ہے اور اس کو حرص اس فعل سے باز کرنے کی اجازت نہیں دیتی بالآخر کچھ ہی دنوں کے بعد اس کا تاوان خود ہی اس کے سر پر مسلط ہو جاتا ہے۔''

''اگر کسی ملک کے باشندوں میں لین دین کی اس عادت بد کا رواج پیدا ہو جاتا ہے تو بالآخر اس کا نتیجہ ملک کی دولت عامہ کے نظام میں بگاڑ پیدا ہو جاتا ہے اور باہم ایک طویل جھگڑوں کی بنیاد پڑ جاتی ہے اور حصول معاش کے جو صحیح اور مطلوب ذرائع ہیں ان کے دروازے بند ہونے لگتے ہیں لوگ باہمی امداد و اعانت سے پہلے بے پرواہو جاتے ہیں جس پر تمدن کی بنیاد قائم ہے۔''

اور آخر میں حضرت شاہ صاحبؒ فرماتے ہیں:

''دوسروں کی خبر سے خود معائنہ اور مشاہدہ تمہیں بے نیاز کر سکتا ہے۔ آخر جواریوں میں تم نے ان امور کے سوا جن کا میں نے ذکر کیا ہے کبھی کسی اور چیز کا بھی مشاہدہ کیا ہے؟''

بہر حال ملک کی معاشی قوتوں کا ایک بڑا حصہ موجودہ نظام معیشت میں قمار کے ذریعے ضائع ہو جاتا ہے اس لیے اسلام نے صرف قمار کی حقیقی شکلوں کو نہیں بلکہ جن معاملات میں تھوڑا بہت بھی قماری رنگ پایا جاتا ہے جیسے سٹہ مسئلہ وغیرہ، ان کو بھی ممنوع قرار دے دیا۔

امر واقعہ یہ ہے کہ اس باب میں یورپ نے اسلام کے قانون سے باغی ہو کر اپنے ہاتھوں اپنا جو حال کیا ہے اور کر رہا ہے وہ ظاہر ہے۔ خودکشی اور اقدام خودکشی کے کتنے واقعات قمار بازی کا نتیجہ ہوتے ہیں۔ پھر مالی ابتری کا اندازہ اس سے کیجئے کہ یورپ کی پہلی جنگ عظیم سے اکیلے انگلستان (England) سے متعلق تخمینہ ہے کہ کم از کم دس کروڑ پونڈ سالانہ کی رقم اپنے مالکوں کے قبضہ سے نکل کر جواریوں کے ہاتھ پہنچتی ہے یہ تخمینہ یورپ کے صرف ایک ملک اور ایک چھوٹے سے رقبہ سے متعلق تھا اور وہ بھی جنگ عظیم

سے قبل کا یورپ کہ کل ملکوں اور امریکہ کی ساری ولایتوں کی مجموعی تباہ کاریوں کے جدید ترین تخمینہ کیلئے اللہ ہی بہتر جانتا ہے کہ حساب کے کن ہندسوں تک میزان پہنچے۔ رہیں قانون وقت کی ناکام کوششیں تو انسائیکلوپیڈیا آف ریلیجن (Encyblopeadia of Religion) کے اسی مقالہ میں ہے کہ قانون اس میں کمی پیدا کرنے کی اپنی والی سب ہی کوششیں کررہا ہے بجز اسے قطعی ممنوع کرنے کی ناممکن کوشش کے۔ یہ حوصلہ اسلام ہی کا تھا کہ اس نے عقلائے فرنگ کی اس ناممکن کوشش کو اپنی حدود میں ممکن ہی نہیں بلکہ واقعہ بنا کر دکھادیا۔ [تفسیر ماجدی]

خلاصہ یہ کہ اسلام کے معاشی نظام میں اس قسم کے تمام تجارتی کاروبار کے لئے مطلق کوئی گنجائش نہیں جو صریح قمار اور جوا ہوں یا ان کی تہہ میں مالی بڑھوتری کا وہی جذبہ کارفرما ہو جو قمار میں پایا جاتا ہے اور اگر اقتصادی، معاشی اور اخلاقی ماہرین سے اس بارہ میں دریافت کیا جائے تو وہ بھی کسی اختلاف کے بغیر متفقہ طور پر یہی رائے دیں گے بلکہ یہ رائے دے چکے ہیں کہ ''قمار'' کی قسم کے تمام معاملات ہماری اجتماعی زندگی اور ہماری سوسائٹی کے لیے تباہ کن ہیں۔ احتکار کی یہ دوسری قسم ہے جو اس لیے اسلام نے ناجائز اور ممنوع قرار دی ہے کہ اس میں بھی دولت اور سرمایہ کو بعض افراد یا گروہ میں سمٹا دیا جاتا ہے اور ایک فریق تباہ و برباد ہو جاتا ہے جب کہ دوسرا مالی بڑھوتری کے باعث عیش و عشرت میں مبتلا ہو جاتا ہے اس میں گھوڑوں کی ریسیں، سٹہ، لاٹری اور اس قسم کی جوئے کی سب قسمیں شامل ہیں۔

موجودہ زمانے میں ہر قسم کی لاٹری بھی قمار میں داخل ہے جس کی سینکڑوں صورتیں بازاروں اور کارخانوں میں رائج ہیں۔ آج کل وباء کی طرح قمار کی ایک صورت معمول کی شکل میں عام ہوگئی ہے جو حل معمہ کے عنوان سے بہت سے اخبارات اور ماہوار رسالوں کا بہت بڑا کاروبار ہے معمہ کی مختلف صورتیں لکھ کر اشتہار دیا جاتا ہے کہ جو شخص اس کا کوئی حل کر کے روانہ کرے اور اس کے ساتھ اتنی فیس روانہ کرے تو جن لوگوں کے حل صحیح

ہوں گے ان میں انعام اس شخص کو دیا جائے گا جس کا نام لاٹری یا قرعہ اندازی کے ذریعے نکل آئے۔ یہ قمار کی ایک صورت ہے اور شرعی طور پر ناجائز ہے۔

بعض شہروں میں بچے بادام، اخروٹ یا کانچ کی گولیاں وغیرہ سے ہار جیت کرتے ہیں اور اس پر شرطیں لگاتے ہیں۔ یہ بھی قمار وغیرہ میں داخل ہے آج کل تو ہر شے پر یہاں تک کہ کرکٹ اور دوسرے کھیلوں پر بھی شرطیں لگائی جاتی ہیں یہاں تک کہ بعض شہروں میں کنکوے اڑا کر پیسوں کی ہار جیت کا کھیل کھیلا جاتا ہے۔ اس طرح سٹہ بازی کا سارا کاروبار قمار ہی ہے اور قرآن کی نص کے مطابق حرام ہے۔ اس کاروبار میں کسی قسم کی اعانت بھی حرام ہے۔ بیمہ کے کاروبار کو امداد باہمی کا نام دے کر جائز قرار دینے کی کوشش کی جاتی ہے لیکن اس کی مروجہ صورتیں جتنی ہمارے علم میں ہیں سود اور قمار سے خالی نہیں اس لیے حرام ہیں۔

﴿سود﴾

احتکار کی سب سے ملعون قسم ''سودی لین دین'' ہے۔ یہ تمام اقتصادی اور معاشی نظام کو برباد کر کے رکھ دیتا ہے۔ یہ کروڑوں انسانوں کو مفلس اور نان شبینہ کا محتاج بنا کر دولت کا سمٹاؤ ایک مخصوص طبقہ کی طرف کر دیتا ہے۔ سود سرمایہ دارانہ نظام کا ایک اہم اور مضبوط ستون ہے اور اس نظام کی عمارت کا زیادہ انحصار اسی پر ہے۔

ربا یا سود ایک قدیم کاروباری مسئلہ ہے اور دنیا کی اکثر قومیں اس کاروبار کو کرتی رہی ہیں لیکن کسی زمانہ میں اس کو اچھا کام نہیں سمجھا گیا۔ سود خور اگرچہ لوگوں میں رہتا تھا لیکن معاشرہ میں اس کی حیثیت عموماً ایک مجرم کی سمجھی جاتی تھی جو لوگوں کا خون پیتا ہے بلکہ اگر یہ کہا جائے تو غلط نہ ہوگا کہ سود خور خود بھی اپنے کو مجرم خیال کرتا تھا۔ اس جرم کے گھناؤنے پن کی وجہ سے قرآن نے انتہائی سخت لہجوں میں ''سود خوری'' کے جرم کی مسلسل سزاؤں کا اعلان شروع کر دیا۔ سزائیں بھی ایسی شدید کہ بڑے سے بڑے کبیرہ گناہ کے بارہ میں بھی سزاؤں کی اتنی شدت قرآن حکیم میں نہیں ملتی۔ شیطانی آسیب زدوں کی شکل میں سود خور اٹھے گا۔ تکثیر دولت کی تمام کوششوں کو اس کی قدرت برباد کر کے رکھ دے گی جہنم میں اسے ابدی عذاب میں مبتلا ہونا پڑے گا اور آخر میں تو قرآن نے اعلان کر دیا کہ جو شخص سود خوری سے رکنے اور توبہ کرنے پر آمادہ نہیں ہے چاہیے کہ وہ اللہ اور اس کے رسول ﷺ کو اعلان جنگ دے دے۔ علماء نے بھی لکھا ہے کہ کسی جرم پر خواہ وہ انسان کی زندگی کے کسی شعبہ سے متعلق ہو، قرآن حکیم میں اتنی سزاؤں کی دھمکی نہیں دی گئی ہے۔ چونکہ سود خوری ایک معاشی جرم ہے اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اسلام نے معاشی مسائل کو کس قدر اہمیت دی ہے لیکن قرآن کی سخت سزاؤں کے مقابلہ میں جاہل عربوں کے قلوب بھی شدید سخت ہو گئے تھے لہٰذا جواز سود پر انہوں نے بھی استدلال پیش کیا۔

﴿اِنَّمَا الْبَيْعُ مِثْلُ الرِّبٰوا﴾

''یعنی بیع وفروخت کے معاملہ ہی کی طرح تو سود کا معاملہ ہے۔''

مطلب یہ کہ بیع کے معاملہ میں بھی مال کا مبادلہ مال سے ہوتا ہے اور سود میں بھی مال کا مبادلہ مال ہی سے کیا جاتا ہے تو پھر دونوں میں فرق کیا ہے؟ جب قرآن بیع کے معاملہ کو جائز اور حلال قرار دیتا ہے اور سود کے معاملہ کو ناجائز اور حرام اور وہ بھی اتنی سختیوں کے ساتھ اس کی عقلی وجہ کیا ہوسکتی ہے؟ قرآن حکیم نے ان کے اس عقلی اعتراض کا عقلی جواب تو نہیں دیا بلکہ جواب میں یہ کہا کہ ''خدا کا حکم یوں ہی ہے کہ بیع کو حلال کیا ہے اور ''ربوا'' (سود) کو حرام کردیا ہے اس کے بعد پھر ان سزاؤں کا ذکر کیا ہے جن کو اوپر بیان کیا گیا ہے۔ پھر دنیا نے دیکھا کہ جاہلی عرب ایک انتہائی کم عرصہ میں مسلمانوں سے مغلوب ہوگیا اور اس زمانہ کی دو سپر پاورز (Super Powers) کو بھی اسلامی جھنڈے کے سامنے اپنا سر جھکانا پڑا۔ اسلامی حکومتوں نے پوری مملکت میں نہ صرف مسلمانوں کے لیے بلکہ غیر مسلموں کے لیے بھی سودی لین دین کو ناجائز ٹھہراتے ہوئے ایک عام صورت ایسی پیدا کردی کہ پھر صدیوں ''جواز سود'' کی طرف کسی کا خیال تک نہیں گیا۔ اس کی دو وجوہات تھیں، ایک تو یونہی اکثر قوموں میں یہ سودی کاروبار بدنام تھا اور دوسرے اسلام کا سیاسی اقتدار جب اس کرہ اغبر پر قائم ہوا تو جیسا کہ قاعدہ ہے کہ ہر چیز کی بھلائی اور برائی کا معیار اس زمانہ میں اسلام ہی کا نقطہ نظر بن گیا۔ کیوں کہ سیاسی غلبہ کا یہ ایک عام اثر ہے جس سے دنیا ہمیشہ متاثر رہی ہے اور آج بھی متاثر ہے۔ چنانچہ کسی چیز کی بہتری کی سب سے بڑی دلیل اس زمانہ میں بھی یہی ہے کہ جن قوموں کو آج دنیا میں سیاسی اقتدار حاصل ہے یہ ان کا قول یا فعل ہے۔ یورپ کے موجودہ تمدن کی ظاہری چمک دمک اور رنگ وروغن نے لوگوں کے دلوں کو ایسا اپنی طرف لبھایا ہے کہ دلائل کے بجائے یورپ کا طرز عمل ہی مسائل کے خطا وصواب اور عمل کے خیر ہونے کے لیے یہ دیکھنا کافی ہے کہ یورپ نے اس کا کیا فیصلہ کیا ہے اور ان کا اس بارہ میں طریق کار کیا ہے۔ اب ہر وہ مسئلہ جو اس کے مطابق نہیں وہ خطا اور ہر وہ عمل جو اس کے موافق نہیں وہ شر اور دقیانوسیت بلکہ جہالت ہے۔ چنانچہ آج کل کے اکثر مدعیان عقل کے نزدیک تحقیق کی یہی صحیح راہ ہے۔ اس کے نتیجہ میں ہم کو اس کی بدولت اپنے

بہت سے اصول چھوڑنے پڑے، بہت سے مسائل میں مذہبی احکام کی غلطی محسوس کرنے لگے اور ہمارے بہت سے نوجوانوں کو اپنے دینی مسائل میں غلطی محسوس ہونے لگی اور بہت سے متکلمین جدید نے اسلام کی مدافعت میں معذرت اور اپالوجی (Apology) اختیار کی اور یہ کوشش کرنے لگے کہ کاش کسی طرح اسلام کی پیشانی سے ربا کی حرمت کا داغ مٹایا جاسکتا۔ چنانچہ ایک سوسائٹی بنی اور علی گڑھ میں اور پھر بدایوں سے اس کا اخبار بھی نکلا جس کا نام ''سودمند'' تھا اور کئی رسالے چھاپے گئے جن میں بتایا گیا کہ مسلمانوں کے موجودہ تنزل اور عدم ترقی کا سبب حرمت سود کا عقیدہ ہے اور یہ دلائل اس زور شور سے پیش کیے گئے کہ قرآن حکیم اور احادیث اور فقہی روایات کی توجیہہ و تاویل کرنے میں کوئی جھجک محسوس نہ کی گئی۔ وہ زمانہ تو ختم ہو گیا لیکن حکومت کی سطح پر ''روشن خیال پاکستان'' کے عنوان سے ہر اس برائی کو سند جواز فراہم کی جارہی ہے جس کا چلن یورپ اور امریکہ میں عام ہے اور وہاں کے عوام اب اس سے تنگ آ چکے ہیں اور ان لقموں کو اب باہر سے پکڑ پکڑ کر نگلا جارہا ہے جن کو اہل یورپ اور امریکہ نے باہر اگل دیا ہے۔ اس کا مقصد صرف یہ ہے کہ ہم ان قوموں کی نگاہ میں دقیانوس نہ سمجھے جائیں۔ چنانچہ اب ان علماء کو بھی جاہل اور دقیانوس کے نام سے پکارا جانے لگا ہے جو لوگوں کے سامنے وہ اسلام پیش کرتے ہیں جو قرآن وحدیث سے ثابت ہے اور چودہ سو سال سے متفقہ طور پر پوری امت اس کی قائل ہے۔ یہ سب کچھ اس پاکستان میں کرنے کی کوشش کی جارہی ہے جس کو اسلام کے نام پر دس لاکھ انسانوں نے اپنی جانوں کا نذرانہ پیش کر کے بنایا تھا اور لاکھوں انسانوں نے ہی اپنا گھر بار چھوڑ کر یہاں ہجرت کی تھی۔ یہ سب کچھ ان لوگوں کی نگاہ میں محبوب بننے کے لیے کیا جارہا ہے جو ایک خدا ناآشنا معاشرہ میں رہتے ہیں اور جن کے نزدیک نیکی اور بدی، خیر اور شر اور بھلائی اور برائی کا کوئی معیار نہیں۔ اگر کوئی معیار ہے تو صرف لوگوں کی پسند اور ناپسند ہے اور اکثریت تو ہر زمانہ میں جاہل اور بے وقوف رہی ہے اور ارسطو کا مقولہ بھی ہے کہ (Majority is always fools) اکثریت ہمیشہ احمقوں پر مشتمل رہی ہے۔ وہ اکثریت یورپ کی ہو یا امریکہ کی، فرانس کی ہو یا اسپین کی، پاکستان کی یا ہندوستان کی، جاپان کی ہو یا چین کی۔

بات اصل میں یہ ہے کہ زمانہ بدلا اور وقت نے کروٹ لی اور مسلمانوں کے سیاسی غلبہ نے بتدریج مغلوبیت کا رنگ ہر اس جگہ اختیار کیا جہاں وہ غالب تھے۔ اب معیار بدل گیا۔ اسلام کی طرف کسی شے کا انتساب بھی جب اس کی خوبی کی دلیل تھی یہ بات جاتی رہی۔ ادھر یورپ جس کو مسلمانوں کی مغلوبیت کے بعد دنیا کا سیاسی اقتدار ملا وہ کلیسائی آویزشوں کے سلسلہ میں بالآخر اس نتیجہ تک پہنچا کہ کلیسا کے ساتھ ساتھ اس نے مذہب کا بھی قریب قریب انکار کر دیا۔ سود حالانکہ عیسائیت میں بھی کوئی اچھا عمل نہیں تھا جس کا کلیسائی عہد میں یورپ پابند تھا لیکن مذہب اور کلیسا کے اقتدار کو ختم کر دینے کے بعد یورپی لوگوں کے نزدیک ''سودخوری'' مذہبی نقطہ نظر سے ناپسندیدہ فعل ہے، قابل توجہ بات نہ رہی، لہٰذا انہوں نے سوال اٹھایا کہ خالص عقلی نقطۂ نظر سے دیکھنا چاہیے کہ ''سود'' کی کیا حیثیت ہے؟ چنانچہ علمائے معاشیین نے اس پر بحث کرنی شروع کی اور جاہلی عرب کی وہ مردہ دلیل لوگوں کے سامنے پیش کی جس کو قرآن چودہ سو سال قبل رد کر چکا تھا۔

﴿اِنَّمَا الْبَیْعُ مِثْلُ الرِّبٰوا﴾

یورپ کے ارباب فکر ونظر نے اس دلیل کو نئے سرے سے پھر زندہ کیا اور اپنی اپنی حکومتوں کو متاثر کر کے ''سودخوری'' کے کاروبار کو قانونی جواز کی سند عطا کی اور سودی کاروبار کے قضیئے کو نئی شکلوں میں منظم کرنے کی کوشش کی۔

معاشیات کے ماہرین نے جن میں یہودی تنظیموں کا بھی بہت بڑا ہاتھ تھا، ہر اس شخص کے لیے سودخوری کے مواقع فراہم کر دیئے جو اپنی آمدنی سے معمولی سی رقم بھی پس انداز کر سکتے ہیں تا کہ ان کی اس پس انداز آمدنی کا سود انہیں بغیر کسی فکر اور خرخشہ کے باقاعدہ ملتا رہے۔ اس کے علاوہ کاروبار کے ہر طریقہ میں اور لین دین کی دوسری راہوں میں بھی اس ''سود'' کی لعنت کو کچھ اس طرح جذب کر دیا گیا کہ عام کاروبار کرنا بھی عوام الناس کے لیے بغیر سود لینے اور دینے کے قریباً ناممکن ہو گیا۔ برصغیر پاک وہند، مصر اور دوسرے اسلامی ممالک میں بھی بعض لوگوں کے ذہنوں میں ''جواز سود'' کی دلیل ڈال دی گئی۔ علماء نے اس بارہ میں کافی دلائل دیئے، ضخیم کتابیں لکھیں، فتوے دیئے لیکن یورپ کے

سیاسی اقتدار کا اثر لوگوں کے ذہنوں پر کچھ اس طرح ہوا کہ عقلی دائروں میں جاہلی عرب کے استدلال کی جیت ہو گئی اور مذہب اس میدان میں ہار گیا اور بات یہاں تک پہنچی کہ اسلامی نظریہ پر قائم شدہ پاکستان کی سپریم کورٹ میں حکومت کے وکیل نے یہ بیان دیا کہ پاکستان کی معیشت سود کے بغیر چل ہی نہیں سکتی۔ اس کی اس دلیل کو قبول کرتے ہوئے حرمت سود کے ایک مدلل اور ضخیم فیصلہ کو معرض التواء میں ڈال دیا گیا بلکہ قریباً قریباً ختم کر دیا گیا۔

پھر بعض حضرات شخصی مہاجنی قرضہ پر سود کو ناجائز بتاتے ہیں اور چند اشخاص کی مجموعی کاروباری شکل کو جس کا نام سترہویں صدی کے شروع میں بینکنگ سسٹم پڑا، جائز کہتے ہیں۔ گویا ان کا یہ کہنا ہے کہ چوری تو ناجائز ہے لیکن ڈاکہ جائز ہے یعنی ایک جرم تنہا ایک آدمی کرے تو وہ تو ناجائز اور معاشرہ کیلئے مضر ہے مگر جب اس جرم کو سازش کر کے چند آدمی مل کر کریں تو وہ جائز ہو جائے گا۔

اسلامی عقیدہ کے مطابق سود سے کبھی بھی کوئی قومی فلاح یا دنیوی بہبود پیدا نہیں ہو سکتی۔ قرآن کا فیصلہ ہے اور اٹل فیصلہ ہے اور دنیا نے اپنے تجربہ اور مشاہدہ کی روشنی میں اس کی تصدیق بھی کی ہے۔

﴿يَمْحَقُ اللّٰهُ الرِّبَا وَ يُرْبِي الصَّدَقَاتِ﴾ [بقرہ:۲۷۶]

''بے شک اللہ تعالیٰ سود کو مٹاتا اور صدقہ کو بڑھاتا ہے۔''

بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ سودی کاروبار سے ملک کی دولت میں ترقی ہوتی ہے لیکن یہ محض فریب نظر اور دھوکہ ہے۔ فرق صرف اس قدر ہے کہ مہاجنی قرضہ کے سود سے ملک کے صرف چند اشخاص کی دولت بڑھتی ہے اور سارے اہل ملک کی دولت گھٹتی ہے۔ بینکنگ اور کوآپریٹو سوسائٹیز کے سسٹم میں چند اشخاص کے بجائے سینکڑوں اشخاص کی دولت کو ترقی ہوتی ہے مگر اس کے مقابلہ میں لاکھوں بلکہ کروڑوں کی دولت کم ہوتی ہے اور تب ان سینکڑوں کی دولت بڑھتی ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ سود کو جس حیثیت سے بھی رواج دیا جائے وہ اپنی تباہی پھیلائے بغیر نہیں رہ سکتا۔

قرض انسان کی ایک ضروری حاجت ہے۔ اس حاجت کو پورا کرنا اسلام نے

قانون کے بجائے اخلاق سے کیا ہے۔ اس نے ضرورت مندوں کو قرض دینا ثواب کا کام بتایا ہے اور اس قرض پر مقروض سے کسی قسم کا فائدہ اٹھانا سود قرار دیا گیا ہے۔ اہل تقویٰ نے تو اس باب میں یہاں تک احتیاط کی ہے کہ مقروض کے ہاں دعوت کا قبول کرنا بھی مشتبہ بتایا ہے بلکہ لوگوں کو ہدیہ اس غرض سے دینا بھی کہ ان سے کچھ زیادہ وصولی کا موقع ملے ربا (سود) میں شامل کیا ہے۔

ضرورت مند کو قرض دینا اسلام نے ثواب کا بہترین عمل بتایا ہے لیکن جو لوگ قرض لے کر استطاعت کے باوجود ادا کرنے میں دیر کریں ان کو ظالم کا خطاب دیا گیا ہے اور جو لوگ بے قرض ادا کیے مر جائیں ان کے ترکہ میں سب سے پہلے قرض ادا کرنا ضروری قرار دیا اور قرض ادا کیے بغیر اگر وہ مر جائیں تو ان کی نماز جنازہ پڑھنے میں بھی تامل کیا گیا ہے۔ اسلام نے قرض کے لیے حکومت سے کہا ہے کہ وہ لوگوں کو بغیر سود قرض دینے کا انتظام کرے۔ چنانچہ خلافت راشدہ میں بیت المال سے قرض لیا جاتا تھا جس کی ادائیگی اگر مقروض اپنی زندگی میں کسی وجہ سے نہ کرتا تو اس کی متروکہ جائیداد اور دولت سے اس کی وصولی عمل میں آتی۔ خلاصہ یہ کہ اسلام نے سود کی نہایت مذمت کی ہے لیکن موجودہ زمانہ میں سرمایہ دارانہ نظام نے سود کو اتنا عام کر دیا ہے کہ ایک عام آدمی کے لیے اس سے بچنا مشکل ہو گیا ہے خصوصی طور پر بینکنگ سسٹم نے ہر آدمی کو سود میں کسی نہ کسی صورت میں ملوث کر دیا ہے۔ اگر کوئی شخص بینک سے سود نہیں لیتا تو وہ اس سودی ادارے کے سود لینے کے گناہ میں شریک ہے۔

سود کیا ہے؟

قبل اس کے کہ ہم سود پر کوئی مزید بحث کریں اس بات کی وضاحت ضروری ہے کہ یہ بتایا جائے کہ سود ہے کیا؟ اور اس کی حدود کیا ہیں؟ اور اس کی حرمت کے احکامات کن معاملات سے متعلق ہیں؟ اور اسلام سود کو ختم کر کے معاشی معاملات کو کن خطوط پر چلانا چاہتا ہے۔ قرآن حکیم میں سود کیلئے جو لفظ استعمال ہوا ہے وہ ''ربا'' ہے۔ ربا کس کو کہتے ہیں اور

اس کے کیا معنی ہیں؟

الربا: الزیادة علیٰ شئی (کسی شے پر زیادتی)

یعنی ربوا کے لفظی معنی زیادتی کے ہیں۔ مثلاً عربی زبان میں کہا جاتا ہے۔

﴿اربی فلان علیٰ فلان﴾

''فلاں شخص نے فلان کو زیادتی دی۔''

اس سے معلوم ہوا کہ ربوا کے معنی لغت عرب میں زیادتی اور اضافے کے ہیں اور اصطلاح میں اہل عرب اس لفظ کو اس زائد رقم کے لیے استعمال کرتے تھے جو ایک قرض خواہ اپنے قرض دار سے مہلت کے معاوضہ میں وصول کرتا تھا اس کو ہماری زبان میں سود کہتے ہیں۔

قرآنی آیات سے بھی یہی ظاہر ہوتا ہے کہ ربوا کے معنی زیادتی ہی کے ہیں۔ نانچہ قرآن حکیم میں ہے۔

﴿وَ مِنْ اٰیَاتِہٖ اَنَّکَ تَرَی الْاَرْضَ خَاشِعَةً فَاِذَا اَنْزَلْنَا عَلَیْهَا الْمَاءَ اهْتَزَّتْ وَ رَبَتْ﴾ [حم السجدة: ۳۹]

''اور اس کی نشانیوں میں سے (ایک یہ) ہے کہ تم زمین کو دبی پڑی دیکھتے ہو، پھر جب ہم پانی برساتے ہیں تو یہ تازہ ہوتی ہے اور ابھرتی ہے۔''

امام راغب نے بھی لکھا ہے کہ رأس المال پر جو زیادتی ہو وہ ''ربا'' ہے لیکن قانون میں اس زیادتی کو خاص کر کہتے ہیں جو ایک مخصوص طریقہ پر ہو۔

صاحب معجم المصنفین علامہ محمود حسن ٹونکی فرماتے ہیں:

''ربا اور بیع عربی زبان کے لفظ ہیں جب تک کوئی اصطلاح شرعی لغوی معنی میں تبدیلی نہ پیدا کرے، قرآن وسنت میں آئے ہوئے الفاظ کے معانی لغت عربی سے معلوم ہوتے ہیں۔ ''ربا'' لغت میں زیادت ہے اور لسان العرب وغیرہ سے ثابت ہو چکا ہے کہ حقیقت بیع کی معاہدہ فی تعاوض الاموال ہے لہٰذا لغوی لحاظ سے

ربا کی تعریف یہ ہے کہ لین دین کے معاہدے میں عوضین مماثلین میں سے ایک عوض کا دوسرے عوض پر زیادت مذکور ہونا یا عوضین میں سے عوض دین پر زیادت مذکور ہونا اور جب معاہدہ میں زیادت مذکور ہوتی ہے تو اس زیادت کا نام عرب میں ''ربا'' ہے۔ ''وھو المتعامل فیما بین الناس ''اور معاہدے میں مذکور ہونے کی وجہ سے اس کو مشروط کیا جائے گا۔''

حافظ ابن حجرؒ نے بھی فرمایا ہے:

''الربا مقصور ہے اور مد بھی بیان کیا گیا ہے لیکن شاذ ہے یہ ربا یربو سے بنا ہے اور الف کے ساتھ لکھا جاتا ہے لیکن قرآن حکیم کے رسم الخط میں واؤ کے ساتھ ہے (جیسے صلوٰۃ اور زکوٰۃ) اور ربا کی اصل زیادتی ہے۔ خواہ نفس شی میں ہو جیسے ارشاد خداوندی ہے ''اھتزت وربت'' (وہ لہلہائی اور بڑھی) یا مقابلہ میں ہو جیسے ایک درہم کے مقابلہ میں دو درہم۔ کچھ حضرات کا فرمان ہے کہ دونوں حقیقی معنی ہیں اور کچھ کی رائے میں پہلے حقیقی اور دوسرے مجازی معنی ہیں۔ ابن سریج کہتے ہیں کہ یہ دوسرے معنی میں حقیقت شرعیہ ہے۔''

لیکن قرآن حکیم نے ہر قسم کی زیادتی کو حرام نہیں کہا کیونکہ زیادتی تو تجارت میں بھی ہوتی ہے۔ قرآن جس زیادتی کو حرام قرار دیتا ہے وہ ایک خاص قسم کی زیادتی ہے اس لیے اس کو ''ربوا'' کا نام دیا گیا ہے۔ اہل عرب کی زبان میں اسلام سے پہلے بھی سود کو ربوا کے نام سے ہی یاد کیا جاتا تھا اور وہ لوگ ربوا کو بیع کی طرح جائز سمجھتے تھے۔ اسلام نے آکر بتایا کہ جو زیادتی یا اضافہ مال میں بیع سے ہوتا ہے وہ تو جائز ہے اور جو اضافہ سود سے ہوتا ہے وہ حرام ہے۔

سودخوروں کا یہ حشر اس لیے ہوگا کہ وہ کہتے ہیں کہ بیع بھی تو ربوا کی مانند ہے حالانکہ اللہ نے بیع کو حلال قرار دیا ہے اور ربوا کو حرام۔ چونکہ ربوا ایک خاص قسم کی زیادتی کا نام تھا اور وہ معاشرہ میں معلوم ومشہور تھی اس وجہ سے قرآن حکیم میں اس کی کوئی وضاحت نہیں کی گئی اور صرف اتنا کہنا کافی سمجھا گیا کہ اسے حرام قرار دیا گیا۔

نزول قرآن کے وقت سودی معاملات کی جو شکلیں رائج تھیں اور جنہیں اہل عرب ''ربوا'' کے نام سے تعبیر کرتے تھے وہ یہ ہیں۔مثلاً ایک شخص دوسرے شخص کے ہاتھ کوئی شے فروخت کرتا اور ادائے قیمت کے لیے ایک مدت مقرر کر دیتا اور اگر وہ مدت گزر جاتی اور قیمت ادا نہ ہوتی تو پھر وہ مزید مہلت دیتا اور اس سے طے کر لیتا کہ اتنی مدت میں اتنی رقم اصل سے زائد ادا کرنی ہوگی یا مثلاً قرض خواہ اور قرض دار کے درمیان ایک خاص مدت کے لیے ایک شرح طے ہو جاتی تھی اور اگر اس مدت میں اصل رقم مع اضافے کے ادا نہ ہوتی تو مزید مہلت پہلے سے زائد شرح پر دی جاتی تھی۔

اکثر فقہاء اور مفسرین نے صرف قانونی نقطہ نظر سے مسئلہ سود پر بحث کی ہے لیکن امام فخر الدین رازیؒ پہلے شخص ہیں جنہوں نے سود پر معاشی نقطہ نظر سے بحث کی ہے۔امام رازیؒ فرماتے ہیں:

''لفظ ربا کے معنی زیادتی کے ہیں لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ ہر طرح کی زیادتی وصول کرنا حرام ہے بلکہ ''ربا'' کی جو حرمت ہے وہ ایک خاص قسم کا معاہدہ ہے جو ان عربوں کے ہاں ''ربا'' کے نام سے موسوم تھا اور یہی ''ربا نسیہ'' ہے پس اللہ تعالیٰ نے جس ربا کو حرام قرار دیا ہے تو اس سے یہی ربا نسیہ مراد ہے۔''

سود کی حرمت کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ ربا اس بات کا مقتضی ہے کہ اس میں ایک انسان کا مال بغیر کسی عوض کے لیا جائے کیونکہ جو کوئی ایک درہم کو دو درہم کے بدلے میں نقد یا ادھار فروخت کرتا ہے تو وہ یہ زیادہ درہم بغیر کسی عوض کے لیتا ہے اور انسان کے مال سے اس کی احتیاج وابستہ ہوتی ہے جس کی بڑی حرمت ہے۔رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ہے کہ انسان کے مال کی حرمت اس کے خون کی حرمت جیسی ہے پس اسی وجہ سے دوسرے کا مال بغیر کسی استحقاق اور عوض کے لینا ممنوع قرار دیا،اور اگر کہا جائے کہ ایسا کیوں جائز نہیں ہے جب کہ رأس المال (اصل زر) زائد درہم کے بدلہ میں ایک طویل مدت تک اس کے قبضہ میں رہتا ہے۔اگر رأس المال اس کے ہاتھ میں رہتا تو ممکن تھا کہ مالک مال اس سے تجارت کرتا اور اس تجارت کی وجہ سے وہ فائدہ حاصل کرتا۔پس جب وہ اس کو مدیون کے

ہاتھ میں چھوڑتا ہے اور مدیون (یعنی قرض دار) اس سے نفع اٹھاتا ہے تو پھر کس لیے صاحب مال کو زائد درہم لینے سے روک دیا گیا؟ کیونکہ یہ اس کے مال سے نفع اٹھانے کا معاوضہ تھا ہم کہتے ہیں کہ جس نفع اٹھانے کا آپ نے تذکرہ کیا ہے وہ ایک امر موہوم ہے جو کبھی حاصل ہوتا ہے اور کبھی حاصل نہیں ہوتا لیکن یہ زائد درہم لینا یقینی امر ہے۔

دوسری وجہ یہ بیان کی جاتی ہے کہ سود لوگوں کو کسب وہنر میں مشغول ہونے سے روکتا ہے کیونکہ جب صاحب سرمایہ کو سود کے ذریعہ چاہے وہ نقد ہوں یا ادھار زائد درہم حاصل ہوں تو اس کیلئے روزی کمانا (اکتساب المعیشت) آسان ہو جائے گا لہٰذا وہ کسب، تجارت اور مشقت طلب صنعتوں کی تکلیف نہ اٹھائے گا اور اس طرح لوگوں کے فوائد (منافع الخلق) منقطع ہو جائیں گے اور یہ تو لازمی امر ہے کہ دنیوی کاروبار بغیر تجارت، صنعت وحرفت اور عمارات کے چل نہیں سکتے۔

تیسری وجہ یہ بیان کی جاتی ہے کہ معاہدہ ربا اس وجہ سے ممنوع قرار دیا گیا ہے کہ قرض لوگوں کے درمیان نیک نامی اور شہرت کو منقطع کر دیتا ہے جب سود ہی حرام ہو تو لوگ روپیہ قرض لینے اور اس کو واپس لوٹانے سے باز رہتے ہیں۔ اگر سود حلال ہو جائے تو حاجت مند شخص کی حاجت اس کو اس امر پر آمادہ کرے گی کہ ایک درہم کو دو درہم پر حاصل کرے۔ اس طرح آپس کی ہمدردی نیکی اور احسان مندی ختم ہو جائے گی۔

آخر میں حضرت امام رازی قدس سرہ فرماتے ہیں کہ ''ربا'' کی حرمت قرآن حکیم سے ثابت ہے۔ یہ ضروری نہیں کہ انسان کو جو احکامات دیئے جاتے ہیں اس کی وجہ بھی معلوم ہو۔ پس ربا (سود) کی حرمت نے اس کو ممنوع قرار دیا ہے، گو ہم اس کی وجہ جانتے ہوں۔ امام رازیؒ نے اس آیت ربا میں جس میں شیطان کا ذکر ہے اس پر بحث کرتے ہوئے شیطان کے وجود پر ایک دلچسپ بحث کی ہے کہ آیا وہ انسان کو نقصان بھی پہنچا سکتا ہے یا نہیں؟ اور آخر میں فرماتے ہیں کہ جاہل عرب صرع (مرگی) کی بیماری کو شیطان کی طرف منسوب کرتے تھے، تو جب انہیں خطاب کیا گیا تو ایسے ہی کلمات میں کیا گیا جس کو اچھی طرح سمجھتے تھے۔

﴿انما البیع مثل الربوا﴾

''تجارت سود جیسی ہے۔''

جاہلی لوگ ربا اور سود کو مشابہ سمجھتے تھے اور یہ کہ اگر کوئی شخص ایک کپڑا دس روپے میں خریدے اور گیارہ روپے میں فروخت کر دے تو یہ حلال ہے۔ اسی طرح اگر کوئی شخص دس روپے کو گیارہ روپے میں فروخت کر دے تو وہ بھی حلال ہونے چاہئیں جب کہ نگاہ شریعت میں یہ حرام ہیں کیونکہ عقلی طور پر دونوں میں کوئی فرق معلوم نہیں ہوتا اور ربا نقد میں ایسا ہی ہوتا ہے اور ربا نسیہ (ادھار) میں بھی ایسا ہی ہوتا ہے کہ اگر وہ دس روپے کا کپڑا آئندہ سال گیارہ روپے میں فروخت کرے تو جائز سمجھا جاتا ہے پس اسی طرح سے اگر کوئی شخص دس روپے کے بدلے آئندہ ماہ گیارہ روپے دے تو یہ بھی جائز ہونا چاہیے کیونکہ عقلی طور پر ان دونوں میں کوئی فرق نہیں ہے اور تجارت اس وجہ سے جائز ہے کہ اس میں آپس کی رضامندی حاصل ہو جاتی ہے۔ اسی طرح یہ سود بھی جب آپس کی رضامندی ہو جائے تو جائز ہونا چاہیے۔ چونکہ خرید و فروخت احتیاجات رفع کرنے کیلئے ضروری ہے اور ممکن ہے کہ انسان احتیاجات لاحق ہوتے وقت نادار اور خالی ہاتھ ہو اور مستقبل میں بے شمار دولت اس کے ہاتھ آ جائے۔ پس اگر سود کو جائز قرار نہ دیا جائے تو صاحب مال اس کو کچھ نہ دے گا اور انسان اپنی احتیاجات اور ضروریات میں گرفتار رہے گا اور کوئی اس کا پرسان حال نہ ہوگا۔ سود جائز ہونے کی صورت میں صاحب مال مال کی زیادتی کے لالچ میں اس کو قرض دے دے گا اور مال حاصل ہو جانے پر زیادتی ادا کرنا زیادہ آسان ہے بہ نسبت اس کے کہ وہ شخص مال پانے سے قبل احتیاجات میں گرفتار رہے۔ پس یہ بات اس امر کی مقتضی ہے کہ ربا حلال ہے جیسا کہ ہم نے دوسری تمام خرید و فروخت کو حلال کر رکھا ہے کہ اس سے انسانی احتیاجات پوری ہوتی ہیں۔ یہ ان لوگوں کا شبہ تھا لیکن اللہ تعالیٰ نے ایک ہی لفظ سے اس کو روک دیا جیسا کہ اس کا قول ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تجارت کو حلال کیا اور سود کو حرام، اور جو تم نے کہا کہ وہ ایسا نص صریح ہے جو قیاس کے معارض ہے...... اور دین نص سے ثابت ہوتا ہے نہ کہ قیاس آرائی سے۔ [تفسیر کبیر رازی زیر آیت انما البیع مثل الربوا]

جاہلیت کا ربوا:

زمانہ جاہلیت میں ربوا کا اطلاق جس قسم کے معاملات پر ہوتا تھا روایات میں اس کی کئی صورتیں ذکر کی گئی ہیں۔

(۱) سیدنا مجاہدؒ فرماتے ہیں کہ جاہلیت کا ربوا یہ تھا کہ ایک شخص کسی سے قرض لیتا اور کہتا کہ اگر تو مجھے اتنی مہلت دے تو میں تجھے اتنا زیادہ دوں گا۔

(۲) قتادہؒ کہتے ہیں کہ جاہلیت کا ربوا یہ تھا کہ ایک شخص کسی سے کوئی چیز لیتا اور اس کی ادائیگی کے لیے مہلت لیتا۔ اگر یہ مہلت گزر جاتی اور ادائیگی نہ ہوتی تو مزید مہلت ملتی اور رقم میں اضافہ ہو جاتا۔

(۳) ابوبکر جصاصؒ لکھتے ہیں کہ دور جاہلیت میں لوگ ایک دوسرے سے قرض لیتے اور باہم یہ طے کرتے کہ اتنی مدت میں رقم اصل زر سے زیادہ ادا کی جائے گی۔

کاروبار کی یہ صورتیں عرب میں رائج تھیں اور انہی کو اہل عرب ربوا کہتے تھے اور اسی ربوا کی تحریم کا حکم قرآن میں نازل ہوا۔

رسول اللہ ﷺ کی بعثت سے قبل طائف، مکہ، مدینہ وغیرہ میں سود کا کاروبار عام ہوتا تھا۔ طائف میں قبیلہ ثقیف جاہلیت میں بنو مغیرہ کو قرض دیتے تھے۔ جب ادائیگی کی مدت آ پہنچتی تو بنو مغیرہ کہتے کہ ہم زیادہ دینگے تم ہمیں مہلت دو [تفسیر ابن جریر جلد ۴ ص ۵۰] طائف میں قبیلہ ثقیف کے چار بھائی مسعود، عبد یالیل، حبیب بن عمرو بن عمر ثقفی تھے۔ یہ بنو مغیرہ کو قرض دیتے اور ان سے سود وصول کرتے تھے۔ طائف کی فتح کے بعد یہ چاروں مسلمان ہو گئے۔ ادھر مکہ میں بنو مغیرہ بھی مسلمان ہو گئے جب ان بھائیوں نے بنو مغیرہ سے سود مانگا تو ایک آیت نازل ہوئی کہ ''سود طلب نہ کرو۔''

اسی طرح اہل مکہ بھی سودی کاروبار کرتے تھے۔ سیدنا عباس رضی اللہ عنہ اور سیدنا خالد بن ولید رضی اللہ عنہ نے زمانہ جاہلیت میں شراکت کی تھی اور سودی کاروبار کرتے تھے۔ جب سود حرام ہوا تو انہوں نے سود کی بہت بڑی رقم بنو عمرو بن عمیر کو چھوڑ دی۔

تو عرب میں سود کا عام رواج تھا کسی شخص کا کسی پر کچھ قرض ہوتا تو مقروض قرض خواہ سے کہتا کہ میں تجھے اتنا زیادہ دوں گا تو مجھے مہلت دے۔

[سنن کبریٰ بیہقی جلد ۵ ابواب السریا]

مدینہ میں بھی سود کا عام رواج تھا۔ سعید بن ابی بردہ اپنے والد سے روایت کرتے ہیں کہ میں مدینہ گیا اور وہاں عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ سے ملا۔ انہوں نے کہا ''تم کیوں نہیں آتے؟'' کہ ہم تمہیں ستو اور کھجور کھلائیں اور تم ایک (باعظمت) گھر میں داخل ہو۔ اس کے بعد انہوں نے کہا کہ تم ایک ایسے ملک میں رہتے ہو جہاں سود کا بہت رواج ہے لہٰذا جب کسی شخص پر تمہارا کوئی قرض ہو اور وہ تمہیں گھاس کا گٹھا یا جو یا چارے کا بوجھ بھیجے تو اس کو نہ لینا کیونکہ یہ بھی سود ہے۔ [بخاری: مناقب عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ]

تجارت اور سود میں فرق:

جاہلی عرب اور آج کل کے جدید تعلیم یافتہ حضرات کی سمجھ میں یہ بات نہیں آتی کہ سود اور تجارت میں کیا فرق ہے؟ بات دراصل یہ ہے کہ بعض طبائع اتنی مسخ ہو جاتی ہیں کہ حق و باطل اور حلال و حرام میں فرق کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔ جدید تعلیم نے بعض حضرات کو کچھ اتنا مغرب زدہ کر دیا ہے کہ وہ بھی چودہ سو سال پرانا جملہ دہرانے لگے ہیں ''انما البیع مثل الربوا''۔ علماء نے تجارت اور سود میں یہ فرق بیان کیا ہے۔

فروخت کار ایک چیز کو فروخت کرنے کیلئے پیش کرتا ہے اور خریدار اور فروخت کار کے درمیان معاملہ طے پانے کی صورت میں خریدار اس کو خریدنے پر تیار ہو جاتا ہے۔ فروخت کار وہ چیز اپنی محنت سے تیار کرتا ہے یا کہیں سے لے کر آتا ہے۔ ہر دو صورت میں وہ اپنی چیز پر محنت کا معاوضہ اصل رقم میں اضافہ کر کے حاصل کرتا ہے اور یہی اس کا منافع ہے۔

اس کے مقابلہ میں ربوا (سود) یہ ہے کہ ایک شخص اپنا مال دوسرے شخص کو قرض دیتا ہے اور یہ شرط طے کرتا ہے کہ اتنی مدت گزرنے پر وہ اس پر اتنی رقم زائد وصول کرے گا۔

اسی زائد رقم کو سود کہتے ہیں جو صرف مہلت کا معاوضہ ہے۔ اس لحاظ سے سود کی تعریف یہ ہوئی کہ قرض میں دیئے ہوئے مال پر جو زائد رقم مدت کے مقابلہ میں شرط اور تعین کے ساتھ لی جائے وہ سود ہے گویا سودی معاملہ میں یہ تین چیزیں پائی جاتی ہیں۔

(۱) اصل مال پر اضافہ۔

(۲) اضافہ کا تعین مدت کے لحاظ سے کیا جانا۔

(۳) معاملہ میں اس کا مشروط ہونا۔

قرض کا ہر وہ معاملہ جس میں یہ تین چیزیں پائی جائیں، سودی معاملہ ہے اور نگاہ شریعت میں حرام ہے خواہ قرض کسی پیداواری کام میں لگانے کیلئے لیا گیا ہو یا ذاتی ضرورت کے لیے اور قرض لینے والا امیر ہو یا غریب۔

اس لحاظ سے تجارت اور سود میں اصولی فرق علماء نے یہ لکھا ہے کہ

(۱) تجارت میں فروخت کار اور خریدار کے درمیان منافع کا مبادلہ برابری کی بنیاد پر ہوتا ہے کیونکہ خریدنے والا اس شے سے فائدہ اٹھاتا ہے جو اس نے فروخت کرنے والے سے خریدی ہے اس کے برعکس سودی معاملہ میں سود لینے والا تو مال کی ایک مقرر کردہ مقدار لے لیتا ہے جو اس کے لیے یقینی طور پر منافع بخش ہے لیکن اس کے مقابلہ میں سود دینے والے کیلئے منافع یقینی نہیں ہے کیونکہ اس نے اگر قرض ذاتی ضرورت کے لیے لیا ہے تو یقینی طور پر سود اس کے لیے نقصان دہ ہے اور اگر صنعت وتجارت یا کاروبار اور زراعت کے لیے قرض لیا ہے تو بھی نفع یقینی نہیں نقصان کا بھی اتنا ہی امکان موجود ہے جتنا نفع کا گویا ایک فریق کا منافع تو یقینی ہے اور دوسرے کا مشکوک اور موہوم۔

(۲) تجارت میں چیز اور اس کی قیمت کا مبادلہ ہونے کے ساتھ ہی معاملہ ختم ہو جاتا ہے جبکہ سودی معاملہ میں قرض لینے والا مال لے کر خرچ کر لیتا ہے اور پھر یہ مال دوبارہ حاصل کر کے سود کے اضافہ کے ساتھ واپس کرتا ہے۔

(۳) تجارت میں فروخت کنندہ خریدار سے خواہ کتنا ہی منافع کیوں نہ لے وہ صرف ایک ہی مرتبہ لیتا ہے لیکن سودی معاملہ میں رقم لینے والا مسلسل اپنے مال پر منافع وصول

کرتا ہے اور وقت کے ساتھ ساتھ اس پر اضافہ اور بڑھوتری ہوتی رہتی ہے۔

(۴) تجارت میں انسان اپنی محنت اور ذہانت صرف کر کے اس کا فائدہ حاصل کرتا ہے جب کہ سودی کاروبار میں صرف زائد از ضرورت مال دے کر فائدہ حاصل کیا جاتا ہے یعنی سودی کاروبار ایسا شراکتی کاروبار ہے جس میں ایک فریق صرف اپنا مال دے کر ایک مقررہ اور مشروط منافع کا شریک بن جاتا ہے۔

یہ ساری باتیں نہ تو آج کل کے تاجروں کے ذہن میں آتی ہیں اور نہ ہی ان لوگوں کے ذہنوں میں گھستی ہیں جن پر مغربی تہذیب کا بھوت سوار ہے۔ چنانچہ وہ سود کے جواز پر مختلف دلائل پیش کرتے ہیں۔ گویا یہ وقت بھی آنا تھا کہ جس شے کو قرآن حکیم کی نص صریح نے حرام قرار دیا ہے۔ مسلمان اس کے جواز کے لیے اخباروں میں بلکہ عدالتوں میں دلائل پیش کرتے ہیں۔ سود کے جواز کے لیے کہا جاتا ہے کہ سرمایہ (Capital) چونکہ ایک عامل پیدائش ہے اور باقی عاملین پیدائش کے ساتھ مل کر پیدائش دولت کے عمل میں اپنا کردار ادا کرتے ہیں۔ اس لیے یہ اپنا معاوضہ سود کی صورت میں وصول کرتا ہے جب کہ باقی عاملین پیدائش یعنی زمین، محنت اور تنظیم اپنا اپنا معاوضہ بالترتیب لگان، اجرت اور منافع کی شکل میں وصول کرتے ہیں تو آخر سرمایہ کو سود کیوں نہ ادا کیا جائے۔

اس اعتراض کا جواب یہ ہے کہ سرمایہ دارانہ نظام معیشت میں عاملین پیدائش چار سمجھے جاتے ہیں جو مندرجہ ذیل ہیں۔

نمبر	عامل	معاوضہ
۱	زمین	لگان
۲	محنت	اجرت
۳	سرمایہ	سود
۴	تنظیم	منافع

کاروباری صورتوں میں اکثر و بیشتر شراکتی بنیادوں پر کاروبار ہوتا ہے جن میں حصہ دار حصص خرید کر سرمایہ فراہم کرتے ہیں اور اس طریقہ سے کاروبار میں شراکت اختیار کرتے ہیں۔ اس سرمایہ سے جو ان حصہ داروں نے فراہم کیا ہے ناظم اپنی ذہنی صلاحیت کو استعمال کر کے کاروبار چلاتا ہے۔ اور اپنی اس جدوجہد اور کدوکاوش کا معاوضہ مقرر کردہ تنخواہ کی صورت میں کمپنی سے وصول کرتا ہے۔ اس سے پتہ چلا کہ ناظم کی حیثیت ایک الگ عامل پیدائش کی نہیں بلکہ اس کا تعلق محنت سے ہے اور وہ اجرت وصول کرتا ہے کیونکہ محنت بطور عامل پیدائش ذہنی یا جسمانی کاوش اور جدوجہد کا نام ہے اور اس کا معاوضہ اجرت کی شکل میں ادا کیا جاتا ہے اور جہاں تک عامل پیدائش کے طور پر سرمایہ کا تعلق ہے تو سرمایہ فراہم کرنے والا یعنی حصہ دار (Share-holder) دراصل نفع ونقصان کی ذمہ داری اٹھاتا ہے اور نفع یا نقصان کا حق دار ہوتا ہے کاروبار کے تمام حصہ دار (Share-holder's) اسی حیثیت سے کاروبار میں شریک ہوتے ہیں کیونکہ نفع کی صورت میں ان کو نفع اور نقصان کی صورت میں نقصان اٹھانا پڑتا ہے گویا سرمایہ پیدائش دولت کے عمل میں خطرہ مول لیتا ہے اور معاوضہ کے طور پر نفع یا نقصان اٹھاتا ہے لہٰذا سرمایہ میں سود کی ادائیگی کا کوئی جواز باقی نہیں رہتا کیونکہ عاملین پیدائش درحقیقت تین ہیں۔

یہاں یہ بات ذہن میں رہے کہ سرمایہ دارانہ نظام معیشت میں عاملیت پیدائش کی تعداد چار تسلیم کی جاتی ہے۔ زمین، محنت، سرمایہ اور تنظیم اشترا کی ماہرین معیشت زمین اور محنت ہی کو پیدائش کے عوامل سمجھتے ہیں۔ ان کے خیال میں تنظیم محنت ہی کی ایک شکل ہے جبکہ سرمایہ کی حیثیت ذخیرہ شدہ محنت (Stored Labour) کی ہے۔ سرمایہ زمانہ ماضی کی محنت کا وہ ثمرہ ہے جسے خرچ کرنے کے بجائے ذخیرہ کرلیا گیا تھا۔ اسلامی معاشیات کے بعض ماہرین کے نزدیک عاملین پیدائش تین ہیں۔ زمین، محنت اور سرمایہ۔ زمین ان تمام وسائل پر مشتمل ہے جو عطیہ خداوندی ہیں۔ محنت انسانی کاوش اور جدوجہد کا نام ہے جس میں جسمانی مشقت کے ساتھ تنظیمی کام بھی شامل ہے اور کاروبار کے نفع ونقصان کا ذمہ دار ہے۔

یہ تینوں عاملین پیدائش (زمین، محنت، سرمایہ خطر) اپنی خدمات کے صلہ میں اپنا اپنا معاوضہ وصول کرتے ہیں۔ زمین کا معاوضہ کرایہ یا لگان کی صورت میں ادا کیا جاتا ہے۔ محنت کا معاوضہ اجرت کی شکل میں اور سرمایہ خطر (Risk Capital) کا معاوضہ نفع یا نقصان کی صورت میں، کیونکہ نفع یا نقصان کی ذمہ داری دراصل سرمایہ فراہم کرنے والے کی ہوتی ہے۔ ناظم کا کام چونکہ کاروبار کا انتظام چلانا ہوتا ہے جو وہ اپنی ذہانت اور صلاحیتوں کو استعمال کر کے چلاتا ہے اور اس ذہنی کاوش کا معاوضہ وہ تنخواہ (اجرت) کی شکل میں وصول کرتا ہے اس لیے تنظیم الگ سے کوئی عامل پیدائش نہیں ہے بلکہ یہ محنت کے زمرہ میں آتی ہے۔ تو ثابت ہوا کہ سود جو ادا کیا جاتا ہے وہ دراصل کسی شے کا معاوضہ نہیں بلکہ سرمایہ دارانہ نظام میں صارفین کے استحصال کی ایک صورت ہے۔

اس بات کی مزید وضاحت کے لیے ضروری ہے کہ معاشی اصطلاح ''عامل پیدائش'' کی حقیقت اچھی طرح سے ذہن نشین کر لی جائے۔ عامل پیدائش ہونا کسی عامل کے صرف وجود کا نام نہیں بلکہ پیدائش دولت کے عمل میں اس کا حصہ لینا ہے۔ مثلاً مزدور اس وقت معاوضہ کا حقدار ہوگا جب وہ جسمانی یا ذہنی طور پر کوئی کام کرے۔ اگر مزدور فارغ بیٹھا رہے تو وہ اجرت کا حق دار نہیں ہو سکتا، یہی چیز باقی عاملین پیدائش کے لیے بھی ہے۔ سرمایہ کا صرف روپیہ پیسہ یا درہم و دینار کی شکل میں موجود ہونا اس کو معاوضہ (شرح سود) کا حق دار نہیں بنا دیتا بلکہ جب سرمایہ کاروبار میں عملی طور پر لگایا جائے تب وہ معاوضہ کا حق دار بنتا ہے اور کاروبار میں لگایا جانے والا سرمایہ نفع و نقصان کا ذمہ دار ہوتا ہے اور اسی صورت میں اپنا معاوضہ وصول کرتا ہے نفع کی صورت میں نفع اور نقصان کی صورت میں نقصان۔

سود کے جواز کی ایک اور صورت یہ پیش کی جاتی ہے کہ صرفی ضروریات کے لیے جو سرمایہ یا قرض لیا جاتا ہے وہ تو واقعی نامناسب ہے کہ اس پر کسی سے سود لیا جائے لیکن جو قرض کاروباری مقاصد کے لیے لیا جاتا ہے تو چونکہ ایسا سرمایہ نفع آور یا پیداواری کاموں میں لگایا جاتا ہے اس لیے اس میں سرمایہ پر سود لینے میں کوئی حرج اور برائی نہیں۔

اس دلیل کا جواب یہ ہے کہ اول تو یہ بات یقینی نہیں کہ جو سرمایہ پیداواری کاموں

میں استعمال کے لیے لیا گیا یا جو سرمایہ پیداواری کاموں میں لگایا گیا وہ نفع کا باعث ہو اس میں نقصان کا احتمال بھی ہے اور عملی طور پر ہوتا یہ ہے کہ آجر اس سرمایہ کا سود مصارف پیدائش میں شامل کر کے قیمت کی صورت میں صارفین (Consumers) سے وصول کرتے ہیں یعنی سود کی ادائیگی ہر دو حالتوں میں صارفین کو کرنا پڑتی ہے۔ خواہ سرمایہ صرفی مقاصد کے لیے لیا جائے یا کاروباری مقاصد کے لیے گویا سرمایہ وصول اور استعمال آجرین کرتے ہیں اور اس کے سود کی ادائیگی صارفین کرتے ہیں۔ اس طرح یہ شرح سود دراصل شرح استحصال ہے لہٰذا اس کا کوئی منطقی اور عقلی جواز نہیں ہے۔ اسی لیے اسلام نے سود کو حرام قرار دیا کہ ایک طرف تو یہ بلا جواز ہے اور دوسری طرف اس کا سارا بوجھ بلاضرورت صارفین کو برداشت کرنا پڑتا ہے جو ایک کھلی زیادتی ہے اور اسلام کسی زیادتی کو جائز قرار نہیں دیتا۔

سود کی حرمت قرآن حکیم سے:

قرآن حکیم نے سود کے بارہ میں بڑے صریح اور واضح الفاظ میں نہایت سخت اور قطعی احکام صادر فرمائے ہیں اور مختلف آیات میں ان احکام کو نہایت سختی سے دہرایا ہے چنانچہ سورہ البقرہ میں فرمایا:

﴿اَلَّذِیْنَ یَاْکُلُوْنَ الرِّبَا لَا یَقُوْمُوْنَ اِلَّا کَمَا یَقُوْمُ الَّذِیْ یَتَخَبَّطُهُ الشَّیْطَانُ مِنَ الْمَسِّ ذَالِکَ بِاَنَّهُمْ قَالُوْا اِنَّمَا الْبَیْعُ مِثْلُ الرِّبٰوا، وَ اَحَلَّ اللّٰهُ الْبَیْعَ وَ حَرَّمَ الرِّبٰوا، فَمَنْ جَاءَهٗ مَوْعِظَةٌ مِّنْ رَّبِّهٖ فَانْتَهٰی فَلَهٗ مَا سَلَفَ، وَ اَمْرُهٗ اِلَی اللّٰهِ وَ مَنْ عَادَ فَاُولٰٓئِکَ اَصْحَابُ النَّارِ هُمْ فِیْهَا خَالِدُوْنَ، یَمْحَقُ اللّٰهُ الرِّبٰوا وَ یُرْبِی الصَّدَقَاتِ، وَاللّٰهُ لَا یُحِبُّ کُلَّ کَفَّارٍ اَثِیْمٍ﴾ [البقرہ: ۲۷۶]

''جو لوگ سود لیتے ہیں اور اس سے پیٹ پالتے ہیں وہ کھڑے نہ ہوسکیں گے مگر اس شخص کی طرح جسے شیطان کی چھوت نے باؤلا اور

حواس باختہ کر دیا ہو، یہ اس لیے ہوگا کہ انہوں نے کہا کہ خرید وفروخت (بیع) بھی سود کی طرح ہے حالانکہ خرید وفروخت کو اللہ نے حلال کیا ہے اور سود کو حرام، لہٰذا اب جس کو بھی اس کے پروردگار کی یہ نصیحت پہنچ گئی اور وہ آئندہ سود لینے سے باز آ گیا تو جو کچھ پہلے لے چکا وہ اس کا ہو چکا اس کا معاملہ اللہ کے سپرد ہے اور جو شخص پھر سود لے گا وہ جہنمی گروہ میں سے ہے ہمیشہ عذاب میں رہنے والا، اللہ سود کو مٹاتا ہے اور صدقات کو بڑھاتا ہے اور یاد رکھو! اللہ ناسپاس اور نافرمان سے خوش نہیں ہے۔''

اس آیت میں حق تعالیٰ شانہ نے بعض خاص چیزوں کے بارہ میں وضاحت فرمائی۔ اب تک تو مالیاتی مسائل کے سلسلہ میں صدقات، خیرات، ان کے فضائل اور ان کی شرائط وقیود کی نشان دہی فرمائی۔ صدقات اگر ایک طرف مالیاتی زندگی کو آسان تر بناتے ہیں تو دوسری طرف معاملاتی گناہوں کی تکفیر کا سامان کرتے ہیں۔ صدقات کے ذریعہ انسان میں اخلاق ومروت، خیراندیشی اور رفاہ عامہ کے لئے خیرسگالی کے جذبات کی تربیت ہوتی ہے اس کے برعکس سود میں محض بے مروتی، ضرر رسانی اور ظلم واستبداد کی روح کارفرما ہوتی ہے۔ اس لیے یہاں صدقات کے بعد سود کا تذکرہ فرمایا ہے اور بتا دیا ہے کہ صدقات میں جس قدر خیر ہے سود میں اسی قدر برائی ہے۔ بات دراصل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی راہ میں خرچ کرنے کی استعداد ہی نشو ونما نہیں پاسکتی تھی اگر اس کا حکم دیتے ہوئے ان باتوں سے نہ روک دیا جائے جو اس کی ضد ہیں اس لیے انفاق فی سبیل اللہ کے حکم کے ساتھ ہی سود کی ممانعت کر دی گئی جو اس کی ضد ہے۔

صدقات انسان میں دوسروں کی خیرخواہی، خیراندیشی اور رفاہ عامہ کی ہمدردی کے جذبات پیدا کرتے ہیں اور سود اس کے بالکل الٹ قساوت قلبی اور بداندیشی کے جذبات پیدا کرتا ہے گویا سود صدقہ کی بالکل ضد ہے۔ صدقہ کی محرک بلند ہمتی، ہمدردی، فیاضی، ایثار اور رحم دلی ہے اور سود کا محرک بزدلی، خودغرضی، سنگ دلی اور دوسروں کی

مشکلات سے فائدہ اٹھانے کی خواہش ہے۔ صدقہ ضرورت مندوں کو سہارا دیتا ہے اور سود گرے ہوؤں کو اور زیادہ پستی میں گراتا ہے اور پھر اس کا خون چوستا ہے۔ چنانچہ صدقات کے بعد سود کا ذکر کیا گیا۔

دوسری بات جو اس آیت میں فرمائی وہ یہ ہے کہ ''وہ کھڑے نہ ہوسکیں گے مگر اس شخص کی طرح جسے شیطان کی چھوت نے حواس باختہ اور باؤلا کر دیا ہو'' جمہور مفسرین قرآن کے خیال میں کھڑے ہونے سے مراد قیامت میں اٹھنا ہے اور مطلب یہ ہے کہ سود کھانے والے قیامت کے روز قبروں سے ایسے اٹھیں گے جیسے آسیب زدہ اور مجنون، آخرت میں اپنی قبروں سے اٹھنے پر یہ سود خور سیدھے کھڑے نہ ہوسکیں گے۔ کھڑے ہوں گے بھی تو خبطیوں، متوالوں اور دیوانوں کی طرح گرتے پڑتے اور لڑکھڑاتے ہوئے اس کا ایک ہلکا سا رنگ اسی دنیا میں بھی نظر آتا ہے کہ ایک ساہوکار جو روپیہ کے پیچھے دیوانہ اور باؤلا ہوتا ہے۔ اس کو دیکھ کر حقیقتاً ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس کو جن بھوت چمٹ گیا ہے۔ اس کے ذہن پر ہر لمحہ اور ہر وقت سود کا بھوت سوار رہتا ہے۔ لہٰذا قیامت میں بھی اس کا حشر آسیب زدہ اور مجنون شخص کی طرح ہوگا۔ سیدنا عوف بن مالک رضی اللہ عنہ کی روایت میں مرفوعاً آیا ہے کہ سود خور قیامت کے روز خبطی اور مجنون بن کر کھڑا ہوگا بعض روایات میں سود خور کا خون کی نہر میں غوطہ کھانا بھی مروی ہے یہ شاید اس وجہ سے ہے کہ دنیا میں غریب کا خون چوستا تھا اس لیے سزا بھی اسی قسم کی تجویز کی گئی۔

اس آیت میں تیسری بات یہ بیان کی گئی ہے کہ جاہلی عربوں نے کہا کہ خرید وفروخت بھی سود کی طرح ہے۔ یہ حالت اس لیے ہوگی کہ انہوں نے حلال وحرام کو یکساں کر دیا اور صرف اس وجہ سے کہ دونوں میں نفع مقصود ہوتا ہے۔ دونوں کو حلال کہا حالانکہ بیع اور ربا میں بڑا فرق ہے۔ بیع کو اللہ تعالیٰ نے حلال کہا ہے اور سود کو حرام۔ بیع میں جو نفع ہوتا ہے وہ مال کے مقابلے میں ہوتا ہے جیسا کہ کسی نے ایک روپے کی قیمت کا کپڑا دو روپے میں فروخت کیا اور سود وہ ہوتا ہے جس میں نفع بلا عوض ہو۔ ایک روپے کے بدلے دو روپے لے، پہلی صورت میں چونکہ کپڑا اور روپیہ دو جدا جدا قسمیں ہیں اور نفع اور غرض ہر

ایک کی دوسرے سے جداگانہ ہے۔اس لیے اس میں مساوات اور برابری ناممکن ہے۔خرید وفروخت کی صورت میں ضرورت اور حاجت سے الگ ہوکر دونوں میں باہم موازنہ کی کوئی صورت نہیں ہوسکتی، اور ضرورتیں سب کی مختلف ہیں کسی کو ایک روپے کی اتنی حاجت ہوتی ہے کہ دس روپے کا قیمتی کپڑا بھی ہیچ ہوتا ہے اور کوئی کپڑے کا اتنا ضرورت مند ہوتا ہے کہ وہ کپڑا جو بازار میں ایک روپیہ میں ملتا ہے ضرورت کے تحت دس روپے دے کر بھی خرید لیتا ہے۔اب اگر کوئی شخص ایک روپیہ والے کپڑے کو ہزار روپیہ میں خریدے گا تو یہ سود نہیں ہوگا کیونکہ دونوں میں موازنہ اور مساوات ممکن نہیں۔اس کے لیے پیمانہ ضرورت اور رغبت ہے اور اس میں بے حد وحساب تفاوت ہے، اس لیے سود ممکن نہیں برخلاف اس کے کہ ایک روپیہ کو دو روپے کے عوض فروخت کرے گا تو یہاں دونوں میں مساوات ہے اور اس مساوات کی وجہ سے ایک روپیہ ایک روپیہ کا بدل ہوگا اور دوسرا روپیہ بدل سے خالی ہوکر سود ہوگا اور شرعاً یہ معاملہ حرام ہوگا۔[معارف القرآن ،مفتی محمد شفیع صاحبؒ]

سود خوروں کو روز قیامت بدحواسی کی سزا اس لیے ملے گی کہ انہوں نے دو جرم کیے: ایک تو یہ کہ بذریعہ سود حرام مال کھایا دوسرے اس کو حلال سمجھا اور حرام کہنے والوں کے جواب میں یہ کہا کہ بیع وشراء بھی تو ربا کی طرح ہے۔جس طرح ربا (سود) کے ذریعہ نفع حاصل کیا جاتا ہے اور اسی طرح خرید وفروخت کے ذریعہ بھی نفع مقصود ہوتا ہے اگر سود حرام ہے تو بیع بھی حرام ہے حالانکہ اس کے حرام ہونے کا کوئی قائل نہیں۔

دراصل انداز تعبیر یوں ہونا چاہیے۔

﴿انما الربا مثل البیع﴾

''یعنی سود لین دین میں بیع کی طرح ہے۔''

لیکن قرآن حکیم کے ان مخاطبوں نے جو سود کو حرام نہیں کہتے تھے اپنی بات میں زور پیدا کرنے کیلئے یہ انداز تعبیر اختیار کیا کہ ''انما البیع مثل الربا'' کہ بیع حلال ہونے میں سود کی طرح ہے۔اس طرح انہوں نے حلت کا اصلی رشتہ ربا کے ساتھ قائم کرکے یہ ظاہر کیا کہ اصلی حلال تو ربا ہے اور بیع تو حلال ہونے میں ربا سے مشابہت کی وجہ سے ثانوی

درجہ میں ہے۔ بہر حال ان لوگوں نے فقط اس وجہ سے کہ دونوں میں فائدہ اور نفع مقصود ہوتا ہے دونوں کو حلال سمجھ لیا حالانکہ بیع اور ربا میں بڑا فرق ہے۔ [معارف القرآن مولانا محمد ادریس]

آج کل کے روشن خیالوں اور مغرب زدہ جدید ذہن رکھنے والوں کی طرح زمانہ جاہلیت کے احمقوں، بیوقوفوں اور جاہلوں کا بھی یہ کہنا تھا کہ مالی نفع تجارت میں بھی ہوتا ہے۔ پھر جب تجارت حرام نہیں تو سود کیوں حرام ہے؟ ان کے اس نظریہ کی سب سے بڑی خرابی یہ ہے کہ وہ تجارت کی نوعیت اور سود کی نوعیت میں کوئی فرق نہیں سمجھتے اور دونوں کو ایک ہی قسم کی چیز سمجھ کر یوں استدلال کرتے ہیں کہ جب تجارت میں لگے ہوئے مال کا منافع جائز ہے تو قرض پر دیئے گئے روپیہ کا منافع کیوں ناجائز ہے؟ اس قسم کے دلائل موجودہ زمانے کے سود خور بھی سود کے حق میں پیش کرتے ہیں وہ کہتے ہیں کہ ایک شخص جس روپے سے خود فائدہ اٹھا سکتا ہے اسے وہ قرض پر دوسرے شخص کے حوالے کرتا ہے وہ دوسرا شخص بھی بہر حال اس سے فائدہ ہی اٹھاتا ہے۔ پھر آخر کیا وجہ ہے کہ قرض دینے والے کے روپے سے جو فائدہ قرض لینے والا اٹھا رہا ہے اس میں سے ایک حصہ وہ قرض دینے والے کو ادا نہ کرے لیکن یہ لوگ اس پر غور نہیں کرتے کہ دنیا میں جتنے کاروبار ہیں خواہ وہ تجارت کے ہوں یا صنعت وحرفت کے یا زراعت کے اور خواہ انہیں اپنی محنت سے کرتا ہو یا اپنے سرمایہ اور محنت دونوں سے، ان میں سے کوئی بھی ایسا نہیں ہے جس میں آدمی نقصان کا خطرہ (Risk) مول نہ لیتا ہو اور جس میں آدمی کے لیے لازماً ایک مقررہ منافع کی ضمانت ہو۔ پھر آخر پوری کاروباری دنیا میں ایک قرض دینے والا سرمایہ دار ہی ایسا کیوں ہے جو نقصان کے خطرہ (Risk) سے بچ کر ایک مقرر اور لازمی منافع کا حق دار ہو۔ [تفہیم القرآن]

پھر اس بات پر بھی غور فرمائیں کہ تجارت میں نفع ونقصان دونوں کا احتمال ہر وقت لگا رہتا ہے اور تاجر کو نقصان سے بچنے کیلئے وقت، محنت اور ذہانت سب کچھ خرچ کرنا پڑتا ہے۔ پھر تجارتی معاملہ تو ہر وقت ختم ہو جاتا ہے برخلاف اس کی مدت اور مہلت کے ساتھ ساتھ سود خور کے مطالبات کی میزان بھی بڑھتی چلی جاتی ہے یہاں تک کہ اکثر اوقات قرض دار تباہی اور بربادی کے کنارے پر کھڑا ہو جاتا ہے۔

سوچنے کی بات یہ ہے کہ جو لوگ ایک کاروبار میں اپنا وقت، اپنی محنت، اپنا سرمایہ اور اپنی قابلیت رات دن کھپا رہے ہیں اور جن کی کوشش اور سعی کے بل پر بھی اس کاروبار کا بارآور ہونا موقوف ہے ان کے لیے تو ایک مقرر منافع کی کوئی ضمانت نہ ہو بلکہ نقصان کا سارا خطرہ ان کے سر ہو، لیکن جس نے صرف اپنا روپیہ انہیں قرض دے دیا ہو وہ بے خطر ایک طے شدہ منافع وصول کرتا چلا جائے۔ یہ آخر کس عقل، کس منطق، کس اصول انصاف اور کس اصول معاشیات کی رو سے درست اور صحیح ہے کہ محض مہلت اور تاریخ وقت کے عوض میں منافع وصول کیا جائے اور یہ کس بناء پر صحیح ہے کہ ایک شخص ایک کارخانہ دار کو بیس دن کیلئے بیس ہزار روپیہ قرض دے اور آج ہی یہ طے کرلے کہ آئندہ وہ دس سال تک برابر فی صدی سالانہ کے حساب سے اپنا منافع لینے کا حق دار ہوگا حالانکہ کسی کو علم نہیں کہ کارخانہ کے تیار کردہ مال کی قیمتوں کا آئندہ دس سال میں کتنا اتار چڑھاؤ ہوگا۔ یہ کہاں کا انصاف ہے کہ حادثہ کے وقت ملک میں پوری قوم خطرات کا مقابلہ کرے، جان اور مال کی قربانیاں دے مگر پوری قوم میں ایک جنگی قرض دینے والا سرمایہ دار ہی ایسا ہو کہ سو سال گزر جانے پر بھی وہ اپنے قرض کا سود وصول کرتا رہے۔

پھر یہ بات بھی ذہن میں رکھیں کہ ایک تاجر اپنا سرمایہ ایک ایسے مال کی تجارت پر لگاتا ہے جس کی بازار میں طلب (Demand) ہے۔ وہ محنت، زحمت اور مختلف قسم کے خطرات مول لے کر اس مال کو ان لوگوں کیلئے قابل حصول بناتا ہے۔ پھر وہ تاجر اپنے سرمایہ کو مال کی شکل میں بازار میں مقابلہ (Competition) کے لیے پیش کرتا ہے اور اس کے لیے منافع کی شرح بازار کا اتار چڑھاؤ مقرر کرتا ہے۔ ممکن ہے کہ بازار کا اتار چڑھاؤ اسے دیوالیہ (Bankrupt) بنادے اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ اسے کچھ نفع حاصل ہوجائے۔ بتائیں کہ اس تاجر کے اس سرمایہ سے اس سود خور کو کیا نسبت ہے جس کا قلب سنگ دل اور بزدل اور جس کا ذہن انسانیت دشمن اور جس کے جذبات خونخوار ہوتے ہیں۔ کیونکہ سود خور کا سرمایہ دو بھیسوں میں ظاہر ہوتا ہے اور دونوں ہی میں وہ یکساں بزدل اور خون خوار ہے۔ ایک تو وہ بنیوں، ساہو کاروں، مہاجنوں اور یہودیوں کی شکل میں نمودار ہوتا ہے اور اس کو سب جانتے ہیں کہ یہ لوگ

کس قدر خونخوار ہوتے ہیں۔ دوسرا بھیس یہ ہے جس کو رفاہی کاموں، اجتماعی منصوبوں اور ملکی اسکیموں کی سرپرستی کے نام سے پیش کرتا ہے۔ اس زمانہ میں بہت سے لوگ اس بھیس میں اس کو بڑا معصوم سمجھتے ہیں لیکن غور کیجئے تو معلوم ہوگا کہ اس کی بزدلی اور خودغرضی کی فطرت بد اس کے اس جالے میں بھی اس طرح موجود ہے جس طرح مہاجن اور یہودی کے بھیس میں موجود ہے۔ دونوں صورتوں میں سودخوروں کو صرف یہ پیش نظر ہے کہ ان کا سرمایہ محفوظ رہے۔ مقررہ سود ملتا رہے یا اس کے حساب میں جمع ہوتا رہے جب کہ ایک تاجر سب سے پہلے خود کو خطرے میں ڈالتا ہے اور پھر اپنے سرمایہ اور صنعت کو۔

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللَّهَ وَذَرُوا مَا بَقِيَ مِنَ الرِّبَا إِنْ كُنتُمْ مُؤْمِنِينَ فَإِنْ لَمْ تَفْعَلُوا فَأْذَنُوا بِحَرْبٍ مِنَ اللَّهِ وَرَسُولِهِ، وَإِنْ تُبْتُمْ فَلَكُمْ رُءُوسُ أَمْوَالِكُمْ لَا تَظْلِمُونَ وَلَا تُظْلَمُونَ وَإِنْ كَانَ ذُو عُسْرَةٍ فَنَظِرَةٌ إِلَىٰ مَيْسَرَةٍ وَإِنْ تَصَدَّقُوا فَهُوَ خَيْرٌ لَكُمْ إِنْ كُنتُمْ تَعْلَمُونَ﴾ [بقرہ: ۲۷۹:۲۸]

یعنی ”اے ایمان والو! اللہ سے ڈرو اور باقی ماندہ سود چھوڑ دو اگر تم مومن ہو، پس اگر تم ایسا نہ کرو تو اللہ اور اس کے رسول کی طرف سے اعلان جنگ سن لو، اور اگر تم توبہ کر لو تو تمہارے اصل مال تمہارا حق ہیں، نہ تم ظلم کرو اور نہ تم ظلم کیے جاؤ گے۔ اور اگر (مقروض) تنگ دست ہے تو اسے اس کی فراخ دستی تک مہلت دو، اور (قرض کو معاف کر کے) تمہارا صدقہ کرنا زیادہ بہتر ہے اگر تم جانتے ہو۔“

یہ آیت فتح مکہ کے بعد نازل ہوئی اس سے قبل سود اگرچہ ایک ناپسندیدہ چیز سمجھا جاتا تھا مگر قانوناً اسے بند نہیں کیا گیا تھا۔ اس آیت کے نزول کے بعد سودی کاروبار اسلامی حکومت کے دائرے میں ایک فوجداری جرم بن گیا۔ عرب کے جو قبیلے سود کھاتے تھے ان کو حضور ﷺ نے سرکاری طور پر مطلع کر دیا کہ اگر اب وہ سودی لین دین سے باز نہ آئے تو ان کے خلاف جنگ کی جائے گی۔ سود کی نوعیت چونکہ ایک وسیع معاشی فساد کی تھی جس کی

اصلاح اس کے بغیر ممکن نہ تھی۔

آیت میں بتایا کہ اگر تم نے اس باغیانہ روش سے توبہ نہ کی تو اللہ اور اس کے رسول ﷺ سے جنگ کرنے کیلئے تیار ہو جاؤ۔ اس کی نوعیت بالکل ایک الٹی میٹم کی ہے۔ اس آیت سے یہ بھی معلوم ہوا کہ اسلامی نظام میں سودی کاروبار کرنا ایک سنگین فوجداری جرم ہے اگر یہ ایک فرد کا عمل ہے لیکن اگر یہ کام ایک جماعت کرے تو ان کی حیثیت باغیوں اور مفسدوں کی ہے جن کی سرکوبی کیلئے عندالضرورت فوجی کارروائی بھی کی جاسکتی ہے۔ حکم کی اس سنگینی اور قرآن کے اس الٹی میٹم سے اصل مقصد سرمایہ دارانہ اخلاق، سرمایہ دارانہ ذہنیت، سرمایہ دارانہ تمدن اور سرمایہ دارانہ نظام معیشت کا استیصال کر کے وہ نظام قائم کرنا تھا جس میں بخل کے بجائے فیاضی، خودغرضی کے بجائے ہمدردی اور باہمی تعاون ہو، سود کے بجائے صدقات، بینک کے بجائے بیت المال ہو اور سود کی ہر نوع اور قسم ہمیشہ کیلئے ختم ہو جائے خواہ وہ ذاتی ضرورت کے قرضہ پر لیا جائے یا نفع اور کاروبار میں لگانے والے قرضہ پر ہو اور یا اس قرض پر لیا جائے جو حکومت شہریوں سے لیتی ہے اور پھر یا وہ قرض جو حکومتیں اپنی ضروریات کے لیے مختلف ممالک کے بازار زر یا بینکوں سے لیتی ہیں۔

بعض اہل علم اپنی سادہ لوحی یا علمی کمزوری یا پھر کسی اور غرض کے باعث اور سود کے بارہ میں قرآن ونبوت کے اس سنگین لب ولہجہ کے باوجود تجارتی اور کاروباری سود کو سود نہیں سمجھتے حالانکہ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کا ایک فرمان کتابوں میں منقول ہے کہ ''سود کو بھی چھوڑ دو اور اس کے شائبہ کو بھی چھوڑ دو۔''

وہ حضرات مشتبہات سے دامن بچاتے تھے اور ہم اصل سے بھی محفوظ نہیں۔ اللہ تعالیٰ اپنی رحمت فرمائے فضیلۃ الشیخ عبداللہ دراز پر جنہوں نے 1951ء میں پیرس میں ہونے والے کلوکیم میں تمام دنیا کے سامنے یہ بات نہایت واضح الفاظ میں بتائی کہ ''اسلام کسی درجہ میں سود کو گوارا نہیں کرتا اور خواہ اقتصادی احوال وظروف میں کیسے تغیرات رونما ہو چکے ہوں لیکن اسلام میں سود کی ساری انواع قطعاً حرام ہیں۔

[فجميع انواع الربا محرمة تحريماً قطعياً]

سود میں کیا کیا خرابیاں ہیں کس طرح یہ قوموں کو تباہ و برباد کرتا ہے اور اس کے ذریعہ کس طرح دولت چند ہاتھوں میں سمٹ کر رہ جاتی ہے بعض حضرات نے اقتصادی احوال وظروف کی تبدیلی کے باعث مصالحت کا طریقہ اختیار کیا ہے، لیکن یہ طریقہ مصالحت کا نہیں بلکہ شکست خوردگی کا طریقہ ہے۔ شیخ عبداللہ دراز مرحوم کا موقف یہ ہے کہ بنیادی طور پر یہ تسلیم کر کے کہ سود کی ہر نوع حرام ہے موجودہ مالیاتی اور معاشی احوال کے قوانین میں تطبیق کا کام کیا جائے۔ اسلام کا معاشی نظام کوئی راہبانہ نظام نہیں کہ دنیا کے احوال وظروف کو نظر انداز کر دیا جائے، مگر یہ کام انفرادی محنت سے نہیں بلکہ اجتماعی کاوش سے پروان چڑھ سکتا ہے۔ جدید معاشیات واقتصادیات کے ماہرین اور قدیم اسلامی سرمایہ علمی کے وارث دونوں طبقے سر جوڑ کر بیٹھیں اور اس مسئلہ پر غور وفکر کر کے اس کا کوئی حل تلاش کریں۔ شیخ نے ایک بڑی پتے کی بات اپنے اس مقالہ میں بیان فرمائی جو موجودہ دنیا میں بڑی عجیب وغریب معلوم ہوتی ہے، لیکن اس کے بغیر اجتہادی مسائل کا صحیح حل نہیں تلاش کیا جا سکتا۔ آپ نے لکھا ہے کہ قواعد شریعت اور اسلامی علوم سے واقف ہونا ان مسائل کے حل کے لیے کافی نہیں بلکہ ضروری ہے کہ ان میں علم کے ساتھ تقویٰ اور پرہیز گاری کی وہ قوت بھی موجود ہو جو حق اور باطل میں تمیز کر سکے اور انسان کو ہوائے نفس کی اتباع سے بچا سکے۔

اس آیت میں سود نہ چھوڑنے والوں سے جنگ کرنے کا جو حکم دیا گیا ہے اس سے علماء نے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ جو شخص ایک اسلامی ریاست میں سود کھائے تو اسے توبہ پر مجبور کیا جائے۔ اگر وہ باز نہ آئے تو پھر اسے قتل کر دیا جائے۔ یہ ابن عباس رضی اللہ عنہ، حسن بصریؒ اور امام محمد بن سیرینؒ کی رائے ہے، لیکن دوسرے فقہاء کی رائے یہ ہے کہ یہ اس وقت ہے جب کہ وہ سود کی حلت کا معتقد ہو ورنہ اسے گرفتار کر کے توبہ کرنے تک جیل میں رکھا جائے۔ گویا سود لینا اور کھانا اسلامی قانون میں قابل دست اندازی پولیس ہے اور عدالت اسے سزا دے سکتی ہے۔ یہی حکم ان ظالم سلاطین کا بھی ہے جو لوگوں کے اموال ناجائز طور پر وصول کرتے ہیں یا وہ لوگ جو عام شہریوں سے ناجائز ٹیکس وصول کرتے ہیں۔ جصاص نے لکھا ہے یہ

لوگ سودخوروں سے بھی زیادہ سنگین مجرم ہیں۔

آیت کے آخر میں فرمایا: ''نہ تمہیں ظلم کرنا ہے اور نہ تم پر ظلم کیا جائے گا، یعنی جو پہلے تم سود لے چکے ہو اسے اگر تمہارے اصل مال میں شمار کرلیں اور اس میں سے کاٹ لیں تو تم پر ظلم، اور ممانعت کے بعد کا سود چڑھا ہوا اگر تم مانگو تو یہ تمہارا ظلم ہے۔ قرآن حکیم کی اس ہدایت ''لاتظلمون ولا تظلمون'' کا یہ اثر ہوا کہ پورے عرب میں یہ عظیم معاشی اصلاح یعنی ممانعت سود بغیر کسی طبقاتی کشاکش کے عمل میں آگئی، اور اس کی برکت سے قرض لینے والے اور قرض دینے والے دونوں مستفید ہوئے۔

اسلام میں معاشیات کی اصل بنیاد یہی ہے کہ نہ تم کسی پر کوئی مالی ظلم کرو اور نہ تم پر کوئی مالی ظلم کرے۔ جب سود اور سود در سود کھانے والا طبقہ کسی قوم میں پیدا ہو جاتا ہے اور مال و دولت یک طرفہ گردش کرتی ہے تو پھر بلاشبہ ملک وقوم کا ایک قلیل طبقہ قوم کے دوسرے افراد کی دولت کو آہستہ آہستہ کھینچ کر دولت مند بن جائے گا اور قوم کی اکثریت لاغری کا شکار ہو جائے گی جس کا انجام نہایت خطرناک بلکہ خوفناک ہوتا ہے کیوں کہ دولت مندوں کے پاس اگر سرمایہ کی قوت ہوتی ہے تو قوم کی اکثریت اپنے پاس جسمانی قوت رکھتی ہے۔ چنانچہ قوم کی جسمانی قوت دولت مندوں کی مالی قوت پر شب خون مارتی ہے۔ یہ سب کچھ اس صورت میں ہوتا ہے جب قرآن کے بتائے ہوئے قانون ''لاتظلمون ولا تظلمون'' سے بے رخی برتی جاتی ہے۔

اس وقت اور اس سے پہلے بھی دنیا کی سب سے بڑی ضرورت مقروض کے بوجھ کو ہلکا کرنا ہے۔ دنیا میں اسلام ہی ایک ایسا نظام ہے جس نے قرض کے بوجھ کو لوگوں سے ہلکا کیا۔ قرض داروں پر احسان کرنا، ضرورت مندوں کو قرض دینا اور تنگ دست مقروضوں کو مہلت دینا اور جو قرض ادا کرنے سے معذور ہوں ان کا قرض معاف کر دینا ثواب کا کام بتایا ہے۔ چنانچہ اس آیت میں بتایا گیا کہ اگر مقروض تنگ دست ہو تو تمہیں چاہیے کہ اسے فراخ دستی حاصل ہونے تک اسے مہلت دو اگر تمہارے پاس علم ہے تو ایسے تنگ دست کو قرض بطور صدقہ معاف کر دینا زیادہ اچھا ہے۔

اسلام کے اس نظام سے پہلے نہ صرف عرب میں بلکہ پوری دنیا میں لوگوں کو سودخوری نے اس قدر بے رحم اور سنگ دل بنا دیا تھا کہ جو لوگ قرض ادا نہیں کر سکتے تھے وہ غلاموں کی طرح فروخت کر دیئے جاتے تھے اور جو قیمت ملتی تھی اس سے اس کا قرض ادا کیا جاتا تھا۔ موجودہ سرمایہ دارانہ نظام نے مقروضوں کے قرض کی اس زنجیر کو اور بھاری بنا دیا ہے۔ قرآن حکیم کی اس آیت نے اس سارے نظام کو رد کیا۔

(۳) قرآن حکیم میں ایک اور مقام پر سود کے بارہ میں ارشاد فرمایا گیا۔

﴿یَا أَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَأْكُلُوا الرِّبٰوا أَضْعَافًا مُّضَاعَفَةً وَاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ﴾ [آل عمران: ۱۳۰]

''اے ایمان والو! سود مت کھاؤ دگنا چوگنا بنا کر اور اللہ کی نافرمانی سے بچو تاکہ فلاح کے ہم دوش ہو جاؤ۔''

اس آیت سے بعض لوگوں نے یہ استدلال کیا ہے کہ سود مفرد جائز ہے البتہ سود مرکب کھانا جائز نہیں حالانکہ اس آیت کا یہ مطلب نہیں ہے کہ تھوڑا سود لے لیا کرو لیکن دونے پر دونا مت لو۔ بات یہ ہے کہ جاہلیت میں سود اسی طرح لیا جاتا تھا جیسے ہمارے ہاں کے بنیئے لیتے ہیں۔ سو روپے لیے اور سود در سود بڑھاتے چلے گئے یہاں تک کہ سو روپے میں ہزاروں کی جائیدادوں کے مالک بن گئے۔ اسی صورت کو یہاں اضعافاً مضاعفہ سے تعبیر فرمایا گیا ہے یعنی اول تو سود ویسے ہی حرام ہے اور یہ صورت تو بہت ہی شنیع اور قبیح ہے جیسے کوئی کہے میاں مسجد میں گالیاں مت بکو تو اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ مسجد سے باہر گالیاں بکنے کی اجازت ہے۔

یہی سود موجودہ زمانے میں سود مرکب کہلاتا ہے۔ یہی سود بینک لیتے اور یہی سرمایہ دار ملک دوسرے غریب ملکوں سے لیتے ہیں۔ سود میں قرض خواہ کی پوزیشن بالکل محفوظ رہتی ہے لیکن اس کے برعکس قرض دار اگر اس نے کسی ضرورت سے قرض لیا تو وہ روپیہ اور اس کا سود اس طرح دے رہا ہے کہ اس نے اس سے کوئی آمدنی پیدا نہیں کی لیکن قرض دینے والے کا روپیہ محفوظ ہے۔ اس سے اندازہ لگا لیں کہ ایسا شخص جو اپنے کاروبار

میں کبھی نفع اٹھاتا ہے اور کبھی نقصان، اس شخص کا مقابلہ کر سکتا ہے جس پر نقصان کے سارے دروازے بند ہوں اور صرف نفع ہو اور نفع بھی اضعافاً مضاعفہ دوگنے چوگنے کے حساب سے۔ کیا یہ دونوں برابر ہیں؟

ملک کی اکثریت جب ان سود خوروں سے تنگ آ جاتی ہے تو اس کے نتیجے میں سلطنتیں تباہ و برباد ہو جاتی ہیں امن و امان غارت ہو جاتا ہے اور غرباء بھوکے اور غضب ناک بھیڑیوں کی طرح دولت مندوں کو چیر پھاڑ دیتے ہیں۔ تاریخ نے اس بات کو کئی مرتبہ دہرایا اور اشتراکیت بھی اسی کا نتیجہ ہے۔ جو بقول علامہ مناظر احسن گیلانی قدس سرہ کے کوئی نظام نہیں بلکہ ایک انتقام ہے جو غریبوں نے امیروں سے لیا۔ جب سودی لین دین کی سرکاری طور پر اجازت ہوگی تو سرمایہ داروں کا طبقہ ملک کے اکثر افراد کیلئے شدید معاشی ضرر کا باعث ہو جائے گا۔ یورپ آج نیشنلزم کے دعوے کا اپنے آپ کو ساری دنیا میں علم بردار کہتا ہے۔ اس نے صرف یہی نہیں کیا کہ چند ساہوکاروں اور پیشہ ور سود خوروں ہی کو اس سودی کاروبار کی اجازت دے رکھی ہے بلکہ بینکنگ سسٹم رائج کر کے سود خوروں کو اکٹھے ہو کر غریبوں کا خون چوسنے کا موقع فراہم کیا۔ سودی کاروبار کو اختیار کر کے اس نے قدرت سے جنگ کا اعلان کر دیا۔ اسی سود کے بل بوتے پر آج بڑے ملک جن کو جی ایٹ کہتے ہیں غریب ملکوں کو کھا رہے ہیں۔ ماہرین کا بیان ہے کہ سود پر بآسانی حکومتوں کو اگر روپیہ قرض نہ ملتا تو روزانہ کروڑ ہا روپے کی رقم کی فراہمی کا قطعاً امکان نہ تھا۔ گویا آج سود ہی اعلان جنگ اور اس ہولناک جنگ کا ذریعہ بنا ہوا ہے۔ انسانوں کی کمائی ہوئی آمدنی دھواں بن کر کچھ تو ہواؤں میں جہازوں کی شکل میں اور کچھ مختلف میزائلوں اور بموں وغیرہ کی شکل میں برباد ہو رہی ہے۔

یہ حقیقت ہے کہ سود خواہ مفرد ہو یا مرکب اسلام میں اسی طرح دونوں حرام ہیں جیسے کالا اور سفید سؤر۔ سؤر کا کوئی رنگ ہو اسلام میں وہ حرام ہے ایسے ہی سود کی کوئی شکل ہو مرکب ہو یا مفرد اسلام نے اسے ممنوع قرار دے کر معاشی زندگی کے ایک بہت بڑے مفسدہ کو جڑ سے اکھاڑ دیا ہے۔ سود کی وجہ سے سرمایہ داروں اور ان کے اداروں (بینکوں)

کیلئے یہ ممکن ہو جاتا ہے کہ وہ غریبوں کا خون چوسیں اور ان کی خون پسینہ کی کمائی سے اپنی دولت میں اضافہ کریں۔ سود سے کئی معاشی امراض پیدا ہوتے ہیں جو کسی ملک کے جسم میں سرطان کا کام دیتے ہیں۔ دولت کی نامساوی تقسیم بھی اسی کی وجہ ہے۔ احتکار اور ارتکاز دولت بھی اسی کے سبب سے ہے۔

مختصر یہ کہ اسلامی احکام کی رو سے ہر قسم کا سود قطعاً ناجائز اور حرام ہے۔ جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ موجودہ معاشی اور کاروباری سود اور چیز ہے وہ شاید اس بات کو بھی جانتے ہیں کہ موجودہ سرمایہ دارانہ نظام کی بنیاد یہی سود ہے اور اگر آج حکومتیں سود کو ممنوع قرار دے دیں تو یہ نظام اپنی موجودہ شکل میں باقی نہیں رہ سکتا۔ بعض حضرات یہ کہتے ہیں کہ بڑے کاروبار کے لیے سرمایہ اکٹھا کرنا بغیر سود کے ممکن نہیں۔ ان کا یہ اعتراض اپنے اندر کوئی وزن نہیں رکھتا۔ حقیقت اس کے خلاف ہے اگر سود کو ختم کر کے اس کی جگہ منافع کی بنیاد پر معاشی نظام استوار کیا جائے تو موجودہ زمانہ کی بہت سی معاشی خرابیاں ختم ہو سکتی ہیں۔

سود کی وجہ سے روپیہ لگانے والوں کو معاشی اور تجارتی کاروبار سے کوئی دلچسپی نہیں رہتی۔ انہیں تو سال کے اختتام پر سود کی وصولی سے مطلب ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ آنکھ بند کر کے اپنا روپیہ بینکوں کے حوالے کر دیتے ہیں لیکن بینکوں کی پالیسی پر انہیں کوئی اختیار نہیں ہوتا۔ نہ تو بینک کی کارروائیوں پر انہیں تنقید یا نکتہ چینی کا کوئی حق ہوتا ہے اور نہ ہی ان کا کوئی نمائندہ بینک کے معاملات میں اپنی کوئی آواز رکھتا ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ بینک کا پورا کاروبار بڑے سرمایہ داروں کے مفاد اور اغراض کا تابع ہو کر رہ جاتا ہے جس کے نتیجہ میں ساری تجارت، ساری صنعت اور سارے مالی ذرائع پر بھی یہی سرمایہ دار جماعت قابض رہتی ہے کیونکہ بینکنگ نظام تجارت وصنعت کی بنیاد ہے۔ کوئی صنعت اور کوئی تجارت بینکوں کے مالی تعاون کے بغیر اپنا وجود باقی نہیں رکھ سکتی اور مالی نظام جس طبقہ کے ہاتھ میں ہوگا تجارت وصنعت پر بھی اسی کا قبضہ ہوگا۔ اسی صورت حال سے متاثر ہو کر ایک انگریز مصنف نے بطور طنز لکھا ہے کہ ''بینک آف انگلینڈ کا صدر زار روس سے کئی گنا زیادہ اقتدار اور اختیار کا مالک ہوتا ہے۔'' یہ استعارہ نہیں بلکہ حقیقت ہے۔

اگر سود کی جگہ معاشی کاروبار کی بنیاد منافع (Profit) پر رکھی جائے تو ہر شخص اپنا روپیہ لگانے میں بڑی احتیاط سے کام لے گا کیونکہ وہ اس صورت میں صرف نفع کا شریک نہ ہوگا بلکہ نقصان میں بھی اسے شرکت کرنی پڑے گی۔ مجبور ہو کر روپیہ لگانے والے بینک میں مؤثر نمائندگی کا مطالبہ کریں گے اور بینک کے کاروبار اور اس کی پالیسی پر نظر رکھیں گے۔

ان آیات کے علاوہ اور بھی آیات ہیں جن میں سود کی مذمت ہے۔

سود کی مذمت احادیث نبویہ میں:

قرآن حکیم کی ان آیات کے علاوہ بہت سی احادیث میں بھی سودی کاروبار کے بارہ میں نہایت سختی سے ممانعت کی گئی ہے۔ جن میں سے چند ایک احادیث حسب ذیل ہیں۔

(۱)　سیدنا جابر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے سود لینے والے، سود دینے والے، سود کی دستاویز لکھنے والے اور سود کے معاملہ کی گواہی دینے والے ان سب پر لعنت فرمائی اور فرمایا کہ یہ سب معصیت کے ارتکاب میں برابر ہیں۔

[مسلم فی المساقاۃ ۳۹۸۱، ابن ماجہ نمبر ۲۲۷۷، ابن حبان جلد ۱۱ ص ۳۹۹، دارمی جلد ۲ ص ۲۴۶]

(۲)　ایک اور حدیث میں سیدنا عبداللہ بن حنظلہ غسیل الملائکہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

''سود کا ایک درہم جس کو آدمی جان بوجھ کر کھاتا ہے چھتیس (۳۶) بار زنا کرنے سے زیادہ سخت ہے۔ بیہقی نے شعب الایمان میں ابن عباس رضی اللہ عنہ سے یہ روایت نقل کی ہے اور اتنا اور زیادہ کہا ہے کہ سرکار دو عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''جس کا گوشت حرام سے بنا ہو وہ آتش دوزخ کا سزاوار ہے۔''

(۳)　سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ جناب رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

''جس رات مجھے معراج ہوئی تو میرا گزر ایک ایسی قوم پر ہوا جن کے

پیٹ ایسے تھے جیسے اژدہوں سے بھرپور گھر، اور اژدہے پیٹوں سے باہر بھی دکھائی دیتے تھے۔'' میں نے پوچھا یہ کون لوگ ہیں؟ جبرائیلؑ نے جواب دیا: یہ سودخور ہیں۔'' [ھولاء آکلة الرباء]

[ابن ماجہ حدیث نمبر ۲۲۷۳، مسند احمد جلد ۱ ص ۳۳۳، التھذیب للمزی جلد ۲۳ ص ۳۲۸]

(۴) سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

''لوگوں پر ایک زمانہ ایسا آئے گا جس میں کوئی شخص ایسا نہیں ہوگا جو سود نہ کھائے گا اور اگر کوئی نہیں کھائے گا تو اس کو اس کا غبار ضرور پہنچے گا۔'' [ابن ماجہ نمبر ۲۲۷۸، ابوداؤد فی الاجارات، سنن کبریٰ بیہقی جلد ۵ ص ۲۷۵، شرح السنۃ بغوی جلد ۸ ص ۵۵، مستدرک حاکم جلد ۲ ص ۱۱، مسند احمد جلد ۲ ص ۳۹۴، مسند ابی یعلی جلد ۱۱ ص ۱۰۵]

(۵) سیدنا ابوسعید خدریؓ بیان کرتے ہیں کہ سرکار دو عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

''سونے کو سونے کے عوض صرف برابر سرابر فروخت کرو اور بعض سونے کے عوض کم سونا مت فروخت کرو، اور چاندی کو چاندی کے عوض صرف برابر سرابر فروخت کرو اور بعض چاندی کو کم چاندی کے عوض مت فروخت کرو اور ان میں سے کسی کو ادھار مت فروخت کرو۔'' [مسلم نمبر ۳۹۴۲]

(۶) سیدنا عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ سرکار دو عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

''سونے کی بیع سونے کے عوض اور چاندی کی بیع چاندی کے عوض، گندم کی بیع گندم کے عوض اور جو کی بیع جو کے عوض اور کھجور کی بیع کھجور کے عوض اور نمک کی بیع نمک کے عوض برابر سرابر اور نقد بہ نقد ہو اور جب یہ اقسام مختلف ہو جائیں تو پھر جس طرح چاہو فروخت کرو بشرطیکہ نقد بہ نقد ہو۔'' [مسلم حدیث نمبر ۳۹۵۱]

(۷) سیدنا ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ سیدنا بلال رضی اللہ عنہ برنی کھجوریں لے کر آئے۔ رسول اللہ ﷺ نے ان سے پوچھا یہ کھجوریں کہاں سے لائے ہو؟ سیدنا بلال رضی اللہ عنہ نے جواب دیا میرے پاس کچھ ردی کھجوریں تھیں میں نے ان میں سے دو صاع فروخت کر کے اس کے عوض ایک صاع کھجوریں نبی اکرم ﷺ کے کھانے کے لیے لی ہیں۔ اس پر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اوہ! یہ تو بعینہ سود ہے ایسا نہ کرو لیکن جب تم کھجور خریدنا چاہو تو اپنی کھجوریں فروخت کر دو پھر اس قیمت سے دوسری کھجوریں خرید لو۔'' [مسلم حدیث نمبر ۳۹۸۱]

شریعت میں ربوا کی دو قسمیں ہیں:

(۱) ربا النسیہ اس کو ربا القرآن بھی کہتے ہیں کیونکہ اس کو قرآن نے حرام کہا ہے۔

(۲) ربا الفضل اس کو ربا الحدیث بھی کہتے ہیں اور ربا الفضل یہ ہے کہ ایک جنس کی چیزوں میں دست بدست زیادتی کے عوض بیع ہو، مثلاً پانچ کلو گندم کو آٹھ کلو گندم کے عوض فروخت کیا جائے۔ ربا الفضل کن چیزوں میں ہے اس میں آئمہ اربعہ کا اختلاف ہے۔

ربوا النسیہ یہ ہے کہ ادھار کی میعاد پر معین شرح کے ساتھ اصل رقم سے زیادہ وصول کرنا یا اس پر نفع وصول کرنا۔ موجودہ زمانہ میں جو سود رائج ہے اس پر بھی سود کی یہ تعریف صادق آتی ہے۔

ربا النسیہ کی صحیح تعریف امام فخر الدین رازیؒ نے کی ہے، فرماتے ہیں:

''ربا النسیہ زمانہ جاہلیت میں مشہور اور معروف تھا۔ لوگ اس شرط پر قرض دیتے تھے کہ وہ اس کے عوض ہر ماہ (یا ہر سال) ایک معین رقم لیا کریں گے اور اصل رقم مقروض کے ذمہ باقی رہے گی۔ مدت پوری ہونے کے بعد قرض خواہ مقروض سے اصل رقم کا مطالبہ کرتا اور اگر مقروض اصل رقم ادا نہ کر سکتا تو قرض خواہ مدت اور سود دونوں میں اضافہ کر دیتا یہ وہ ربا ہے جو زمانہ جاہلیت میں رائج تھا۔''

[تفسیر کبیر، جلد ۲ ص ۳۵۱، بیروت]

علامہ ابوالولید باجی نے ربا النسیہ کی تعریف میں لکھا ہے۔

"ربا جاہلیت کا یہ ہے کہ مدت پوری ہونے کے بعد قرض خواہ مقروض سے کہے کہ تم قرض ادا کر رہے ہو یا میں سود کے عوض مدت میں اضافہ کر دوں؟ اگر مقروض سود کو مان لیتا تو قرض خواہ مدت میں اضافہ کر دیتا اس کے حرام ہونے میں مسلمانوں کا کوئی اختلاف نہیں۔(وھذا مما لا خلاف بین المسلمین فی تحریمہ)" [المنتقی جلد۵ص ۶۵ از ابوالولید باجی مالکی]

یہ تو تھی ربا النسیہ کی تعریف اور ربا الفضل یہ ہے کہ ایک مخصوص مال کو اس کی مثل کے بدلے نقد زیادتی کے ساتھ یا ادھار فروخت کیا جائے مثلاً ایک کلو گندم کو دو کلو گندم کے عوض نقد فروخت کیا جائے یا پانچ کلو گندم کو پانچ کلو گندم کے عوض ایک سال کے ادھار پر فروخت کیا جائے۔ یہ ربا الفضل ہے اور اس کو ربا الحدیث بھی کہتے ہیں کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حدیث میں اس کو منع فرمایا ہے جیسا کہ گزشتہ صفحات میں سیدنا ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ اور سیدنا عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ کی روایت میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: "سونا سونے کے عوض، چاندی چاندی کے عوض، گندم گندم کے عوض، جو جو کے عوض، کھجور کھجور کے عوض اور نمک نمک کے عوض برابر سرابر اور نقد بہ نقد فروخت کرو اور جب یہ اجناس مختلف ہو جائیں تو پھر جس طرح چاہو فروخت کرو بشرطیکہ نقد بہ نقد ہوں اور ایک روایت میں ہے کہ جس نے زیادہ لیا یا زیادہ دیا اس نے سودی کاروبار کیا۔ دینے والا لینے والا دونوں برابر ہیں اور ایک اور روایت میں ہے کہ ایک دینار کو دو دیناروں کے بدلہ میں اور ایک درہم کو دو درہم کے بدلہ میں فروخت نہ کرو۔" [مسلم جلد۲ص ۲۴۔۲۶]

بعض علماء نے لکھا ہے کہ ربا الفضل اس زیادتی کو کہتے ہیں جو ایک ہی جنس کی دو چیزوں کے دست بدست لین دین میں ہو۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ربا الفضل کو اس لیے حرام قرار دیا کہ اس سے ربا النسیہ کا دروازہ کھلتا ہے اور انسان میں وہ ذہنیت پرورش پاتی ہے جس کا آخری ثمرہ سود خوری ہے۔ یہ حکمت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے خود بیان فرمائی۔ سیدنا

عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

''ایک دینار کو دو دیناروں کے عوض اور ایک درہم کو دو درہموں کے عوض میں فروخت نہ کرو مجھے خوف ہے کہ کہیں تم سود خوری میں مبتلا نہ ہو جاؤ۔'' [کنز العمال جلد ۴ ص ۱۸۷، رواہ الطبرانی]

ایک جنس کی مختلف اقسام کی چیزوں کا اگر باہمی تبادلہ کرنے کی ضرورت ہو تو یا تو برابر سرابر تبادلہ کرلیا جائے اور ان کی قیمتوں میں جو فرق ہو اس کو نظر انداز کر دیا جائے۔ یا پھر ایک چیز کا دوسری چیز سے براہ راست تبادلہ کرنے کے بجائے ایک شخص اپنی چیز کو روپوں کے عوض بازار کے بھاؤ پر فروخت کر دے اور دوسرے شخص سے اس کی چیز بازار کے بھاؤ پر ان پیسوں سے خرید لے۔

بینک اور سود:

بینک ایک ایسا ادارہ ہے جو زر اعتبار کا کاروبار کرتا ہے۔ یہ ادارہ عوام کی بچت کی ہوئی رقم (Savings) کو اپنے پاس بطور امانت رکھتا ہے اور پھر اس جمع شدہ رقم سے ضرورت مند لوگوں کو پیداور (Productive) اور غیر پیداوار (Unproductive) کاموں کے لیے قرضے دیتا ہے۔ سودی نظام معیشت میں یہ کم شرح سود پر قرضے دے کر منافع کماتا ہے۔ پروفیسر کراؤتھ کے الفاظ میں ''بینک قرضوں کا کاروبار کرتا ہے۔ عوام سے امانتیں وصول کرتا ہے اور ضرورت منداشخاص کو قرضے فراہم کرتا ہے۔ بینک کے جاری کردہ زر اعتبار کو عام لوگ بلا حیل و حجت قبول کر لیتے ہیں اس لیے بینک زر کی تخلیق بھی کرتا ہے۔''

سودی نظام معیشت میں ایک تجارتی بینک درج ذیل فرائض انجام دیتا ہے۔

امانتیں وصول کرتا ہے (Accepting Deposits) بینک کا زیادہ تر سرمایہ لوگوں کی امانتوں پر مشتمل ہوتا ہے۔ جو عموماً تین قسم کی ہوتی ہیں۔

(۱) طلبی امانتیں (Demand Deposits)

(۲) معیادی امانتیں (Fixed Deposits)

(۳) بچت امانتیں (Saving Deposits)

بینک طلبی امانتوں پر سود ادا نہیں کرتا جب کہ معیادی اور بچت امانتوں پر سود ادا کرتا ہے۔

قرضوں کی درج ذیل تین اقسام ہیں:

(۱) طلبی قرضے (Call Loans)

(۲) قلیل مدت کیلئے قرضے (Short-period Loans)

(۳) طویل مدت کیلئے قرضے (Long-period loans)

قرضوں کی ادائیگی کیلئے بینک درج ذیل طریقے اختیار کرتا ہے۔

(۱) اوورڈرافٹ (Overdraft) کے ذریعہ۔

(۲) نقد قرضہ (Cash Credit)۔

(۳) ہنڈیوں کو بٹا لگا کر (Through Discounting Bills)۔

(ج) ایجنسی کی خدمات، بینک اپنے گاہکوں کے نمائندہ کی حیثیت سے کام کرتا ہے۔ اور مالی مشیر کے فرائض انجام دیتا ہے۔

(د) انتقالِ زر (Money Transfer) چیک اور ڈرافٹ کے ذریعہ اندرون ملک اور بیرون ملک رقوم کی منتقلی کا کام بھی بینک انجام دیتا ہے۔

(ہ) قیمتی اشیاء اور دستاویزات کی حفاظت (Safe Deposit Lockers)۔

(و) سرمایہ کاری (Investment) صنعتوں اور کمپنیوں کے حصص (Share) کی خریداری اور حکومتی کفالتوں (Securities) کی خریداری کے ذریعہ بینک سرمایہ کاری کرتے ہیں۔

(ز) زر اعتبار کی تخلیق (Credit Creation) تجارتی بینک قرضوں کے اجراء کے ذریعہ زر اعتبار پیدا کرتے ہیں۔

یہ ایک مختصر سا تعارف ہے جو بینک کا یہاں دیا گیا ہے دور جدید کے یہ بینک بھی

سودی کاروبار کرتے ہیں لہٰذا یہ بھی حرمت سود کے تحت آ جاتے ہیں۔ ظاہری طور پر بینک ایک خوش نما تجارتی ادارہ ہے لیکن اس میں ایک ''مارسیاہ'' پوشیدہ ہے کیونکہ بینکوں کا وجود اس لیے ہے کہ بڑے بڑے سرمایہ داروں کے سرمایہ میں بے پناہ اضافہ ہو اور جس دولت وثروت کے ذریعہ محنت کے اشتراک سے متوسط اور غریب طبقہ کے افراد کو زیادہ سے زیادہ فائدہ پہنچایا جاسکتا ہے اس کا انسداد ہو جائے اور دولت سمٹ سمٹا کر ایک مخصوص اور محدود طبقہ میں محصور ہو جائے اور تمام تجارتی کاروبار کے نفع ونقصان کی قسمت چند بینک مالکان کے ہاتھوں میں مقید ہو کر رہ جائے اور اس طرح بینکوں کے سودی جال میں تجارت، زراعت اور روزمرہ کی معاشرت پھنس کر رہ جائے جس کے نتیجہ میں دنیا دو حصوں میں منقسم ہو جائے ایک طرف بڑے بڑے قارون مثال سرمایہ دار ہوں جن کو آج کل کی اصطلاح میں Multi Billioners کہا جاتا ہے اور دوسری جانب کروڑوں بلکہ اربوں مفلس و نادار اور محتاج وقلاش جو بدن ڈھانپنے کیلئے کپڑا اور پیٹ کے دوزخ کو بھرنے کیلئے روٹی تک نہ رکھتے ہوں اور سردی اور گرمی میں وہ حیوانوں سے بدتر زندگی گزار کر اپنے اپنے کلبۂ احزان میں اور فٹ پاتھوں پر تڑپ تڑپ کر مر جاتے ہوں یا پھر سسک سسک کر اپنی زندگی کے ایام گزارنے کے عادی ہوں۔

بے شک یہ بینک بہت مفید اور موجودہ نظام معیشت کے لیے ضروری اور لازمی ہیں لیکن سرمایہ داروں اور مالداروں کیلئے نہ کہ غریبوں اور ناداروں کے لیے۔ یہ قارونی دولت کی کاشت کیلئے ابرنیساں ہیں اور غریبوں اور ناداروں کی لاشوں پر سرمایہ کی تعمیر کیلئے بہت عمدہ مسالہ اور سامان تعمیر، بینک نہایت خوبصورت طریقوں سے دولت کو دولت مندوں میں محدود کرتا اور عوام اور غرباء کی غربت کو ہولناک اور خوفناک درجہ میں پہنچا دیتا ہے۔ یہ تہذیب نو کا ایک تجارتی جال ہے جو امیروں کی بہتری کے ضروری اور عوام کی تباہی پر دولت مندی کی بنیادیں رکھنے کا بہترین ذریعہ ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ موجود زمانہ کے کاروبار کو چلانے کیلئے بینک کا وجود نہایت ضروری ہے لیکن اس کی ایسی شکلیں بھی ممکن ہیں جو سود کے بغیر اس سسٹم کے مقصد کو

اس حد تک پورا کر سکیں جس کے لیے اس اجتماعی ادارہ کی ضرورت پیش آتی ہے۔ جس کا کچھ نقشہ آئندہ صفحات میں پیش کیا جائے گا۔ موجودہ زمانے میں مسلمان کہلانے والے مغرب زدہ ذہن کے لوگ اس بات پر مصر ہیں کہ بینک کا سود سود ہی نہیں ہے جس کے لیے وہ بہت سے دلائل دیتے ہیں۔

معیشت کے یہ جدید مفکرین جن کے نام تو مسلمانوں والے ہیں لیکن ذہن میں مغربی تہذیب کا الحاد گھسا ہوا ہے، یہ کہتے ہیں کہ قرآن حکیم میں ربا (سود) اس خاص سود کو کہا گیا ہے جو زمانہ جاہلیت میں رائج تھا۔ کوئی غریب شخص شادی اور بیماری وغیرہ میں یا کسی اور نجی ضرورت کے تحت کسی ساہوکار اور مہاجن سے قرض لیتا تھا اور کسی مصیبت زدہ شخص کی مدد کرنے کے بجائے اس سے قرض پر سود لینا بے شک ظلم، قساوت قلبی اور سنگ دلی ہے۔ اس وجہ سے قرآن حکیم میں اس سود کو حرام کہا گیا ہے لیکن آج کل کا مروجہ سود اس سود سے بالکل مختلف ہے۔ آج کل بینکوں سے غریب اور مصیبت زدہ شخص قرض نہیں لیتے بلکہ متمول، سرمایہ دار، تاجر اور بڑے بڑے صنعت کار قرض لیتے ہیں۔ وہ اس روپے کو اپنے کاروبار میں لگاتے ہیں، نئی مشینیں خریدتے ہیں، نئی فیکٹریاں لگاتے ہیں اور اپنے کاروبار کو وسیع کرتے ہیں اور خوب دولت کماتے ہیں۔ ان سے اس قرض کی رقم پر جن کو انہوں نے اپنے کاروبار میں لگایا تھا بینک ایک خاص شرح سے جو سود وصول کرتا ہے وہ کوئی ظلم نہیں ہے۔ کیونکہ اگر وہ بینک کو پندرہ فیصد سود ادا کرتے ہیں تو خود وہ اس روپے سے ساٹھ ستر فیصد تک کماتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ بینک سے قرض لے کر پہلے ایک فیکٹری لگاتے ہیں پھر اس ایک سے دو تین اور چار فیکٹریاں لگاتے ہیں۔ اس طرح سے تاجروں کی تجارت میں اضافہ ہوتا ہے۔ اب اگر وہ اپنی اس کمائی سے بینک کو پندرہ فیصد سود دیتے ہیں تو یہ ان پر نہ تو کوئی بوجھ ہے اور نہ ہی ظلم۔ اور بینک میں روپیہ عوام کا ہوتا ہے۔ اگر بینک ان کو سات آٹھ فیصد سود ادا کرے تو یہ بینک پر کوئی بوجھ نہیں۔ سرمایہ دار اور بینک دونوں خوشی سے سود دیتے لیتے ہیں اور چونکہ بینکوں میں اکثر و بیشتر غریب اور متوسط لوگ اپنی فاضل بچت کی رقمیں جمع کرواتے ہیں تو سود کے ذریعہ ان کو بھی فائدہ پہنچ جاتا ہے۔ مختصر یہ کہ جاہلیت کا سود خور

غریبوں سے سود لیتا تھا اور اس زمانہ کی ترقیاتی اسکیم بینکوں کے ذریعے غریبوں کو سود دیتی ہے۔ وہ ربا غریبوں پر ظلم تھا اور یہ ربا غریبوں کی خوشحالی اوران کی مالی ترقی کا باعث ہے۔ اس لیے شخصی اور نجی ضروریات کے قرضوں پر سود ناجائز نہیں بلکہ یہ تجارتی قرضوں پر بینک کا سود جائز ہونا چاہیے۔

یہ دلیل ہے تو بڑی خوش آئندہ اور غریبوں کو خوش کرنے والی ہے لیکن اگر اس کا تجزیہ کیا جائے تو یہ بالکل بودی دلیل ہے۔ اس سلسلہ میں سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ قرآن حکیم میں مطلقاً سود حرام ہے خواہ نجی ضروریات کے قرضوں پر سود ہو یا تجارتی قرضوں پر ہو، خواہ اس سود سے غریبوں کو نقصان ہو یا فائدہ اللہ تعالیٰ نے امارت وغربت کا فرق کیے بغیر سود کو علی الاطلاق حرام کیا ہے۔ [سورہ البقرہ آیات نمبر ۲۷۵، ۲۷۸، ۲۷۹] ان آیات میں اللہ تعالیٰ نے سود کو مطلقاً حرام کیا ہے۔ سود مفرد کو بھی حرام کیا اور سود مرکب کو بھی اور ہر جگہ سود کو مطلق حرام کیا اور نجی اور کاروباری قرضوں کا فرق نہیں کیا۔ علاوہ ازیں تاریخ اور حدیث سے ثابت ہے کہ زمانہ جاہلیت میں کاروباری قرضوں پر بھی سود لینے کا عام رواج تھا۔ چنانچہ علامہ ابن جریر طبری نے ''وذروا مابقی من الربوا'' کی آیت کے تحت لکھا ہے۔

''یہ وہ سود تھا جس کے ساتھ زمانہ جاہلیت میں لوگ خرید وفروخت کرتے تھے۔ ایسا ہی علامہ سیوطیؒ نے تفسیر درمنثور جلد ا ص ۳۶۶ پر لکھا ہے۔''

ان روایات سے معلوم ہوتا ہے زمانہ جاہلیت میں بھی بڑے بڑے تاجر خوردہ فروشوں کے ہاتھ ادھار مال فروخت کرتے تھے اور اس پر سود لیتے تھے۔ معلوم ہوا زمانہ جاہلیت میں بھی کاروباری اور تجارتی قرضوں پر سود لگانے کا عام رواج تھا اور قرآن حکیم نے عموم کے صیغہ سے سود کی ممانعت کی ہے۔

یہ جدید مفکرین اس سلسلہ میں ایک اور دلیل پیش کرتے ہیں کہ بینک کے سود کے جائز ہونے کی دوسری وجہ یہ ہے کہ افراط زر کی وجہ سے روپے کی قدر (Value) روز بروز گرتی جارہی ہے اور اجناس اور جائیداد کی قیمت بڑھتی جارہی ہے۔ آج سے ستر سال پہلے

سونا ۲۵ روپے تولہ تھا دیسی گھی تین روپے سیر اسی طرح دوسری اشیاء بھی بہت سستی تھیں لیکن اب (2005ء) میں سونا دس ہزار روپے تولہ اور دیسی گھی اڑھائی سو روپیہ کلو ہے۔اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ستر سال میں روپیہ کی قدر (Value) کئی گنا گھٹ گئی ہے۔اس کا مطلب یہ ہے کہ جس شخص نے ستر سال قبل بینک میں ایک ہزار روپیہ رکھوایا تھا اب اس کی قیمت پچاس روپے سے بھی کم ہوگئی ہے۔اگر اس ہزار پر ہر سال سود لگتا رہتا تو اس کی ساکھ کسی حد تک بحال رہتی اور جو لوگ بینک میں اپنی بچتوں (Savings) کو جمع کراتے ہیں ان کا نقصان نہ ہوتا اس لیے بینک کا سود جائز ہونا چاہیے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ بینک کے سود کو نا جائز قرار دینے کی بناء پر افراط زر کی وجہ سے روپیہ کی قدر گر جاتی ہے۔اگر بینک سے سود نہ لیا جائے تو ستر سال میں بینک میں جمع کرائے ہوئے ایک ہزار روپے کی قیمت بہت کم رہ جائے گی۔تو مسلمان ہونے کے ناطے اس دلیل کی کوئی حیثیت نہیں کیونکہ ایک مسلمان کے لیے اللہ کے حکم پر عمل کرنے اور اس کے منع کردہ کام سے بچنے کی وجہ سے اگر ہمیں کوئی مادی نقصان ہوتا ہے تو ہمیں اس کو بخوشی گوارا کرنا چاہیے۔مسلمان کے نزدیک نفع اور نقصان کا معیار دنیوی اور مادی اعتبار سے نہیں ہے بلکہ آخروی اور معنوی اعتبار سے ہے۔دنیوی اور مادی اعتبار سے زکوۃ، قربانی اور حج وغیرہ کے لیے زر کثیر خرچ کرنا بھی مال کا ضیاع اور نقصان ہے تو کیا اس مادی نقطہ نظر سے ان تمام مالی عبادات کو خیر باد کہہ دیا جائے گا؟ اور جب مسلمان مالی عبادات کو چھوڑنے پر تیار نہیں تو سود کھا کر اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے اعلان جنگ کیلئے کیسے تیار ہو سکتے ہیں؟ ایک سچے اور پکے مسلمان کے نزدیک سود چھوڑنے کی وجہ سے روپے کی قدر کا کم ہو جانا خسارہ نہیں ہے بلکہ اصل خسارہ یہ ہے کہ سود لینے کی وجہ سے آخرت برباد ہو جائے۔

دوسرا جواب اس بات کا یہ ہے کہ یہ نقصان دراصل ہماری ایک اجتماعی غلطی کی سزا ہے اور وہ یہ کہ ہم نے اسلامی طریقہ مضاربت کو رواج نہیں دیا اور اس سودی نظام نے قریباً تمام قوم کو حریص، لالچی اور بد دیانت بنا دیا ہے۔اگر کوئی ریٹائرڈ شخص اپنی تمام عمر کی پونجی کسی شخص کے ساتھ مضاربت میں لگاتا ہے تو دوسرا شخص اس کا تمام روپیہ ہضم کر جاتا ہے۔اگر

بینک اس روپیہ کو مضاربت میں لگائے تو بینک کا بھی فائدہ ہو اور مضارب کا بھی، لیکن بینک چونکہ ایک یہودیوں کا ایجاد کردہ ادارہ ہے لہٰذا وہ اپنا روپیہ مضاربت کے بجائے مختلف کاروبار میں سود کی شرح پر لگاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اب لوگ بینکوں پر زور دے رہے ہیں کہ وہ اپنا روپیہ مضاربت پر لگایا کریں۔ دنیا میں اس وقت ستر (۷۰) کے قریب بینک اور مالیاتی ادارے ہیں جو غیر سودی بنیادوں پر کاروبار کرتے ہیں۔ بینک بھی زیادہ نفع کماتے ہیں اور لوگوں کو بھی بینکوں کے ذریعہ مضاربت میں روپیہ لگانے سے زیادہ فائدہ ہو رہا ہے۔

سود کے مختلف مفاسد:

سود کے اخلاقی، تمدنی، معاشی اور اجتماعی قسم کے بہت سے مفاسد ہیں۔ آپ اخلاق اور روحانیت کے نقطہ نظر سے دیکھیں کیوں کہ اخلاق اور روح ہی جوہر انسانیت ہے اور اگر کوئی شے ہمارے اس جوہر کو نقصان پہنچائے تو وہ ہر حالت میں قابل ترک ہے خواہ کسی دوسرے پہلو سے اس میں کتنے ہی فوائد کیوں نہ ہوں۔ اب اگر آپ سود کا نفسیاتی تجزیہ کریں تو آپ کو فوراً معلوم ہو جائے گا۔ کہ روپیہ جمع کرنے کی خواہش سے لے کر سودی کاروبار کے مختلف مرحلوں تک پورا ذہنی عمل خود غرضی، حرص، بخل، تنگ دلی بلکہ سنگ دلی اور زر پرستی جیسی صفات رذیلہ کے زیر اثر جاری رہتا ہے اور جتنا جتنا آدمی اس کاروبار میں آگے بڑھتا ہے یہی صفات رذیلہ اس کے اندر نشوونما پاتی جاتی ہیں۔

تمدنی حیثیت سے پہلی نظر ہی میں ایک شخص بخوبی جان سکتا ہے کہ جس معاشرے میں افراد ایک دوسرے کے ساتھ خود غرضی کا معاملہ کریں۔ کوئی اپنی ذاتی غرض اور ذاتی فائدے کے بغیر کسی کے کام نہ آئے ایک کی حاجت مندی دوسرے کیلئے نفع اندوزی کا موقع بن جائے اور مال دار اور سرمایہ دار طبقوں کا مفاد نادار اور حاجت مند طبقات کی ضد ہو جائے ایسا معاشرہ کبھی بھی مضبوط اور مستحکم نہیں ہو سکتا۔ اس کے اجزاء ہمیشہ انتشار و پراگندگی ہی کی طرف مائل رہیں گے اور اگر دوسرے اسباب بھی اس صورت حال کے لیے مددگار بن جائیں تو ایسے معاشرے کے اجزاء کا باہم متصادم ہو جانا بھی کچھ مشکل نہیں ہے۔ اس کے

برعکس جس معاشرے کا اجتماعی نظام آپس کی ہمدردی پر مبنی ہو جس کے افراد ایک دوسرے کے ساتھ فیاضی اور فراخ حوصلگی کا معاملہ کریں جس میں ہر دوسرے شخص کی احتیاج کے موقع پر فراخ دلی کے ساتھ مدد کا ہاتھ بڑھائیں اور جس میں مال دار اور سرمایہ دار لوگ نادار اور حاجت مند لوگوں کے ساتھ ہمدردانہ اعانت یا کم از کم منصفانہ تعاون کا طریقہ برتیں، ایسے معاشرے میں آپس کی محبت اور خیر خواہی اور باہمی دلچسپی نشوونما پائے گی۔ اس کے اجزاء ایک دوسرے کے ساتھ پیوستہ اور ایک دوسرے کے پشتیبان ہوں گے اس میں اندرونی نزاع اور تصادم کو راہ پانے کا موقع نہ مل سکے گا۔ اس میں باہمی تعاون اور خیر خواہی کی وجہ سے ترقی کی رفتار پہلے معاشرے کی بہ نسبت بہت زیادہ تیز ہوگی۔

ایسا ہی حال بین الاقوامی تعلقات کا بھی ہے۔ ایک قوم دوسری قوم کے ساتھ فیاضی اور ہمدردی کا معاملہ کرے اور اس کی مصیبت کے لیے کھلے دل سے تعاون کا ہاتھ بڑھائے ممکن نہیں ہے کہ دوسری طرف سے اس کا جواب محبت اور شکر گزاری اور مخلصانہ خیر خواہی کے سوا کسی اور صورت میں ملے۔ اس کے برعکس وہی قوم اگر اپنی ہمسایہ قوم کے ساتھ خود غرضی اور تنگ دلی کا برتاؤ کرے اور اس کی مشکلات کا ناجائز فائدہ اٹھائے تو یہ ہوسکتا ہے کہ مال کی صورت میں وہ بہت کچھ فائدہ اور نفع اس سے حاصل کرے لیکن یہ کسی طرح ممکن ہی نہیں کہ پھر اپنے اس شائیلاک قسم کے ہمسایہ کے لیے اس قوم کے دل میں کوئی اخلاص، محبت، ہمدردی اور خیر خواہی رہ جائے۔

سود کے اگر معاشی پہلو پر نگاہ ڈالی جائے تو اس میں بھی بہت سے نقصانات مضمر ہیں۔ سود کا تعلق معاشی زندگی کے ان معاملات سے ہے جو صرف برصغیر پاک و ہند تک ہی محدود نہیں ہے بلکہ ایک عالم گیر بلا ہے۔ یہ وہ بلائے عظیم اور بلائے بے درماں ہے جس میں ملک کی متوسط اور غریب طبقوں کی اکثریت بری طرح پھنسی ہوئی ہے۔ اس کی وجہ سے قلیل المعاش کارکنوں کی آمدنی کا بڑا حصہ مہاجن یا بینک لے جاتا ہے شب و روز کی ان تھک محنت اور مشقت کے بعد جو تھوڑی سی تنخواہ یا مزدوری ان کو ملتی ہے ان میں سے سود ادا کرنے کے بعد ان کے پاس اتنا بھی نہیں بچتا کہ وہ دو وقت کی روٹی چلا سکیں۔ یہ چیز صرف یہی نہیں

کہ ان کے اخلاق کو بگاڑتی ہے اور انہیں جرائم کی طرف دھکیلتی ہے، اور صرف یہی نہیں کہ ان کے معیار زندگی کو پست اور ان کی اولاد کے معیار تعلیم و تربیت کو پست تر کر دیتی ہے بلکہ اس کا ایک نتیجہ یہ بھی ہوتا ہے کہ دائمی فکر اور پریشانی ملک کے عام کارکنوں کی قابلیت کار کو بہت گھٹا دیتی ہے اور جب وہ دیکھتے ہیں کہ ان کی محنت کا پھل دوسرا لے جا رہا ہے تو پھر اپنے کام سے ان کی دلچسپی ختم ہو جاتی ہے۔ اس لحاظ سے سودی کاروبار کی یہ قسم صرف ایک ظلم ہی نہیں بلکہ اس میں اجتماعی معیشت کا بھی بڑا بھاری نقصان ہے۔

اس کا دوسرا معاشی نقصان یہ ہے کہ اس طرح غریب طبقہ کی رہی سہی قوت خرید بھی سود خور خواہ ساہوکار یا وہ کوئی اور شخص ہو یا بینک کی شکل میں ادارہ چھین لے جاتا ہے۔ لاکھوں آدمیوں کی بیروزگاری اور کروڑوں آدمیوں کی ناکافی اور قلیل آمدنی پہلے ہی تجارت وصنعت کے فروغ میں مانع تھی، اس پر تم نے اچھی آمدنیاں رکھنے والوں کو یہ راستہ دکھایا کہ وہ خرچ نہ کریں بلکہ زیادہ سے زیادہ پس انداز کیا کریں۔ اس سے کاروبار کو ایک نقصان اور پہنچا اب اس پر مستزاد یہ ہے کہ لاکھوں کروڑوں غریب آدمیوں کی ناکافی اور قلیل تنخواہوں اور مزدوریوں کی شکل میں جو تھوڑی بہت خریداری حاصل ہوتی ہے اس کو بھی وہ اپنی ضروریات زندگی خریدنے میں استعمال نہیں کر پاتے بلکہ اس کا بڑا حصہ ساہوکار اور بینک ان سے چھین لیتا ہے اور اس کو اشیاء ضروریہ کی خریداری میں صرف کرنے کے بجائے سوسائٹی کے سر پر مزید سود طلب قرض چڑھانے میں استعمال کرتا ہے۔ ذرا حساب لگا کر دیکھیں کہ اگر دنیا میں پانچ کروڑ آدمی بھی ایسے ہوں جو مہاجنوں، ساہوکاروں اور بینکوں کے پھندے میں پھنسے ہوں اور وہ اوسطاً دس روپے مہینہ ادا کر رہے ہوں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ ہر ماہ پچاس کروڑ روپے کا مال فروخت ہونے سے رہ جاتا ہے اور اتنی بھاری رقم معاشی پیداوار کی طرف پلٹنے کے بجائے مزید سودی قرضوں کی تخلیق میں ہر ماہ صرف ہوتی رہتی ہے۔ [مسئلہ سود]

سود کی انہی خرابیوں اور نقصانات کے علاوہ دوسرے نقصانات کو حجۃ الاسلام امام غزالیؒ نے اپنی مشہو کتاب ''احیاء العلوم'' میں ذکر کیا ہے۔ علاوہ ازیں امام فخر الدین رازیؒ

نے اپنی تفسیر کبیر میں بڑی نفیس اور سیر حاصل بحث کی ہے، اہل علم ضرور ملاحظہ فرمائیں۔ سود کے بارہ میں قاسم العلوم والخیرات حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ نے بھی اپنے ایک مکتوب میں بڑی پتے کی باتیں لکھی ہیں جو اہل علم کے پڑھنے کے قابل ہیں۔ خلاصہ ان سب حضرات کی تحریروں کا یہی ہے کہ سود جس کو زمانہ جاہلیت میں اور اس عہد جدید میں بھی معیشت کی ترقی کے لیے ضروری قرار دیا جاتا ہے اور سپریم کورٹ میں حکومت کے وکیل نے بھی یہ بیان دیا تھا کہ پاکستان کی معیشت کیلئے سود نہایت ضروری ہے، وہ اس کے بغیر نہیں چل سکتی، لیکن تاریخ کے اوراق اس بات کی شہادت دیتے ہیں کہ ان جوشیلے مسلمانوں کی یہ بات بالکل غلط ہے۔ اس سود نے آسٹریا کی معیشت کو تباہ کیا، ہنگری کی معیشت پر سود کے تباہ کن اثرات پڑے (ملاحظہ ہو مڈلینڈ بینک، لندن کا رسالہ بابت مئی، جون ۱۹۳۸ء، نیویارک ٹائمز بابت ۱۶ دسمبر ۱۹۹۳ء) پھر بلغاریہ اور رومانیہ کی معیشت پر بھی اس کے نہایت تباہ کن اثرات پڑے (لندن ٹائمز، بابت ۳۱ اگست ۱۹۳۳ء، ۱۱ اگست ۱۹۳۳ء، ڈیلی میل، یکم ستمبر ۱۹۳۳ء) سود جس معاشرہ میں بھی ہوگا وہاں دولت سمٹ سمٹا کر چند ہاتھوں میں چلی جائے گی اور عوام کی حالت دن بدن بد سے بدتر ہوتی جائے گی۔ اس سلسلہ میں مسٹر جافری یڈلپ کا یہ کہنا بالکل درست اور صحیح ہے کہ ایسا معاشرہ جو اپنے بینکروں کے حلقہ اثر میں ہو اور ان کی اخلاقی تلقین کا روادار ہو، باقی رہنے کے قابل نہیں معاشرہ کی خرابیوں کے ذمہ دار یہی بینک کار ہیں۔ یہ لوگ غریبوں کا استحصال کرتے ہیں اور چند ہاتھوں میں سمٹاؤ کی حوصلہ افزائی کرتے ہیں۔ چنانچہ پاکستان میں تجارتی بینکوں نے ۳۱ دسمبر ۲۰۰۰ء ختم ہونے والے سال میں مجموعی طور پر ۷ ارب روپے منافع ظاہر کیا جو ۲۰۰۲ء میں ۱۹۶۴ ارب، سنہ ۲۰۰۴ء میں ۵۱.۱ ارب اور سنہ ۲۰۰۶ میں ۸۵ ارب ہوگیا اور سنہ ۲۰۰۷ء میں یہ منافع سو ارب سے بھی بڑھ جائے گا۔ یہ سب رقم سودی نظام کے ذریعہ عوام کا خون چوس کر حاصل کر لی گئی ہے۔ اس بے مثال اضافہ کے باوجود کھاتے داروں کو دیئے جانے والے منافع کی شرح میں مسلسل کمی ہو رہی ہے۔ اس طرح سادہ لوح عوام ایک طرف افراط زر اور دوسری طرف سودی استحصال کا شکار ہیں۔ مائیکرو فنانسنگ نے معاشرہ کے ہر فرد کو قرض میں جکڑ دیا ہے۔

حکومت مسکرا رہی ہے اور عوام رو رہے ہیں۔

سود کے یہ مفاسد اور خرابیاں صرف افراد اور بڑی بڑی فیکٹریوں اور تجارتی کمپنیوں ہی تک محدود نہیں بلکہ بین الاقوامی بینکوں اور ورلڈ بینک سے جو ممالک اپنی نام نہاد ترقی کے جو سود پر قرضے لیتے ہیں، وہ ان قرضوں میں اس طرح پھنس جاتے ہیں کہ ساری زندگی اس قرضے کا سود ہی نہیں اتار سکتے بلکہ اکثر ملکوں کو جن میں پاکستان بھی شامل ہے، سود ادا کرنے کے لیے پھر قرضہ لینا پڑتا ہے اور ان کا اصل زر وہیں کا وہیں رہتا ہے۔

اس وقت دنیا میں دو بڑے ادارے مختلف ملکوں کو سود پر قرض دیتے ہیں۔ قریباً ایک سو اسّی سے زائد ممالک کسی نہ کسی سطح پر ان دو اداروں (ورلڈ بینک اور آئی ایم ایف) کے زیر اثر ہیں۔ یہ ادارے نہ صرف ملکوں کو کنٹرول کرتے ہیں بلکہ ان کی سیاست، سفارت کاری، ثقافت اور بیوروکریسی پر بھی حکومت کرتے ہیں۔ یہ جس ملک سے ناراض ہو جائیں یا اس ملک کے صاحبان اقتدار ان کی ہاں میں ہاں نہ ملائیں تو وہ ملک سسکنا شروع ہو جاتا ہے۔ صرف انہی ملکوں کی صنعت و تجارت ترقی کی شاہراہ پر گامزن ہوتی ہے جس ملک کو یہ ترقی کی اجازت دیتے ہیں۔ جب یہ کسی سے خوش ہوتے ہیں تو اس کے لیے اپنی تجوریوں کے منہ کھول دیتے ہیں، اور اگر ناراض ہوتے ہیں تو حکمرانوں کو مجبور کرتے ہیں کہ وہ عوام کو مہنگائی کی چکی میں پیس کر رکھ دیں ان کے لیے ضروریات زندگی ٹیکس لگا کر مہنگی کر دیں۔ بجلی، گیس اور پٹرول میں خاطر خواہ اضافہ کر دیں۔ اس جمہوری دور میں جب ضروریات زندگی گراں اور مہنگی ہوتی ہیں تو عوام جلسوں اور جلوسوں کی شکل میں حکمرانوں کے خلاف اٹھ کھڑے ہوتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ حکمران مسند اقتدار سے جلد فارغ ہو کر گھر جا بیٹھتا ہے، انکار کرتا ہے تو اسے ''دیوالیہ'' ہونے کی خوشخبری سنا دی جاتی ہے۔ اس کے لیے ''نہ جائے رفتن نہ پائے ماندن'' والا معاملہ ہو جاتا ہے۔

آئی ایم ایف (انٹرنیشنل مانیٹری فنڈ) کا یہ ادارہ ۱۹۴۵ء میں جنگ عظیم دوم کے ختم ہونے کے بعد وجود میں آیا، لیکن جلد ہی اس نے دنیا کے ۱۸۳ ملکوں کو اپنے آہنی پنجوں میں جکڑ لیا۔ آئی ایم ایف کے تین مقاصد ہیں:

(۱) عالمی تجارت میں توازن پیدا کرنا

(۲) مختلف ممالک کی کرنسیوں کی شرح تبادلہ طے کرنا

(۳) کرنسیوں کی قیمت گرنے پر نظر رکھنا

ان تین مقاصد کے باعث اس نے دنیا کی اقتصادیات پر مکمل طور پر قبضہ کر لیا کیوں کہ جب کوئی ملک آئی ایم ایف کا ممبر بنتا ہے تو دستخط کرنے کے بعد اس ملک کی تجارت، اس کی کرنسی کی شرح تبادلہ آئی ایم ایف کے ہاتھ میں چلی جاتی ہے۔ اب اس ملک کا بجٹ، اس کی معاشی پالیسیاں، اس کی مصنوعات، اس کا ٹیکس سسٹم اور اس ملک کی سیاست پر آئی ایم ایف کا اثر انداز ہونا اس کا استحقاق ہو جاتا ہے۔ اب یہ مالیاتی ادارہ اس ملک کی دولت، اس کے مالیاتی ذخائر، قرضوں کی ترسیل، ایکسچینج ریٹ، صنعت وحرفت، بینکوں، معاشی قوانین اور ملکی پالیسیوں کی نگرانی کرتا ہے۔ کوئی رکن ملک اس کی اجازت کے بغیر کسی قسم کا معاشی ردوبدل نہیں کر سکتا کیوں کہ آئی ایم ایف کے ملازمین تمام ممبر ملکوں کی وزارت خزانہ میں بیٹھے ہوتے ہیں۔ تمام سرکاری کاغذات ان کے ہاتھوں سے نکل کر دائیں بائیں جاتے ہیں۔ اگر اس ملک کا کوئی فرد کوئی ایسی اصلاح کرتا ہے جس سے بین الاقوامی تجارت یا عالمی تجارت متاثر ہوتی ہے تو فوراً اس کی اطلاع واشنگٹن کر دی جاتی ہے، اور پھر وہاں سے ایک ایسا ٹیلی فون آتا ہے جس سے وہ اصلاح واپس لے لی جاتی ہے یا اس میں واشنگٹن کی مرضی کے مطابق ترمیم کر دی جاتی ہے۔

آئی ایم ایف اور ورلڈ بنک کی ساٹھ سالہ تاریخ میں ایک بھی ملک ایسا نہیں جس نے ایک بار ان سے سودی قرض لیا ہو اور اس کے بعد اس سے اس کی جان مکمل طور پر چھوٹ گئی ہو۔ یہ آکٹوپس (Octopus) کی طرح اس ملک کو اپنی ٹانگوں میں اس طرح پھانستا ہے کہ وہ ملک لاکھ ہمت وطاقت کے باوجود اس کے آہنی پنجوں اور مضبوط گرفت سے نہیں نکل سکتا۔

پاکستان کے ذمہ صرف چار اداروں بی آئی ایس، آئی ایم ایف، ورلڈ بنک اور ای سی ڈی کا ۲۲ ہزار تین سو ۹۲ ملین ڈالر قرضہ ہے جو ۲۲ ارب تین سو نوے بلین ڈالر بنتے ہیں۔

ان سوا بائیس ارب ڈالر میں تین بڑے بنکوں کے ہم نے ۵ ہزار ۱۳ ملین ڈالر اور ۱۹ ملین ڈالر بیرون ملک سیکورٹیز کی شکل میں ہیں۔ ۲ ہزار ۵ سو ملین تجارتی قرضے ہیں جب کہ ۱۵ ہزار ۲ ملین ڈالر کثیر الجہتی دعوے ہیں۔ ہم ہر سال ایک ہزار آٹھ سو ۳۳ ملین ڈالر کی قسط ادا کرتے ہیں۔ اس میں سے ہم بنکوں کو ایک ہزار چار سو ۱۲ ملین ڈالر دیتے ہیں۔ میمورنڈم آئٹمز میں ۲۰ ہزار ۶ ۱۷ ملین ڈالر ہمارے ذمہ ہیں جب کہ ہمارے مالیاتی ذخائر (مارچ ۲۰۰۲ء) تین ہزار ۹۶۵ ملین ڈالر ہیں۔ ہم اگر بیرونی میمورنڈم آئٹمز کو جمع کریں تو ہمارا قرضہ ۴۰ بلین ۵۶۸ ملین ڈالر بنتا ہے۔ ان میں سے اگر ہم رعایتیں نکال دیں تو ۳۶ بلین اور سو ملین ڈالر بنتے ہیں، جو ظاہر ہے کہ ہمارے جیسے ملک کے لیے ادا کرنا ممکن نہیں۔ جتنا ہمارا یہ قرضہ ہے اس سے کئی گنا زیادہ ہم آج تک سود کی شکل میں ادا کر چکے ہیں لیکن ہمارا قرضہ وہیں کا وہیں ہے، ہم جو کچھ ہر سال دیتے ہیں وہ سود میں کٹتا ہے۔

آج دنیا میں روپے کے دریا بہہ رہے ہیں۔ اتنی دولت اس سے قبل کبھی نہیں ہوئی تھی۔ زمین نے اپنے خزانے باہر اگل دیئے ہیں۔ (و اخرجت الارض اثقالها) لیکن اس کے باوجود ہر متنفس بے چین اور بے سکون ہے۔ حرص و ہوس دل میں گھر کیے ہوئے ہے۔ لوٹ مار کا بازار گرم ہے۔ دنیا کے ۱۸۳ ملکوں کے عوام کی خون پسینے کی کمائی سود میں دی جارہی ہے اور قرضہ ہے کہ شیطان کی آنت کی طرح بڑھتا ہی چلا جاتا ہے۔ یہ ساری بے چینی اس سود کی وجہ سے ہے جو ختم ہونے کا نام نہیں لیتا اور عوام کا خون چوس چوس کر بڑے بڑے سرمایہ داروں کی توندوں کو موٹا کر رہا ہے۔

شریعت اسلامیہ نے اسی وجہ سے نہایت سختی کے ساتھ سود کو حرام قرار دیا کیوں کہ یہ جس فرد یا ملک کو چمٹ جائے اس کو پھر کسی صورت نہیں چھوڑتا اور وہ فرد یا ملک قرض دینے والے کا بے دام غلام بن جاتا ہے۔ وہ قومیں کبھی بھی ترقی کی منازل طے نہیں کر سکتیں جن میں سود کا چلن ہو۔ کہا جاتا ہے اور بالکل درست کہا جاتا ہے کہ "کاشت کار مقروض پیدا ہوتا ہے، مقروض زندہ رہتا ہے اور مقروض ہی مرتا ہے۔"

جب کہ گزشتہ صفحات میں بتایا گیا ہے کہ سود سرمایہ دارانہ نظام کا ایک نہایت اہم

ستون ہے آج کل دہشت گردی کے خلاف جنگ کے نام پر دنیا میں جو کچھ امریکہ اور اس کے اتحادی گزشتہ کئی برسوں سے کر رہے ہیں، وہ دراصل سرمایہ دارانہ ایجنڈے کی تکمیل ہے نہ کہ دہشت گردی کا اختتام، کیوں کہ اس سے دہشت گردی میں روز بروز اضافہ ہو رہا ہے۔ دہشت گردی پیدا ہوتی ہے غربت وافلاس اور عدل وانصاف سے محرومی کے باعث۔ انسانی تاریخ میں ایسے معاشرے تو آپ کو بے شمار ملیں گے جہاں غربت اور فاقہ کشی ہو لیکن معاشرہ میں عدل ہو، مگر ایسے معاشروں کا فقدان ہے جہاں عدل نہ ہو اور اس کے باوجود امن و سکون پایا جائے۔ جب بھی کسی قوم کو عدل وانصاف کی برکات سے محروم کیا جائے گا تو اس میں شدت پسندی، دہشت گردی اور انتہا پسندی وغیرہ فطری عمل کے طور پر پیدا ہوگی۔

سوشلزم کے خاتمہ کے بعد امریکہ پوری دنیا کا چوہدری بن گیا جو کہ سرمایہ دارانہ نظام کا قائد ہے۔ اس کا مقصد ہے کہ کوئی ایسی تدبیر کی جائے کہ دنیا کو سرمایہ دارانہ نظام کی گرفت میں جکڑ لیا جائے۔ چنانچہ وہ دنیا کے ہر ملک میں دہشت گردی کے خلاف جنگ کے نام پر دہشت گردی پھیلا کر دنیا کو سرمایہ دارانہ نظام میں جکڑنے کی کوشش کر رہا ہے اور اس میں وہ بڑی حد تک کامیاب بھی ہوا ہے۔ سرمایہ دارانہ نظام کی اصل بنیاد امیر و غریب کی تفریق ہے۔ چنانچہ اس بارے میں میرل لانچ (Meril Lynch) اور کیپ جمنی (Capgemini) کی جون ۲۰۰۶ء کی ایک سروے رپورٹ جو شائع ہوئی ہے، اس میں انکشاف کیا گیا ہے کہ دنیا میں ۸۷ لاکھ افراد ایسے ہیں جن کی دولت کروڑوں ڈالر بنتی ہے۔ گزشتہ سال ان دولت مندوں اور مال داروں کی تعداد میں ۵ لاکھ افراد کا اضافہ ہوا ہے۔ ان ۸۷ لاکھ افراد میں سے ۲۶ لاکھ ۷۰ ہزار کا تعلق امریکہ سے ہے۔ ۷ لاکھ ۶۷ ہزار کا تعلق جرمنی سے، ۴ لاکھ ۴۸ ہزار کا برطانیہ سے، تین لاکھ ۲۰ ہزار کا چین سے، ایک لاکھ نو ہزار کا برازیل سے، ایک لاکھ تین ہزار کا روس سے، ایک لاکھ ۴۶ ہزار کا آسٹریلیا سے، ۲ لاکھ ۳۲ ہزار کا کینیڈا سے اور ۸۳ ہزار کا انڈیا سے۔

فاربس میگزین کی ایک رپورٹ کے مطابق سنہ ۲۰۰۵ء میں دنیا میں ارب پتی افراد کی فہرست میں ۱۰۴ نئے ناموں کا اضافہ ہوا ہے، اور اب دنیا میں یہ تعداد ۶۹۱ ہوگئی

ہے۔ دنیا کے دس امیر ترین اشخاص میں بل گیٹس پہلے نمبر پر، وارن بفے دوسرے، بھارت کے لکشمی متیل تیسرے نمبر پر اور سعودی عرب کے ولید طلال پانچویں نمبر پر ہیں۔

امریکہ میں فنانس کی ماہر انتونیا جوباز کی ایک کتاب The Bush Agenda کے مطابق پوری دنیا میں سرمایہ دارانہ نظام کی مکمل اور سخت گرفت امریکہ کے مفاد میں ہے۔ اس کتاب میں لکھا ہے کہ صدر بش کی پالیسیوں کی وجہ سے امریکہ کی ۲۹ بڑی تیل کمپنیوں نے ۲۰۰۳ء میں ۴۳ ارب ڈالر منافع کمایا جب کہ ۲۰۰۴ء میں ۶۸ ارب ڈالر منافع حاصل کیا ہے۔ اس کتاب کے مطابق امریکہ اپنے اس سرمایہ داری نظام کو بڑھانے اور اس کی گرفت مضبوط کرنے کے لیے مشرق وسطیٰ کے تیل اور گیس کے ذخائر پر اپنی کمپنیوں کے ذریعے کنٹرول کر کے وہاں کی مارکیٹوں میں امریکی مصنوعات کو فروغ دینا چاہتا ہے۔ اس سلسلہ میں مڈل ایسٹ فری ٹریڈ ایریا کے نام سے ایک آزادانہ تجارتی زون قائم کر رہا ہے۔ اس کا مقصد یہ ہے کہ امریکہ عسکری اور معاشی غلبہ حاصل کر کے دنیا میں امن قائم رکھ سکے۔ اب پاکستان اور نائیجیریا بھی امریکہ کے اس ایجنڈے کے پیروکار ہو گئے ہیں کہ دنیا میں سرمایہ دارانہ نظام کو فروغ ہو اور دولت چند ہاتھوں میں سمٹ کر رہ جائے اور ساری دنیا کے غریب اور نادار لوگ ان کے رحم و کرم پر چھوڑ دیئے جائیں، ورنہ یہ بات ہر صاحب عقل وخرد کی سمجھ سے بالا ہے کہ کوئی ملک اپنے اور غریب عوام کے سرمایہ سے بنے ہوئے ادارے اونے پونے فروخت کر دے جو اسے ہر سال اربوں روپے کا منافع کما کر دے رہے ہوں جیسے پی ٹی سی ایل، حبیب بنک، مسلم کمرشل بنک، سٹیل ملز وغیرہ۔ یہ ادارے حکومت کے لیے نہایت منافع بخش ہیں، لیکن سرمایہ دارانہ نظام کو مضبوط کرنے کے لیے بڑی بے دردی سے انہیں ذبح کر دیا گیا۔

﴿شراکت﴾

اسلام کے ابتدائی دور میں تجارت کی مختلف قسمیں رائج تھیں ان میں شراکت اور مضاربت کے اصولوں پر بھی تجارت کی جاتی تھی۔ رسول اللہ ﷺ نے نہ صرف شراکت کو پسند فرمایا بلکہ دوسروں کے ساتھ شراکت کی بنیاد پر کاروبار بھی کیا۔ شراکت ہے کیا؟ دو یا دو سے زیادہ افراد کسی کاروبار میں متعین سرمایہ کے ساتھ نفع کے حصول کے لیے اکٹھے ہوں اور کاروبار کے نفع نقصان میں پہلے سے طے شدہ نسبتوں کے ساتھ شریک ہوں۔

اسلام میں تجارت میں شراکت کا جواز:

سرکار دو عالم ﷺ کی بعثت کے وقت تجارت کے بہت سے طریقے رائج تھے۔ رسول اللہ ﷺ نے ان میں تمام ناجائز طریقوں کی ممانعت فرمادی یا پھر ان میں ان تمام طریقوں کی اصلاح فرمادی جو اخلاق اور عدل وانصاف کے تقاضوں کے خلاف تھے اور ہر ایسا طریقہ جس میں نزاع یا فساد کی کوئی صورت پیدا ہو یا کسی ایک فریق کا فائدہ اور دوسرے فریق کا سراسر نقصان ہو ان تمام طریقوں کو ناجائز فرما کر ان سے روک دیا گیا۔

رسول اللہ ﷺ نے صنعت وتجارت اور زراعت کے جن طریقوں سے منع فرمایا ان میں ترامیم تجویز کیں، ان کے مطالعہ سے فقہاء کرام نے مصالح اور مفاسد کو متعین کیا جو کسی کاروبار کے جائز یا ناجائز ہونے کا باعث تھے۔ ان اسباب کا اطلاق دوسرے معاملات کے بارہ میں تحقیق کر کے ان کے جائز یا ناجائز ہونے کا تعین کرنے میں بھی مدد دیتا ہے لہٰذا کوئی ایسا طریقہ ہے جو سرکار دو عالم ﷺ کے زمانہ میں رائج تھا اور آپ ﷺ نے اس طریقہ کو اختیار کیا یا آپ ﷺ نے اس طریقہ کے بارہ میں اپنی پسندیدگی کا اظہار فرمایا یا اس طریقہ سے کسی شخص کو نہ روکا اور نہ ہی اس میں کوئی تبدیلی یا ترمیم تجویز کی، تو اسلام کی نگاہ میں وہ طریقہ جائز ہے۔ شراکت کا معاملہ بھی اسی طرح کا ہے کہ سرکار دو عالم ﷺ جب اسلامی ریاست کے سربراہ تھے تو اس زمانہ میں شراکت اور مضاربت کے تجارتی

طریقے رائج تھے۔ آپ ﷺ کے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم ان طریقوں سے تجارت کرتے تھے۔ آپ ﷺ نے ان طریقوں پر پسندیدگی کا اظہار فرمایا اس وجہ سے شراکت اور مضاربت دونوں شرعی طور پر تجارت کے جائز طریقے ہیں۔ چنانچہ سرکار دو عالم ﷺ سے مروی ہے کہ حق تعالیٰ شانہ فرماتے ہیں کہ جب تک دو شرکاء میں سے کوئی ایک دوسرے کے ساتھ خیانت نہ کرے میں ان دونوں کا تیسرا ساتھی بن جاتا ہوں۔ [ابوداؤد، بیہقی و حاکم]

حدیث میں ہے کہ ایک شخص رسول اللہ ﷺ کے پاس آیا اور عرض کیا کہ میں بازاری کاروبار کرتا ہوں اور میرا ایک شریک (Partner) مسجد میں نماز پڑھتا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ شاید تیرے کاروبار کی برکت اسی کی وجہ سے ہے۔ [المبسوط]

سائب بن شریک کے ساتھ رسول اللہ ﷺ نے مکہ میں تجارت میں شرکت کی تھی جب مدینہ منورہ میں ان صاحب سے ملاقات ہوئی تو آپ ﷺ نے اس کا ذکر فرمایا اور اس شرکت کو پسندیدگی کے ساتھ یاد کیا۔ [المبسوط للسرخسی، ابن ماجہ رقم ۲۲۸۷، مسند احمد ۴۲۵/۳]

ایک اور حدیث میں ہے کہ اللہ تعالیٰ کا ہاتھ ان حصہ داروں کے ساتھ ہوتا ہے جو ایمان داری سے کام لیں۔ [ابوداؤد]

یہ تو نقلی دلائل تھے لیکن عقلی لحاظ سے بھی شراکت کا جواز ثابت ہوتا ہے۔

(۱) اگر ایک شخص کے پاس ایک لاکھ روپیہ ہے اور وہ اس سے تجارت اور کاروبار کر کے دس ہزار روپے کماتا ہے جبکہ دو افراد ایک ایک لاکھ روپیہ ڈال کر دو لاکھ سے کوئی کاروبار کریں گے تو ان کو منافع بھی زیادہ ہوگا اور کاروبار بھی بڑے پیمانے پر ہوگا اور ان کو کاروبار میں زیادہ سرمایہ فراہم کرنے میں بھی آسانی ہوگی۔

(۲) یہ بھی ہوسکتا ہے کہ ایک شخص کے پاس سرمایہ موجود ہو لیکن کاروبار کرنے کی پوری صلاحیت اس میں موجود نہ ہو اس وجہ سے ہوسکتا ہے کہ اگر وہ اکیلا کاروبار کرے تو اپنے کاروبار کو بخوبی سرانجام نہ دے سکے لہٰذا دوسرے فریق کی شراکت سے اس کے لیے کاروبار چلانا بہتر اور مفید ہوگا۔

(۳) موجودہ زمانے میں ایک آدمی تو معمولی کام بھی نہیں کرسکتا اگر دو آدمی کسی کاروبار میں شریک ہوں گے تو وہ تقسیم کار کر کے اپنے کاروبار کو بخوبی چلاسکیں گے جس سے

استعداد عملی بھی بڑھے گی اور کاروبار کی کامیابی کے امکانات بھی روشن ہوں گے۔

شرکت کے شرائط:

فقہاء نے شریعت اسلامیہ کی روشنی میں کاروباری شرکت کی کچھ شرائط بھی لکھی ہیں جن میں اہم شرائط درج ذیل ہیں۔

۱- باہمی رضامندی:

قرآن وسنت کے مطابق آپس کے لین دین اور شرکت میں باہمی رضامندی ایک بنیادی شرط ہے۔

۲- فریقین کا بالغ ہونا:

معاہدہ شراکت کی ایک شرط یہ بھی ہے کہ فریقین بالغ ہوں کیونکہ نابالغ اور بچے کا معاہدہ قابل قبول نہیں ہوتا۔

۳- عاقل ہونا:

فریقین کا عمر کے لحاظ سے بالغ ہونے کے ساتھ ساتھ ذہنی لحاظ سے بھی بالغ (Mature) اور عاقل ہونا ضروری ہے تاکہ وہ کاروباری معاملات کو بخوبی سمجھ سکیں۔ مجنون اور بے عقل کا معاہدہ شراکت کوئی وزن نہیں رکھتا۔

۴- کاروبار کا جائز ہونا:

پھر جس کاروبار میں شراکت ہورہی ہے وہ کاروبار بھی شریعت میں جائز ہو۔ حرام اشیاء اور منشیات یا دوسری ناجائز چیزوں کا کاربار ویسے ہی شرعی طور پر ناجائز ہے لہذا اس میں شراکت بھی ناجائز ہے۔

۵- فریقین کے نفع کا پہلے سے تعین ہونا:

شراکت کیلئے یہ بھی ضروری ہے کہ فریقین کے نفع کا تعین بھی شراکت سے پہلے

طے ہو جائے تاکہ بعد میں کوئی نزاع اور جھگڑا پیدا نہ ہو۔

۶-نقصان کی ذمہ داری کا بھی تعین ہو:

کاروبار میں جس طرح نفع کا امکان ہوتا ہے اسی طرح نقصان کا امکان بھی ہوتا ہے۔ نقصان ہونے کی صورت میں فریقین اپنے اپنے سرمایہ کی شرح سے نقصان کو برداشت کریں گے۔

شراکت کی قسمیں:

فقہاء کے نزدیک شراکت کی کئی قسمیں ہیں جو حسب ذیل ہیں۔

۱-شراکت مِلک:

یہ وہ شراکت ہے جس میں دو یا دو سے زائد افراد کسی شے یا جائیداد میں ملکیت کے حقوق رکھتے ہوں اور ملکیت کے حقوق کی بناء پر شریک ہوئے ہوں۔ یہ شرکت دو طرح سے ہو سکتی ہے جبری شرکت یعنی جس میں انسان کا اپنا اختیار نہیں ہوتا اور وہ دوسرے کے ساتھ شریک ہوتا ہے دوسری قسم اختیاری شرکت کی ہے جس میں ایک فریق دوسرے فریق کے ساتھ اپنے اختیار اور اپنی مرضی سے شریک ہوتا ہے۔

۲-شراکت عقود:

یہ وہ شراکت ہے جس میں دو فریق ایک دوسرے کے ساتھ معاہدہ کر کے شریک ہوتے ہیں۔ فقہاء اس کی تین قسمیں بیان کرتے ہیں۔

(۱) شراکت مال (۲) شراکت ابدان (۳) شراکت وجوہ۔

پھر ان میں سے ہر ایک قسم کو پھر دو حصوں میں منقسم کیا گیا ہے۔

(۱) شرکۃ المفاوضہ (۲) شرکۃ العنان۔

۱-شراکت مال:

اس شراکت میں دو یا دو سے زائد فریق معین مال کے ساتھ منافع کمانے کی غرض

سے ایک دوسرے کے ساتھ منافع کی نسبت طے کر کے شریک ہوتے ہیں اس کی جیسا بتایا گیا ہے دو اقسام ہیں۔(۱) شرکت مفاوضہ (۲) شرکت عنان۔

شرکت مفاوضہ:

شرکت مفاوضہ میں دو یا دو سے زائد فریق مساوی بنیادوں پر ایک دوسرے کے ساتھ شراکت کرتے ہیں۔ان کی شرائط حسب ذیل ہیں۔

(۱) فریقین کا نقد سرمایہ مساوی ہو۔
(۲) ہر فریق دوسرے کا نمائندہ ہو۔
(۳) فریقین عاقل ہوں، پاگل اور ناسمجھ نہ ہوں۔
(۴) فریقین بالغ ہوں، نابالغ اور بچے نہ ہوں۔
(۵) آزاد ہوں غلام نہ ہوں۔
(۶) دونوں ایک ہی مذہب سے تعلق رکھتے ہوں۔
(۷) ہر فریق دوسرے فریق کی ذمہ داری پر اپنے معاملات اور عمل کیلئے جواب دہ ہو۔
(۸) نفع ونقصان مساوی بنیادوں پر تقسیم ہوگا۔

علماء نے لکھا ہے کہ شرکت کی ایک اختلافی شکل شرکت المفاوضہ ہے اس میں شرکاء اپنے تمام سرمایہ کے ساتھ کاروبار میں شریک ہوتے ہیں لیکن ان سرمایوں کا باہم مساوی ہونا ضروری ہے۔خسارہ کی صورت میں شرکاء کی ذمہ داری غیر محدود ہوتی ہے۔نفع کی صورت میں ہر شریک کو برابر برابر حصہ ملتا ہے۔شرکت کی اس شکل کو صرف فقہ حنفی میں صحیح قرار دیا گیا ہے۔[تفصیل کیلئے ملاحظہ ہو بدائع الصنائع ۵۶/۶، بدایۃ المجتہد لابن رشد اندلسی ۲۵۱/۲]

۲-شرکت عنان:

شرکت عنان میں دو یا دو سے زیادہ فریق ایک دوسرے کے ساتھ شراکت کا مطالبہ غیر مساوی بنیاد پر کر سکتے ہیں۔اس معاملہ میں شرکت مفاوضہ کی طرح کڑی شرطیں نہیں ہیں مثلاً

(۱) فریقین کے سرمایہ کی نسبتیں مختلف ہوسکتی ہیں۔

(۲) بچے اور بڑے، بالغ اور نابالغ کے درمیان شراکت ہوسکتی ہے۔

(۳) ان میں دونوں فریقوں کے مذہب کا یکساں ہونا ضروری نہیں، مسلمان اور کافر بھی شریک ہوسکتے ہیں۔

(۴) شراکت مال میں جائیداد کے استعمال اور تصرف کے اختیارات اور کاروبار کے معاملات میں حصہ لینے کی نسبتیں اور شرحیں مختلف ہوسکتی ہیں۔ سرمایہ کا مساوی اور یکساں ہونا ضروری نہیں۔

(۵) منافع کی تقسیم سرمایہ (Capital) کے تناسب سے نہیں بلکہ آپس میں طے شدہ شرحوں کے مطابق کی جاتی ہے۔

(۶) نقصان میں شراکت فریقین کے سرمایوں کی نسبت سے ہوگی۔

(ب) شراکت اعمال:

شراکت کی یہ قسم دو یا دو سے زیادہ فریقوں کے درمیان ہوتی ہے۔ یہ شراکت ہاتھوں سے کام کرنے والے کاریگروں کے درمیان ہوتی ہے۔ اس وجہ سے اس کو شرکۃ الصنائع بھی کہتے ہیں جیسے بڑھئی اور لوہار کے مابین یا لوہار اور لوہار کے درمیان۔

اس شرکت کی بھی دو اقسام ہیں۔

(۱) شرکت مفاوضہ (۲) شرکت عنان

(ج) شرکت الوجوہ:

اس شرکت میں دو فریق ایک دوسرے کے ساتھ شرکت کا معاملہ اس طرح کرتے ہیں کہ ان میں سرمایہ کا عمل دخل نہیں ہوتا بلکہ ایک فریق یا کمپنی اپنا اثر ورسوخ استعمال کرتی ہے اور دوسرا فریق یا فرم اپنے اثر ورسوخ کی بنیاد پر ادھار مال خرید کر اسے مارکیٹ میں نقد فروخت کرتی ہے ایسی فرم یا ادارہ کے ساتھ شراکت ''شرکۃ الوجوہ'' کہلاتی ہے۔ شوافع میں شراکت اعمال اور شراکت الوجوہ دونوں طریقہ شرکت ناجائز نہیں۔

شرکت مفاوضہ کی شرائط چونکہ بہت سخت ہیں اس لیے یہ طویل عرصہ تک جاری نہیں رہ سکتی۔ کاروباری اور تجارتی حالات تیزی سے تبدیل ہوتے ہیں اس لیے ان کے مطابق کاروبار میں بھی تبدیلیوں کی ضرورت لاحق ہوتی ہے لیکن شرکت مفاوضہ کی شرائط کے غیر لچک دار ہونے کے باعث شراکت کا یہ معاملہ ان تبدیلیوں کو قبول نہیں کرسکتا جب کہ شرکۃ العنان جو کہ تمام فقہاء کے نزدیک جائز طریقہ کاروبار ہے لیکن اس میں صرف ایک شرط پر فقہاء کا اختلاف ہے۔ کچھ فقہاء کا کہنا ہے کہ کوئی شریک دوسرے کے عمل کے بدلہ میں نقصان کی تلافی یا ازالہ کا ذمہ دار نہیں ہے۔ صاحب ہدایہ فرماتے ہیں کہ عنان کا مطلب بچنا یا پرہیز کرنا ہے اور مذکورہ بالا شرط اگر نہ ہو تو یہ مطلب پورا نہیں ہوتا جبکہ اکثر فقہاء کا قول ہے کہ عنان کے لغوی معنی جانور کی باگ اور لگام کے ہیں۔ اس لیے شرکت العنان میں تمام حصہ دار تصرف کے اختیارات رکھتے ہیں۔ اس صورت میں درج بالا شرط غیر ضروری ہو جاتی ہے۔ علاوہ ازیں شرکۃ العنان کی ایک شرط یہ ہے کہ ہر فریق دوسرے کا نمائندہ ہے۔ یہ شرط مندرجہ بالا شرط کی صورت میں پوری نہیں ہوسکتی اس لیے اوپر والی شرط ضروری اور لازمی نہیں ہے۔

یہ تو شراکت کی وہ پرانی اور قدیم اقسام ہیں جن کا ذکر فقہاء کی کتابوں میں آتا ہے لیکن آج کل شراکت کی جدید اقسام ہیں جن کا ذکر موجودہ معاشیات کی کتابوں میں ملتا ہے۔ ان میں سے مشہور مشہور حسب ذیل ہیں۔

(۱) کاروباری شراکت (Partnership)

(۲) محدود کمپنیاں (Limted Companies)

(۳) مشترکہ سرمایہ کی کمپنیاں (Joint stock Companies)

(۴) انجمن ہائے امداد باہمی (Cooperative Societies)

شراکت کے احکام:

نفع نقصان کے لحاظ سے شراکت کے مندرجہ ذیل احکام ہیں۔

۱-نفع کی تقسیم:

کاروبار میں نفع ہونے کی صورت میں وہ نفع مندرجہ ذیل امور کو پیش نظر رکھ کر فریقین میں تقسیم ہوگا۔

(۱) نفع کی تقسیم فریقین کے مابین طے شدہ نسبتوں کے حساب سے ہوگی اور ہر فریق کا حصہ فیصد یا نسبت کی صورت میں متعین کیا جائے گا اور کسی فریق کے لئے نفع میں کوئی رقم پہلے سے متعین نہیں کی جائے گی۔

(۲) نفع کی تقسیم میں فریقین کا سرمایہ، عملی شمولیت اور ذمہ داری کے پیش نظر نفع کی نسبت متعین کی جائے گی البتہ ان باتوں کو نظر انداز کر کے بھی نفع کی تقسیم کی جاسکتی ہے۔

(۳) مساوی سرمایہ کاری کے باوجود نفع کی نسبتیں مختلف ہوسکتی ہیں۔

(۴) حسابات کرتے وقت پہلے اصل سرمایہ علیحدہ کیا جائے گا۔اس کے بعد فاضل رقم کو دیکھا جائے گا۔اگر رقم بچی تو منافع اور اصل سرمایہ اگر پورا نہ ہوا تو نقصان۔

(۵) مسلسل جاری کاروبار میں نقصانات کا ازالہ آئندہ ہونے والے منافع سے کیا جاسکتا ہے۔

(۶) کاروبار کے نفع کے حق دار اور نفع کے مالک اس وقت قرار پائیں گے جب اصل سرمایہ مالکان سرمایہ کو واپس مل جائے۔ مالکان کا اپنے سرمایہ پر قبضہ عملاً بھی ہوسکتا ہے اور قانوناً بھی۔

۲-نقصان کی ذمہ داری:

یہ تو منافع کی تقسیم کا معاملہ تھا لیکن کاروبار میں نقصان کا احتمال بھی ہوسکتا ہے اور نقصان کہتے ہیں اصل سرمایہ کے ڈوب جانے والے حصہ کو۔نقصان کی ذمہ داری کے سلسلہ میں مندرجہ ذیل امور پیش نظر رکھے جائیں گے۔

(۱) فقہاء کے نزدیک نقصان ہمیشہ کاروبار میں لگے ہوئے سرمایہ کی نسبت سے تقسیم کیا

جائے گا۔ کوئی صاحب سرمایہ اپنے نسبتی حصہ کے نقصان کی ذمہ داری سے نہیں بچ سکتا۔

(۲) جس فریق نے کاروبار میں سرمایہ نہ لگایا ہو اس کو نقصان برداشت نہیں کرنا ہوگا جیسا کہ مضاربت میں ہوتا ہے۔

(۳) مسلسل ہونے والے نقصان کو آئندہ ہونے والے منافع سے بتدریج منفی کیا جاسکتا ہے اور اس طریقہ سے نقصان کا ازالہ کیا جاسکتا ہے۔

شراکت کی ذمہ داریاں اور حقوق:

(۱) ایک فریق شراکت دوسرے فریق کی اجازت سے (اجازت زبانی ہو یا تحریری لیکن تحریری بہتر ہے) دوسرے لوگوں کے ساتھ شراکت یا مضاربت کا معاملہ کرسکتا ہے تاکہ تجارت اور کاروبار کو وسعت دی جاسکے یا آسانی کے ساتھ کاروباری معاملات کو نمٹایا جاسکے۔

(۲) مشترکہ سرمایہ میں سے کوئی فرد یا افراد تمام شرکاء کی اجازت کے بغیر نہ تو قرض دے سکتے ہیں اور نہ ہی مشترکہ کاروبار کے لیے قرض لے سکتے ہیں۔

(۳) اگر دوسرے شرکاء نہ منع کریں تو ہر شریک کاروبار کو مال ادھار فروخت کرنے کی اجازت ہے۔

(۴) مشترکہ کاروباری ادارہ کی طرف سے ادھار خریدی جانے والی اشیاء اور خدمات کی قیمت ادارہ یا کمپنی کی مالیت سے زیادہ نہ ہو۔ ایسا کرنے کیلئے تمام شرکاء کی رضامندی ضروری ہے۔

(۵) شراکت میں کوئی فریق دوسرے شرکاء کی اٹھائی ہوئی مالی ذمہ داریوں کا کفیل اور ضامن نہیں ہوتا سوائے اس کے کہ تمام شرکاء کی اجازت سے ایسا کیا گیا ہو۔

شراکت کی مدت:

(۱) کوئی فریق بھی یہ پورا پورا حق رکھتا ہے کہ شراکت کے معاہدہ کو جب چاہے منسوخ

کردے۔ دو سے زیادہ افراد کی شراکت کی صورت میں دیگر فریق معاہدہ کو برقرار رکھ سکتے ہیں۔

(۲) شراکتی کاروبار ایک مقررہ مدت کیلئے بھی کیا جا سکتا ہے۔

(۳) کسی ایک شریک کاروبار کے مرنے کی صورت میں شراکت ختم ہو جاتی ہے البتہ دو سے زیادہ افراد کی شراکت کی صورت میں اسے جاری بھی رکھا جا سکتا ہے۔

شراکت کی منسوخی:

جس طرح شراکت کا معاہدہ قائم ہوتا ہے اسی طرح مندرجہ ذیل صورتوں میں شراکت کا معاہدہ منسوخ بھی ہو جاتا ہے۔

(۱) فریقین میں سے ایک فریق کاروبار میں سے علیحدگی اختیار کر لے۔

(۲) فریقین میں سے ایک کی موت واقع ہو جائے۔

(۳) ایک یا دونوں فریق شراکت ذہنی طور پر معذور ہو جائیں مثلاً بالکل پاگل ہو جائیں یا کسی حادثہ میں اپنی یادداشت کھو بیٹھیں۔

(۴) کسی ایک فریق یا فریقین کو اپنے حصہ کے قانونی استعمال سے روک دیا جائے۔

موجودہ دور میں کاروبار اکثر و بیشتر لمبے عرصہ تک چلتے ہیں اور ان کی منسوخی درج ذیل وجوہ کی بناء پر ہوتی ہے۔

(۱) حکومت کاروبار کو سرکاری ملکیت میں لے لے یعنی نیشنلائز کر لے۔

(۲) حکومت اس کاروبار کو جبراً روک دے۔

(۳) کسی عدالتی فیصلہ یا عدالتی کارروائی کی بناء پر کاروبار کو روک دیا جائے۔

(۴) کاروباری شرکاء کی اکثریت کو کاروبار کو ختم کرنا چاہے یا معاہدہ شراکت کو منسوخ کرنا چاہے۔

شراکت اور صنعتی کاروبار:

ہماری فقہ کی کتابوں میں صنعتی کاروبار کے سلسلہ میں کوئی مباحث نہیں ملتیں

کیونکہ اس زمانہ میں اتنے بڑے بڑے صنعتی یونٹس نہیں ہوتے تھے۔ یہ سارے صنعتی یونٹس صنعتی انقلاب کے بعد وجود میں آئے لیکن اسلام میں کاروبار کی ہر وہ شکل جو کسی شخص کے لیے انفرادی طور پر جائز ہے، اس میں شراکت بھی جائز ہے۔ جب عام کاروبار میں شراکت جائز ہے تو صنعتی کاروبار کی تنظیم و ترویج بھی شراکت کی بنیاد پر ہو سکتی ہے۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ

(۱) متعدد فقہائے کرام کے نزدیک صنعتی کاروبار بھی دوسری انسانی ضروریات کی طرح فرض کفایہ ہے لہٰذا جن اعمال کی انجام دہی کی ضرورت ہے اس میں اشتراک عمل ضروری نہ بھی ہو تو جائز ہے۔

(۲) موجودہ زمانے میں تجارت اور صنعتی کاروبار کیلئے بہت زیادہ سرمایہ کی ضرورت ہوتی ہے جس کی فراہمی ایک فرد کیلئے ممکن نہیں ہوتی لہٰذا سرمایہ دار لوگ آپس میں تعاون کر کے شراکت کی بنیاد پر سرمایہ حاصل کرتے ہیں۔

(۳) غیر سودی معیشت میں سرمایہ کے حصول کا ذریعہ شراکت یا مضاربت ہے۔ اس لیے بھی صنعتی یونٹس میں شراکت جائز ہے۔

اس طرح حصص کے ذریعہ کسی ایسے صنعتی کاروبار میں شراکت جائز ہے جو حرام اشیاء اور خدمات کی پیداوار اور لین دین نہیں کرتا۔ غیر سودی بینک کاری کا مضبوط ڈھانچہ شراکت اور مضاربت کی بنیاد پر استوار کیا جا سکتا ہے۔

﴿مضاربت﴾

اپنے سرمایہ کو نفع آور کاروبار اور تجارت میں لگانے کی ایک شکل مضاربت ہے۔
مضاربت کا لفظ ''ضرب'' سے مشتق ہے جس کے معنی سفر کے ہیں۔ تجارت میں عموماً سفر در پیش ہوتا ہے۔ علاوہ ازیں یہ لفظ ''ضارب فی الارض'' سے ماخوذ ہے جس سے مراد ہے زمین کے طول و عرض میں سفر کرنا ہے جس کا اطلاق مضاربت کے معاملہ میں ضارب کی رب المال کے سرمایہ کے ساتھ جدو جہد پر ہوتا ہے۔ مضاربت کے لیے دوسری اصطلاح ''قراض'' اور ''مقارضہ'' استعمال ہوتی ہے جو قراضہ سے ماخود ہے۔ قراضہ کا معنی ہے کاٹنا، مضاربت میں اس سے مراد یہ ہے کہ ایک سرمایہ دار آمدنی سے بچا بچا کر (کاٹ کاٹ کر) کچھ سرمایہ جمع کرتا ہے اور اسے کاروبار میں لگاتا ہے جب کہ ضارب منافع میں سے حصہ ''رب المال'' (صاحب سرمایہ) کو دیتا ہے۔ فقہ حنفی اور فقہ حنبلی میں ایسے کاروبار کیلئے ''مضاربت'' کی اصطلاح استعمال کی جاتی ہے جب کہ فقہ شافعی اور فقہ مالکی میں ''قراض'' کی اصطلاح استعمال ہوتی ہے۔

اس کی تعریف فقہاء کے نزدیک یہ ہے کہ مالک اپنے سرمایہ کو کسی کاروباری شخص کے سپرد کردے۔ صاحب سرمایہ صرف سرمایہ فراہم کرتا ہے اور دوسرا کاروباری فریق اس سرمایہ کے ذریعہ کاروبار چلاتا ہے۔ یہ مضاربت کی سادہ ترین شکل ہے جس میں ایک شریک صرف سرمایہ فراہم کرتا ہے جب کہ دوسرا فریق صرف کاروباری جدوجہد کرتا ہے۔

کاروبار کے اس طریقہ سے اگر کاروبار میں نفع ہوگا تو دونوں فریق اس نفع میں طے شدہ نسبتوں کے مطابق حصہ دار ہوں گے اور اگر کاروبار میں نقصان ہوگا تو اس مالی نقصان کو سرمایہ لگانے والا برداشت کرے گا۔ کاروباری فریق کو یہ نقصان ہوگا کہ اس کی جدوجہد اور سعی وکوشش بے ثمر گئی اور اسے اس کا کوئی صلہ اور فائدہ نہ ملا۔ کسی فریق کے حق میں بہر صورت کسی متعین رقم کی ادائیگی کا معاہدہ نہیں کیا جاسکتا۔ دونوں فریقوں میں سے

کوئی فریق بھی یعنی نہ سرمایہ فراہم کرنے والا اور نہ ہی کاروباری جدوجہد کرنے والا یہ شرط پیش کرسکتا ہے کہ نفع ہو یا نقصان اسے ایک متعین رقم ضرور ملنی چاہیے۔ فقہاء نے اس بات کی تصریح کی ہے کہ سرمایہ فراہم کرنے والا فریق نقصان کی ذمہ داری کسی صورت بھی کاروباری فریق کے سر نہیں ڈال سکتا۔ وہ یہ بات ہرگز نہیں کہہ سکتا کہ نقصان کی صورت میں بھی اسے اس کا اصل سرمایہ واپس ملنا چاہیے۔ کاروبار میں نقصان کے باعث اگر پورا سرمایہ بھی ڈوب جائے تو اس کی یا اس کے کسی حصہ کی ادائیگی کاروباری فریق کے ذمہ نہ ہوگی۔ [بدائع الصنائع: ۶/۷۷] البتہ نفع کی تقسیم کے لیے دونوں فریق باہمی رضامندی سے جو شرح اور تناسب بھی طے کریں وہ جائز ہے۔

کاروباری جدوجہد کرنے والا شخص تو ہر لحاظ سے نفع حاصل کرنے کا مستحق ہے لیکن جو فریق کاروباری جدوجہد نہیں کرتا اور نہ ہی وہ کاروباری فیصلوں اور ان کے نفاذ میں حصہ لیتا ہے اس کو نفع اس کے سرمایہ کا ملتا ہے کیونکہ کاروبار شروع کرنے، کاروباری فیصلوں کو نافذ کرنے، تیار کیے جانے والے مال کے لیے پیداواری خدمات اور خام مال مہیا کرنے اور کاروباری عمل کو جاری رکھنے کے لیے یہ نہایت ضروری ہے کہ سرمایہ موجود ہو تاکہ کاروباری جدوجہد کرنے والا فریق اس سرمایہ کی مدد سے اپنے فیصلوں کو عملی جامہ پہنا سکے، کیونکہ بغیر سرمایہ کے کاروباری فریق نہ کوئی فیصلہ کرسکتا ہے اور نہ ہی کوئی کاروباری اسکیمیں بنا سکتا ہے اور نہ ہی ان اسکیموں کو عملی جامہ پہنا سکتا ہے۔ یہ سب کچھ سرمایہ کی بدولت ہوتا ہے۔ چنانچہ سرمایہ دار نے کاروباری فرد کو سرمایہ فراہم کیا اور سرمایہ پر وارد ہونے والے تمام خطرات کو خود برداشت کرنے کا ذمہ لیا۔ عدم تیقن کی فضاء میں کاروباری فرد جو فیصلے بھی کرتا اس کے نتیجہ میں نفع اور نقصان دونوں کا احتمال اور امکان تھا۔ اپنے سرمایہ کو کاروباری فرد کے فیصلوں کے تابع بنا کر اور نقصان کی ذمہ داری سے کاروباری فریق کو بری قرار دے کر سرمایہ فراہم کرنے والے نے عدم تیقن کی فضا میں کاروبار میں ایک اہم حصہ لیا لہٰذا انصاف کا تقاضا یہ ہے کہ جب کاروبار میں نفع ہو تو اس کا فیض سرمایہ دار کو بھی پہنچے کیونکہ اس نے اپنے سرمایہ سے کاروباری عمل میں ایک زبردست حصہ لیا اور نقصان کی ذمہ داری

بھی قبول کی۔

مضاربت کی اہمیت احادیث سے:

احادیث میں مضاربت کو پسند کیا گیا ہے اور اس کے بارہ کتابوں میں بہت سی احادیث منقول ہیں جن میں سے چند ایک حسب ذیل ہیں۔

(۱) سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے نبوت کے اعلان سے قبل سیدہ خدیجہ سلام اللہ علیہا کے مال کے ساتھ مضاربت کے تحت تجارت کی جس کا ذکر ہم نے گزشتہ صفحات میں کیا ہے۔[المبسوط]

(۲) سیدنا عباس رضی اللہ عنہ مخصوص شرائط کے ساتھ مضاربت پر کاروبار کرتے تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو جب اس کا علم ہوا تو آپ نے پسندیدگی کا اظہار فرمایا۔[المبسوط]

(۳) سیدنا حکیم بن حزام رضی اللہ عنہ انہی شرائط کے ساتھ مضاربت کرتے تھے۔

(۴) سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے کہ مضاربت میں برکت ہے۔

(۵) سیدنا عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ بھی مضاربت کیا کرتے تھے۔[المبسوط]

(۶) سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے فرید بن خلیدہ کے ساتھ مضاربت کی۔

(۷) سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے بیت المال سے بھی مضاربت کے اصولوں پر کاروبار کے لیے رقم دی۔

(۸) سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کے دو صاحبزادے عبداللہؓ اور عبیداللہؓ فوجی خدمات کے سلسلہ میں عراق گئے۔ واپسی پر بصرہ کے گورنر سیدنا ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ نے انہیں کچھ رقم دی جو مدینہ پہنچ کر امیر المومنین رضی اللہ عنہ کے حوالے کرنی تھی۔ اس رقم سے سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کے صاحبزادوں نے مال تجارت خریدا اور مدینہ طیبہ پہنچ کر نفع پر فروخت کر دیا اور اصل رقم سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کے پاس جمع کروادی۔ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے پوچھا: ''کیا اسی طرح تمام سپاہیوں کو رقم دی گئی تھی یا صرف تمہیں دی گئی کیوں کہ تم خلیفہ کے بیٹے تھے؟'' انہوں نے کہا صرف ہمیں دی گئی۔ آپ نے ان کو تمام رقم نفع سمیت بیت

المال میں جمع کروانے کا حکم دیا۔ سیدنا عبید اللہ رضی اللہ عنہ نے کہا کہ اگر یہ رقم ان سے گم ہو جاتی تو پھر انہیں تمام رقم بیت المال میں جمع کروانا پڑتی؟ وہیں پر موجود ایک شخص نے کہا کہ یہ مضاربت کی شکل ہے۔ اس لیے نصف نفع بیت المال میں جمع ہو اور نصف دونوں مضارب کو دیا جائے۔ اس کو سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے قبول فرمالیا۔

عقلی طور پر بھی مضاربت کا جواز نکلتا ہے تا کہ اہم انسانی مصالح کا تحفظ کیا جاسکے۔ دنیا میں اکثر ایسا ہوتا ہے کہ ایک شخص کے پاس سرمایہ تو ہوتا ہے لیکن کاروبار میں اسے کوئی تجربہ نہیں ہوتا یا ذہنی اور جسمانی کمزوری کی وجہ سے وہ کاروباری دوڑ دھوپ اور جدوجہد نہیں کرسکتا۔ اس صورت میں اپنی روزی کمانے کے لیے یا سرمایہ سے نفع حاصل کرنے کے لیے اسے مضاربت کا سہارا لینا پڑتا ہے اور یہ سرمایہ انفرادی اور ملکی معیشت کے بہاؤ کے لیے بنیاد فراہم کرتا ہے۔ موجودہ زمانے میں بینکوں کی وجہ سے سود کی لعنت زندگی کے ہر شعبہ میں پھیلی ہوئی ہے۔ کاروباری لوگ اپنے کاروبار کو بڑھانے کے لیے اور وہ لوگ جن میں کاروبار کی صلاحیت ہوتی ہے لیکن سرمایہ نہیں ہوتا، اکثر و بیشتر آج کل بینکوں کا رخ کرتے ہیں تا کہ انہیں وہاں سے سود پر رقم اور سرمایہ مل جائے اور سود نظام معیشت کے لیے ایک کینسر ہے جو غریبوں کو کھا کر امیروں کی تجوریاں بھر دیتا ہے۔ مضاربت کو اس بینک کاری کے متبادل اساس کے طور پر اختیار کر کے معاشرہ کو سود کی لعنت سے پاک کیا جاسکتا ہے۔ چنانچہ بڑے پیمانے پر کام کرنے والی کمپنیاں بجائے بینکوں کی طرف رجوع کرنے کے اپنے مالی وسائل کی کمی مضاربت کی بنیاد پر پوری کرتی ہے۔ معاشرہ میں ایسے لوگوں کی ایک بہت بڑی تعداد موجود ہے جو مالی وسائل تو دیکھتے ہیں لیکن کاروباری صلاحیت اور اہلیت ان میں موجود نہیں ہوتی، لہٰذا وہ کوئی نفع بخش کام نہیں کر سکتے۔ مضاربت کے ذریعہ ان کے ان مالی وسائل کو متحرک کرنے اور فروغ معیشت کے لیے کارآمد اور کامیاب بنایا جاسکتا ہے جس سے ان کی باوقار روزی اور آمدنی کا بندوبست کیا جاسکتا ہے۔ حکومت بھی اپنے بعض منصوبوں کو پایہ تکمیل تک پہنچانے کے لیے مضاربت کی بنیاد پر سرمایہ حاصل کرسکتی ہے لیکن ہم نے یہ قسم اٹھا رکھی ہے کہ ہر غیر اسلامی کام کو پروان چڑھانا ہے اور کسی

صورت بھی اپنے مسائل کو دین کی بنیاد پر حل نہیں کرنا۔ عدالت نے سود کو بند کیا تھا لیکن ہم نے اپیل کروا کر سپریم کورٹ سے اس فیصلہ کو ختم کرا دیا اور اب کم از کم نصف صدی تک کوئی امید نہیں کہ کوئی ایسی حکومت آئے جو سود کو سرکاری طور پر حرام قرار دے۔

مضاربت کے احکام:

سرمایہ دار ایک مضارب کے ساتھ مل کر جو مال حوالے کرتا ہے شریعت میں اس کے کچھ احکام ہیں۔

(۱) مضارب کو مال حوالہ کیے جانے کے بعد کاروبار شروع کرنے سے پہلے تک اس سرمایہ کی حیثیت امانت کی ہے اور امانت کی حفاظت مضارب کی ذمہ داری ہے اور جب صاحب سرمایہ اس رقم کو واپس مانگے تو اس کی واپسی بھی مضارب کی ذمہ داری ہے البتہ مال ضائع ہو جانے کی صورت میں مضارب پر ضمان، جرمانہ نہیں ہوگا۔

(۲) کاروبار شروع کیے جانے کے بعد مضارب کی حیثیت صاحب سرمایہ کے وکیل کی ہو جاتی ہے۔

(۳) کاروبار میں منافع ہونے کی صورت میں مضارب کی حیثیت مالیاتی معاہدہ کے شریک کی ہو جاتی ہے اور ہر شریک کاروبار کو معینہ اور طے شدہ نسبت سے منافع کی تقسیم کی جائے گی۔

(۴) اگر کسی سے معاہدہ مضاربت منسوخ ہو جائے تو اس صورت میں یہ معاہدہ مضاربت نہیں بلکہ معاہدہ روزگار کی شکل اختیار کرے گا اور مضارب کی حیثیت ملازم کی ہو جائے گی۔ نفع یا نقصان صاحب سرمایہ کا ہوگا جبکہ مضارب کو اس کی اجرت ملے گی۔

(۵) اگر مضارب معاہدہ مضاربت کی شروط میں سے کسی شرط کو تسلیم نہ کرے تو اس کی حیثیت غاصب کی ہوگی اور اس پر اصل سرمایہ کی واپسی کی ذمہ داری ہوگی۔

(۶) اگر معاہدہ مضاربت کی ایک شرط یہ ہو کہ سارے کا سارا منافع مضارب کو ملے گا تو یہ معاہدہ مضاربت نہیں بلکہ مضارب کی حیثیت مقروض کی ہوگی۔ اور یہ معاملہ قرض کا معاملہ ہوگا نفع نقصان کی ذمہ داری اس کی اپنی ہوگی اور سرمایہ کے ضیاع اور ہلاکت کی صورت میں سرمایہ کی صاحب سرمایہ کو واپسی اس کی ذمہ داری ہوگی۔

(۷) اگر شرط یہ ہو کہ سارے کا سارا منافع مالک کا ہوگا تو یہ معاملہ عقد البضاعہ کا ہوگا۔

ارکان مضاربت:

مضاربت کے ارکان دو ہیں۔

(۱) ایجاب (۲) قبول

اس کے لیے الفاظ کی ضرورت ہے جو جانبین کے معاہدہ مضاربت پر رضامندی کو ظاہر کریں مثلاً ایک فریق کہتا ہے کہ یہ مال لو اور اس سے مضاربت کرو یا میرا یہ مال مضاربت کیلئے لو، اس پر جو فائدہ اور نفع ہوگا وہ ہم آدھا آدھا یا جس نسبت سے طے ہو تقسیم کرلیں گے اور جواب میں مضارب کہے کہ میں نے یہ سرمایہ لے لیا یا میں اس معاہدہ پر راضی ہوں یا میں نے تمہاری یہ پیشکش قبول کی۔

مضاربت کی شرائط:

مضاربت کے معاہدہ کی فقہاء نے کچھ شرائط لکھی ہیں جن میں سے اہم حسب ذیل ہیں۔

(۱) سرمایہ نقدی یا سونے، چاندی کی صورت میں ہونا چاہیے۔ مال تجارت کے ساتھ مضاربت جائز نہیں۔ نقدی یا سونا چاندی ضروری ہے۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ عروض التجارۃ (یعنی مال تجارت) کی قیمتوں میں کمی بیشی ہوتی رہتی ہے جس کی وجہ سے قدر سرمایہ اور منافع کی مقدار بھی تبدیل ہو جاتی ہے جیسے ایک شخص کہتا ہے کہ یہ کپاس یا کپڑا ایک ہزار روپے کا ہے یہ کپڑا لو اور اسے مضاربت کی بناء پر فروخت کرو۔ یہ معاملہ درست نہیں ہے البتہ اگر مضارب سے کہا جائے کہ یہ مال تجارت لو

اور اس کی فروخت سے جو سرمایہ حاصل ہو اس کے ساتھ مجھ سے مضاربت کرو تو فقہائے احناف کے نزدیک یہ جائز ہے۔

(۲) معاہدہ مضاربت کے وقت سرمایہ معلوم ہونا ضروری ہے تاکہ بعد میں کسی قسم کا تنازع پیدا نہ ہو۔

(۳) معاہدہ مضاربت کے وقت صاحب سرمایہ کے پاس سرمایہ کا موجود ہونا ضروری ہے۔ مضارب پر اگر قرض ہو تو اس کی بنیاد پر مضاربت کا معاہدہ نہیں ہوسکتا البتہ اگر مضارب کو کسی اور شخص سے قرض وصول کرنے اور اس کے بعد کاروبار شروع کرنے کے لیے کہا جائے تو اس صورت میں مضارب صاحب سرمایہ کا نمائندہ ہوگا۔

(۴) معاہدہ کے وقت سرمایہ مضارب کے حوالے کیا جائے تاکہ وہ اس میں تصرف کرسکے۔ اگر یہ کہا جائے کہ سرمایہ کار مضارب کے ساتھ حصہ لے گا تو وہ معاہدہ فاسد (منسوخ) ہو جائے گا۔

(۵) متوقع منافع میں سے مضارب کا حصہ (فیصد یا تناسب کے لحاظ سے) معلوم ہونا چاہیے۔ مثلاً نصف یا ایک تہائی وغیرہ اگر یہ کہا جائے کہ اس سرمایہ سے کاروبار کرو اور منافع میں سے تمہیں دو ہزار ملے گا تو مضاربت کا معاملہ فاسد ہو جائے گا۔ اسی طرح یہ کہنا کہ نصف اور اس کے علاوہ ایک ہزار تو یہ صورت بھی درست نہیں۔

(۶) مضارب کا حصہ نفع میں سے طے کیا جائے گا۔ رأس المال یعنی اصل سرمایہ میں سے نہیں مثلاً اگر یہ کہا جائے کہ نصف مال تمہارا اور منافع سے بھی اتنا اور اتنا حصہ تو یہ درست نہیں۔ اسی طرح یہ شرط بھی درست نہیں کہ مضارب کو نصف یا تیسرا حصہ نفع کے علاوہ ماہانہ تنخواہ بھی ملے گی۔ یہ شرط باطل ہے جبکہ معاہدہ درست ہے مضارب صرف نفع میں سے حصہ کا مالک ہے لیکن اگر شرط یہ ہو کہ مضارب کو رہنے کو مکان یا زراعت کیلئے زمین بھی دی جائے گی تو معاہدہ فاسد ہوگا۔

(۷) اگر مضارب کے پاس سرمایہ کاری کا مال یا مالی ذرائع بطور رہن موجود ہوں اور

صاحب سرمایہ نے مضارب سے قرض لے رکھا ہو تو ایسے سرمایہ پر مضاربت درست نہیں۔

مضارب کے حقوق:

اسلام میں جس طرح صاحب سرمایہ کے حقوق ہیں اسی طرح مضارب کے بھی حقوق اور فرائض ہیں جن میں سے چند ایک حسب ذیل ہیں۔

(۱) مضارب کیلئے ضروری ہے کہ معاہدہ کی تمام شقوں اور شرائط کی پابندی کرے۔

(۲) مضارب کسی دوسرے شخص کے ساتھ بھی مضاربت کا معاملہ کرسکتا ہے مگر یہ کہ اس کو ایسا کرنے سے روک دیا جائے۔

(۳) کوئی تیسرا شخص مضارب کی بلا معاوضہ مدد کرسکتا ہے تا کہ وہ کاروبار کو بہتر طور پر چلا سکے۔

(۴) اکثر فقہاء کا کہنا ہے کہ صاحب سرمایہ مضارب کے ساتھ کاروبار میں عملی حصہ نہیں لے سکتا کیونکہ اس سے مضارب کے اختیارات محدود ہو جاتے ہیں اور وہ کھل کر کام نہیں کرسکتا جبکہ بعض شوافع اس بات کی اجازت دیتے ہیں کہ صاحب سرمایہ مضاربت میں عملی حصہ بھی لے سکتا ہے۔ دور جدید کے بڑے پیمانے کے کاروبار میں جن میں فیصلوں کا اختیار فرد واحد کے بجائے ایک بورڈ آف ڈائریکٹر کے پاس ہوتا ہے صاحب سرمایہ کا مضاربت کے کاروبار میں عملی شرکت کرنا جائز ہے۔

(۵) مضاربت کے معاہدہ میں مضارب کی طرف سے سرمایہ کی بحفاظت واپسی کی ضمانت دینے سے مضاربت کا معاہدہ منسوخ ہو جاتا ہے البتہ مضارب کی طرف سے پوری ذمہ داری سے کام کرنے کی ضمانت لی جاسکتی ہے۔

(۶) مضارب کو اس بات کا اختیار حاصل ہے کہ وہ کاروباری خرید وفروخت کرسکتا ہے اشیاء وغیرہ کو اپنے قبضہ میں رکھ سکتا ہے کسی فرد کے ساتھ رہن کا معاملہ کرسکتا ہے مگر یہ کہ اس کو ایسا کرنے سے روک دیا جائے۔

(۷) مضارب کو یہ اختیار حاصل ہے کہ وہ صاحب سرمایہ کے سرمایہ سے کسی دوسرے فرد کے ساتھ مضاربت کا معاملہ کر سکتا ہے مگر یہ کہ اسے ایسا کرنے سے روک دیا جائے۔

(۸) مضاربت کے معاہدہ میں صاحب سرمایہ کی مالی ذمہ داری اس کے فراہم کردہ سرمائے کی حد تک محدود ہوتی ہے مگر یہ کہ اس نے مضارب کو قرض لینے یا ادھار خریدنے کی اجازت دی ہو۔

(۹) مضارب کاروبار میں ادھار بھی فروخت کرنے کا اختیار رکھتا ہے مگر یہ کہ اس کو صاحب سرمایہ روک دے۔

معاہدہ مضاربت کی مدت:

مضاربت کے معاہدہ کی مدت کے بارہ میں مندرجہ ذیل باتیں ذہن میں رکھیں۔

(۱) صاحب سرمایہ یا مضارب دونوں میں سے کوئی فریق یا دونوں جب چاہیں معاہدہ منسوخ کر سکتے ہیں۔ اگر معاہدہ میں دو سے زائد افراد ہیں تو ان میں معاہدہ برقرار رکھا جا سکتا ہے۔

(۲) مضاربت کا معاہدہ ایک خاص عرصہ کے لیے بھی کیا جا سکتا ہے اور لامحدود مدت کے لیے بھی۔

(۳) معاہدہ مضاربت کسی ایک فریق کی موت سے ختم ہو جاتا ہے البتہ دو سے زائد افراد کی صورت میں معاہدہ کو باقی فریق جاری رکھ سکتے ہیں۔

(۴) معاہدہ مضاربت پہلے سے طے شدہ شرائط پر مسلسل جاری رکھا جا سکتا ہے۔ مثال کے طور پر مضاربت کا معاملہ ایک معین عرصہ کے لیے کیا گیا اور جو کام شروع کیا گیا وہ مقررہ مدت سے قبل ہی ختم ہو گیا۔ اس صورت میں مضارب سرمایہ کو بقیہ عرصہ کیلئے دوسرے کاروبار میں لگا سکتا ہے البتہ اس صورت میں نفع نقصان کے حوالہ سے فقہاء میں کچھ اختلاف رائے ہے۔

مضاربت میں نفع ونقصان:

مضاربت میں نفع ونقصان کے احکام کچھ یوں ہیں:

(۱) شراکت میں نقصان سرمایہ کے تناسب سے سرمایہ کے مالکان کو برداشت کرنا ہوتا ہے چونکہ مضاربت میں سرمایہ ایک فریق کا ہوتا ہے اور عملی جدوجہد دوسرے فریق کی ہوتی ہے لہٰذا نقصان کی ذمہ داری بھی اسی صاحب سرمایہ پر ہوتی ہے یعنی کاروبار میں جو بھی نقصان ہوگا وہ صاحب سرمایہ کو پورا کرنا ہوگا۔

(۲) نفع کی تقسیم مضاربت کے معاہدہ میں طے شدہ نسبتوں سے ہوگی۔ کسی بھی فریق کے لیے کوئی متعین رقم پیشگی طے نہیں کی جاسکتی۔

(۳) حنفی فقہ کے مطابق سرمایہ صاحب سرمایہ کے حوالہ کرنے سے پہلے منافع کی تقسیم درست نہیں ہے۔

(۴) مسلسل کاروبار میں نقصانات کی تلافی نفع سے کی جاتی رہے گی یہاں تک کہ کاروبار ختم کر کے حسابات کر لیے جائیں۔

(۵) فریقین کے نفع ونقصان کی مقداروں کی تعیین کاروبار ختم ہونے پر ہی کی جائے گی۔

(٦) کاروبار میں نفع کے حق دار اور نفع کے مالک اس وقت قرار پائیں گے جب اصل سرمایہ صاحب سرمایہ کو واپس مل جائے خواہ اپنے سرمایہ پر اس کا قبضہ عملاً ہو یا قانوناً جیسے اگر ایک فرد کسی بینک کے ساتھ مضاربت کا معاہدہ کرے تو اس معاہدہ کے اختتام اور نفع کی تقسیم کے لیے کافی ہوگا کہ اصل سرمایہ اس فرد کے کھاتے میں جمع کر دیا جائے۔ یہ قانونی قبضہ ہے۔

(۷) نفع سرمایہ میں اضافہ کا باعث ہوگا۔ حقیقی منافع نہ ہونے کی صورت میں مضارب کی محنت کا ازالہ ضروری ہے۔

(۸) کاروبار میں کسی قسم کے اختیارات کا حصول یا مختلف تصرفات اور معاہدات کی اجازت یا کسی قسم کی پابندیاں باہمی رضامندی سے عائد کی جاسکتی ہیں۔

موجودہ دور میں مضاربت:

موجودہ دور میں بینک کاری اور سرمایہ کاری کے اداروں کے معاملات نہایت پیچیدہ صورت اختیار کر گئے ہیں ان اداروں کے طریقہ کار اور سرمایہ کاری اکثر و بیشتر اسلامی تعلیمات کے خلاف ہیں بلکہ سود جیسی لعنت میں مبتلا ہیں جس پر اللہ اور اس کے رسول ﷺ نے جنگ کا الٹی میٹم دیا ہے۔ اس وجہ سے مسلم مفکرین اور ماہرین معاشیات اس بات کے لیے کوشاں ہیں کہ ان اداروں کی تشکیل اسلامی تعلیمات کے مطابق کی جائے۔ ان کی یہ کوشش نظام بینک کاری کی اصلاح تک محدود نہیں بلکہ ہر اس ادارے کے لیے کوششیں جاری ہیں جو لوگوں کی بچتوں (Savings) کو کاروباری مقاصد کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ اس طرح کے اداروں میں سرمایہ کاری کے لیے مالی وسائل کے حصول اور کام کے حوالے سے انہیں دو اقسام میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔

مشترکہ مالی وسائل رکھنے والے اداروں میں مضاربت کے اصولوں پر کاروبار مندرجہ ذیل طریقوں سے کیا جا سکتا ہے۔

(ا) ایسے کاروبار میں مضارب ایک سے زیادہ سرمایہ کاروں سے سرمایہ وصول کر سکتا ہے۔ تمام فقہاء مضاربت میں اس قسم کے مشترکہ کاروبار کی اجازت دیتے ہیں۔ اس مقصد کے لیے سرمایہ کے حصول کے دو طریقے جائز ہیں۔

(۱) سرمایہ کاری کے لیے سرمایہ کا حصول کاروبار شروع کرنے سے پہلے کیا جاتا ہے۔

(۲) پہلے سے موجود رقم سے سرمایہ کاری شروع کی جائے اور اس کے بعد سرمایہ حاصل کیا جائے۔

البتہ مضارب کے لیے ضروری ہے کہ جن جن افراد یا اداروں سے اس نے سرمایہ حاصل کیا ہے ان سب کی اجازت سے مشترکہ کاروبار میں اسے لگائے اور دوسرے یہ کہ سرمایہ کاری مناسب طریقے سے کرے۔

(ب) مضاربت میں دوسری صورت پہلے سے جاری مضاربت کے کاروبار کو مسلسل

جاری رکھنے کی ہے کہ اگر پہلے ایک کاروبار ایک خاص مدت کے لیے شروع کیا جائے اور وقت مقررہ کے بعد انہی شرائط پر اس کو جاری رکھا جائے۔

مندرجہ بالا طریقہ کار کے مطابق کوئی فرد یا افراد اپنا سرمایہ کسی کمپنی یا ادارہ وغیرہ کو مہیا کرتا ہے تا کہ وہ اس سے سرمایہ کاری کر سکے یہ بھی مضاربت کا معاملہ کہلائے گا۔ اس مقصد کے لیے مالیاتی ادارے عام سرمایہ کاری کے سرٹیفکیٹ یا خصوصی سرمایہ کاری کے سرٹیفکیٹ جاری کر کے ان کے ذریعہ مالی وسائل حاصل کر سکتے ہیں۔

اس طرح شراکت کی بنیاد پر کاروبار کا طریقہ یہ ہے کہ یا تو مالی وسائل جمع کرنے والی کمپنی خود سرمایہ کاری کرتی ہے یا پھر کسی دوسری کمپنی کے ذریعہ سرمایہ کاری کرتی ہے۔ اسی طرح سے بینکوں کا کاروبار ہے بینک طلبی امانتوں کے علاوہ مختلف قسم کی خدمات فراہم کرتے ہیں۔ اس طرح بینکوں کا کام فنانس کمپنیوں سے مماثلت رکھتا ہے۔ بینک حصص کی فروخت اور سرمایہ کاری کے کھاتوں سے سرمایہ حاصل کرتے ہیں اور مزید سرمایہ کے حصول کے لیے بینک سٹرٹفکیٹ جاری کر سکتے ہیں۔ بینک اور اس کے سرمایہ کو اسٹاک کی خریداری اور براہ راست سرمایہ کاری اور سرمایہ کاری کے سٹرٹفکیٹ خریداری کے لیے استعمال کر سکتے ہیں۔

مضاربت کی اس ساری بحث کا خلاصہ یہ ہے کہ مضاربت ہر لحاظ سے جائز ہے کیونکہ ہر سرمایہ کار کاروباری صلاحیتوں کا حامل نہیں ہوتا اور ہر کاروباری صلاحیتوں کا حامل شخص صاحب سرمایہ نہیں ہوتا لہٰذا معاشرتی اور سماجی مصالح کے پیش نظر ایسی راہیں تلاش کرنی ضروری ہیں کہ کاروباری جدوجہد کرنے والے اشخاص کو سرمایہ مل سکے اور سرمایہ رکھنے والے افراد کاروباری افراد کا صحیح تعاون حاصل کر سکیں۔ مضاربت کا اصول اسی تقاضا کی تکمیل کرتا ہے۔ [اسلامی معاشیات: ۱۶۱-۱۷۰ وغیرہ]

مضاربت تجارتی کاروبار سے آشنا لوگوں کی امداد اور ان کو فائدہ پہنچانے کے لیے ہے ہر مال دار اور سرمایہ رکھنے والے شخص کو اپنے مال کا ایک حصہ مضاربت کے لیے مخصوص کرنا چاہیے۔ یہ دراصل اقتصادی نقطہ نظر سے سمجھدار غریبوں اور کاروباری ضرورت مندوں کی ایک ایسی امداد ہے جو غیور اور حوصلہ مند افراد کے لیے نہ صرف قابل عمل ہے بلکہ

باعث تسکین بھی ہے چنانحہ حکیم الامت حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی قدس سرہ نے بھی اس کو امداد باہمی میں شمار کیا ہے، فرماتے ہیں،

''امداد باہمی کی چند اقسام ہیں ان میں ایک ''مضاربت'' ہے اور وہ یہ ہے کہ مال ایک شخص کا ہو اور محنت دوسرے فرد کی اور طرفین کی رضامندی کے ساتھ نفع دونوں کے درمیان ہو۔'' [حجۃ اللہ البالغہ:۲/۱۱۶]

مضاربت کے اس طریقے سے سرمایہ دار کا سرمایہ ''لعنت'' سے ''رحمت'' بن جائے گا اور معاشرہ میں نہ فاقہ کش نظر آئیں گے اور نہ قابل نفرت سرمایہ دار، اور تجارت دن دگنی رات چوگنی ترقی کرتی چلی جائے گی اور معاشرہ روز بروز معاشی اور تجارتی ترقی کی منزلیں طے کرتا چلا جائے گا اور جب ہر آدمی کے منہ میں بآسانی نوالہ پہنچے گا تو پیٹ اور ذہن کی حرام کاریاں ختم ہو جائیں گی۔

اسلامی معیشت وتجارت کے رہنما اصول

پیشتر اس کے کہ ہم اسلامی نظام معیشت وتجارت پر بحث کریں مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اسلام کے معاش سے متعلق راہ نما اصولوں کا ایک اجمالی خاکہ پیش کر دیا جائے۔

۱- مالک الملک حق تعالیٰ شانہ ہے:

اسلام کے معاشی اور تجارتی اصولوں کی بنیاد اس تصور پر ہے کہ زمین اور اس کی ساری اشیاء اللہ تعالیٰ کی ملک ہیں۔ جائیداد منقولہ وغیر منقولہ کا حقیقی مالک صرف اللہ تعالیٰ ہے۔ انسان کے ہاتھ میں ساری دولت اور سارا مال ومنال امتحان اور آزمائش کے سلسلہ کی ایک کڑی ہے جس کے ذریعہ اللہ تعالیٰ اپنی مخلوق کی آزمائش کرتا ہے کہ کون اچھے مقصد اور صحیح اصول کے مطابق اس کو صرف کرتا، تقسیم کرتا اور اس کی پیداوار کو بڑھاتا ہے۔ اجیر ہو یا مستاجر، مزدور ہو یا مل مالک، کارخانہ دار ہو یا دکان دار ہر ایک کے پاس جو کچھ ہے یا ہر ایک کے ذمہ جو کام دیا گیا ہے اس میں اسے اس طرح تصرف کرنا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ خوش ہو، اس کی مخلوق امن اور چین سے زندگی بسر کرے اور دنیا اور آخرت دونوں جگہ ان کی محنتوں کا اچھا ثمرہ ہاتھ آئے یہ تصور اسلامی اقتصادیات کا سنگ بنیاد ہے۔

۲- ہر شخص کو اکتساب رزق کے مواقع میسر ہیں:

اس کے بعد اسلام ہر شخص کے لیے جدوجہد کا مساوی حق تسلیم کرتا ہے اس کے لیے مساوی مواقع کا اعلان کرتا ہے اور ان مساوی مواقع کی اپنی پوری سیاسی طاقت سے حفاظت کرتا ہے۔ چنانچہ جو لوگ ان حقوق کو استعمال کر کے زمین کی کسی شے کو کارآمد بناتے ہیں چاہے وہ کھیتی ہو، اسلام اس پر ان لوگوں کا حق تصرف تسلیم کرتا ہے اور ان کو ان کا مالک قرار دیتا ہے۔ اس طرح اسلام میں ایک انسان کے مقابلہ میں دوسرے انسان کو صرف اصطلاح کے مطابق ''حق ملکیت'' حاصل ہوتا ہے۔ اسلام ایک شخص کو جو محنت کر کے کچھ

دولت کماتا ہے اس دولت کا جائز مالک قرار دیتا ہے لیکن چونکہ ساتھ ہی وہ اللہ تعالیٰ کے مالک الملک ہونے کا نظریہ بھی پیش کرتا ہے اس لیے اسے اپنی ملکیت میں اپنی مرضی سے تصرف کا حق نہیں دیتا بلکہ جائز اور ناجائز، مفید اور نقصان دہ اور حلال اور حرام کی قید لگا کر دولت کمانے کے متعدد ذرائع پر پابندی لگا دیتا ہے۔ دولت کو قابو میں رکھتا ہے اور چاہتا ہے کہ دولت صرف ایسے کاموں میں اور اس طرح صرف ہو کہ وہ مفید اور پیدا آور (Productive) بن جائے۔ غیر بار آور کاموں میں دولت کا صرف اسلام کے نزدیک اس کی تباہی کے مترادف ہے۔ ایک حدیث میں ہے کہ قیامت کے روز کوئی شخص اپنی جگہ سے ہل نہیں سکے گا جب تک اللہ تعالیٰ کو پانچ سوالوں کا جواب نہ دے لے۔ ان میں سے دو سوال مال کے بارہ میں ہیں کہ

﴿من این اکتسبه وفیما انفقه﴾ [ترمذی]

''کہ یہ مال اس نے کہاں سے کمایا اور کہاں خرچ کیا۔''

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ اسلام نے مال کے کمانے اور خرچ کرنے دونوں پر پابندی لگا دی ہے۔ نہ کوئی فرد اپنی مرضی کے مطابق مال کما سکتا ہے اور نہ ہی خرچ کرسکتا ہے۔ یہ ایک بنیادی فرق ہے اسلامی معیشت میں اور غیر اسلامی معیشت میں۔ ہر غیر اسلامی نظام معیشت میں خواہ وہ اشتراکی نظام معیشت ہو یا سرمایہ دارانہ نظام معیشت ہو کسی فرد کے مال کمانے پر کوئی پابندی نہیں یہاں تک عورت اگر اپنی عصمت فروخت کر کے بھی مال کماتی ہے تو وہ مال اس کی ملکیت میں ہو جاتا ہے جب کوئی جائز یا ناجائز طریقہ سے مال کماتا ہے تو اب اس کو خرچ کرنے کی بھی پوری پوری آزادی ہے۔ چاہے تو نائٹ کلب میں اس مال کو خرچ کرے یا کسی اور ناجائز اور اخلاق باختگی کے طریقے سے اس کو صرف کرے کوئی اس کو روکنے والا نہیں لیکن اس کے برعکس اسلام نے مال کے کمانے پر بھی مختلف پابندیاں لگائیں کہ وہ بلیک مارکیٹ سے مال نہیں کما سکتا۔ منشیات فروخت کر کے مال حاصل نہیں کرسکتا کیونکہ اس سے قوم کی عملی صفات تباہ و برباد ہوتی ہیں۔ قوم نشہ کی عادی ہو کر تباہی و بربادی کے دہانہ پر پہنچ جاتی ہے اور جب کوئی فرد اسلام میں جائز طریقے سے مال کمائے تو پھر اس

کے خرچ پر بھی اسلام نے مختلف قدغنیں اور پابندیاں لگائی ہیں لہذا کوئی شخص کسی ایسے کام میں مال خرچ نہیں کرسکتا جس سے قوم کے اخلاق برباد ہوں یا قوم میں کاہلی وسستی پیدا ہو۔ چنانچہ ہر اس طریقہ کو بھی اسلام نے ناجائز قرار دیا جس سے احتکار اور اکتناز پیدا ہو۔ اسلام کا مطالبہ یہ ہے کہ "اجملوا فی الطلب" کہ طلب میں اجمال اختیار کرو یعنی صرف مال کمانے کی مشین نہ بن جاؤ بلکہ اتنا کماؤ جس سے تمہاری حاجتیں اور ضرورتیں پوری ہو جائیں۔ یہ نہ ہو کہ فورڈ کمپنی، پیپسی کولا اور دوسری بڑی بڑی نیشنل اور انٹرنیشنل اور ملٹی نیشنل کمپنیوں کے مالکان کی طرح ارب پتی ہونے کے باوجود روز بروز سرمایہ میں اضافہ اور ترقی ہی کا خواہش مند رہتا ہو کیونکہ طلب میں اجمال نہ ہونے کے باعث ارباب دولت وثروت تو دن بدن اپنی دولت میں اضافہ کرتے رہیں گے لیکن انسانی آبادی کی اکثریت افلاس واحتیاج سے دوچار ہوتی رہے گی۔ اسلام ذرائع پیداوار پر اجارہ داری سے سختی سے روکتا ہے اور بتاتا ہے کہ ذرائع پیداوار پر ہر فرد کا حق ہے چنانچہ شیخ الہند حضرت مولانا محمود الحسن قدس سرہ فرماتے ہیں۔

"جملہ اشیاء عالم بدلیل فرمان واجب الاذعان"

﴿خلق لکم مافی الارض جمیعاً﴾

"تمام بنی آدم کی مملوک معلوم ہوتی ہیں یعنی غرض خداوندی تمام اشیاء کی پیدائش سے رفع حوائج جملہ ناس (انسان) ہے اور کوئی شی فی حد ذاتہ کسی کی خاص مملوک نہیں بلکہ ہر شی اصل خلقت میں جملہ ناس (تمام انسانوں) میں مشترک ہے اور من وجہ سب کی مملوک ہے ہاں بوجہ رفع نزاع وحصول انتفاع قبضہ کو علت ملک مقرر کیا گیا اور جب تک کسی شی پر ایک شخص کا قبضہ تامہ مستقلہ باقی رہے اس وقت تک کوئی اور اس میں دست درازی نہیں کرسکتا ہاں خود مالک وقابض کو چاہیے کہ اپنی حاجت سے زائد پر قبضہ نہ رکھے بلکہ اس کو اوروں کے حوالے کردے کیوں کہ باعتبار اصل اوروں کے حقوق اس کے ساتھ

متعلق ہو رہے ہیں یہی وجہ ہے کہ مال کثیر حاجت سے بالکل زائد جمع رکھنا بہتر نہ ہوا، گو زکوٰۃ بھی ادا کر دی جائے اور انبیاء وصلحاء اس سے بغایت مجتنب رہے کیونکہ احادیث سے یہ بات واضح ہوتی ہے بلکہ بعض صحابہ رضی اللہ عنہم اور تابعینؒ وغیرہ نے حاجت سے زائد رکھنے کو حرام ہی فرمایا۔ بہرکیف غیر مناسب اور خلاف اولیٰ ہونے میں تو کسی کو کلام نہیں اس کی وجہ یہی ہے کہ زائد علی الحاجۃ سے اس کی تو کوئی غرض متعلق نہیں اور اوروں کی ملک ''من وجہ'' اس میں موجود۔ تو گویا شخص مذکور ''من وجہ'' مال غیر پر قابض ومتصرف ہے اور اس کا مال بعینہ مال غنیمت کا سا تصور کرنا چاہیے۔ وہاں بھی قبل تقسیم یہی قصہ ہے کہ کل مال غنیمت تمام مجاہدین کا مملوک سمجھا جاتا ہے مگر بوجہ ضرورت وحصول انتفاع ''بقدر حاجت'' ہر کوئی مال مذکور سے منتفع ہو سکتا ہے ہاں حاجت سے زائد جو رکھنا چاہے اس کا حال آپ کو بھی معلوم ہے کہ کیا ہونا چاہیے (یعنی خائن شمار ہوگا)۔''

[ایضاح الادلہ: ص ۲۶۸]

۳۔ تقسیم دولت:

تقسیم دولت میں بھی اسلام ایسے طریقوں کی طرف راہنمائی کرتا ہے جن سے کسی کی حق تلفی نہ ہو لیکن وہ اساسی طور پر اس بات کو تسلیم کرتا ہے کہ ہر شخص جدا جدا صلاحیتیں لے کر پیدا ہوا ہے اس لیے ہر ایک کو اس کی صلاحیت کے مطابق ہی ملے گا۔ البتہ عدم صلاحیت یا کم صلاحیت کی وجہ سے جو لوگ محروم رہ جائیں یا کم حصہ پائیں ان کا حق ان لوگوں کی دولت پر قائم رہتا ہے جو زیادہ صلاحیت کی وجہ سے اپنی ضروریات سے زیادہ دولت کماتے ہیں اس طرح اسلام بغیر کسی کش مکش کے ایسے راستے پیدا کر دیتا ہے جن کے ذریعہ زیادہ دولت مند کی مقدار خود بخود کم دولت والے حصوں تک پہنچ جاتی ہے اور انہیں بھی

سیراب کر دیتی ہے۔ اس حق کے پیچھے بنیادی تصور یہ ہے کہ تمام صلاحیتیں اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی ہیں لہٰذا جس کو صلاحیتیں زیادہ ملی ہوں اور وہ ان کی وجہ سے زیادہ کمانے کے لائق ہو گیا ہو اس کے لیے ضروری ہے کہ وہ اپنی کمائی کا زائد حصہ کم صلاحیت کی وجہ سے کم پانے والے لوگوں تک منتقل کر دے یہ محض بھیک یا خیرات کے طور پر نہیں بلکہ حق کے طور پر ہے۔

تقسیم دولت کے معاملہ میں اسلام کے ہاں ایک اور اصول بھی پیش نظر رہتا ہے وہ یہ کہ قومی آمدنی مختلف عاملین پیدائش کی مشترکہ مساعی اور جدوجہد سے وجود میں آتی ہے اور یہی قومی آمدنی ان عوام کے مابین ان کے معاوضوں کی شکل میں تقسیم ہو جاتی ہے۔ اس اعتبار سے اگرچہ پیدائش دولت کا عمل معاشی ترقی اور فروغ کے لیے بنیادی اہمیت رکھتا ہے لیکن پھر بھی معیشت کے پائیدار استحکام اور معاشرہ کے افراد کی حقیقی خوشحالی کا انحصار اس بات پر ہوتا ہے کہ پیدا شدہ دولت کی تقسیم کچھ اس انداز میں ہو کہ وسائل دولت چند ہاتھوں میں مرکوز ہو کر نہ رہ جائیں اور معاشرہ کا ہر فرد باوقار طریقہ اور معقول معیار سے اپنی زندگی کی ضروریات پوری کر سکے۔ اس مقصد کے حصول کے لیے عاملین پیدائش کے معاوضوں کے تعین میں منصفانہ اصول بنائے جائیں تاکہ ہر عامل خوشی و مسرت کے ساتھ معاشی عمل کو رواں دواں رکھنے میں اپنا کردار نہایت اچھے طریقے سے ادا کر سکے۔ یہاں یہ بات بھی ذہن میں رہنی ضروری ہے کہ جس معیشت میں نجی ملکیت کو تسلیم کیا گیا ہو اس میں اس بات کا امکان موجود رہتا ہے کہ جائز حدود کے اندر رہ کر بھی دولت کا بہاؤ ضرورت سے زیادہ ایک جانب زیادہ نہ ہو جائے اس وجہ سے اسلامی نظام میں دولت کی تقسیم کو بڑی اہمیت دی گئی ہے بلکہ پوری معیشت کی بنیاد ہی اس شعبہ کو مستحکم مضبوط اور عادلانہ و منصفانہ بنانے پر رکھی گئی ہے اس لیے اس مسئلہ کو کلیۃً رسد و طلب کی قوتوں کے سپرد نہیں کر دیا گیا بلکہ معاشرہ اور فرد دونوں کی معاشی فلاح کے حصول کو اصل ہدف قرار دیا گیا ہے اور اس بات کی پوری پوری کوشش کی گئی ہے کہ تقسیم دولت کا نظام عدل اور احسان کی بنیاد پر ہو اور معاشرہ کے ہر فرد کو وسائل زیست اور ضروریات زندگی باوقار اور معیاری طریقہ پر میسر ہوں اور اس کی عزت نفس مجروح نہ ہو۔

موجودہ سرمایہ دارانہ نظام معیشت وتجارت میں سرمایہ دار اپنے سرمایہ اور اس سے حاصل ہونے والے کثیر منافع کی وجہ سے اپنے کاروبار کو وسیع سے وسیع تر کرتے جاتے ہیں اور گروپ آف انڈسٹریز بنا لیتے ہیں جس کی وجہ سے غریب اور متوسط طبقات کی دولت ان کے ہاتھوں سے نکل کر سرمایہ دار طبقہ کے پاس اکٹھی ہوتی جاتی ہے اور اس طرح دولت کا ارتکاز چند ہاتھوں میں ہوتا چلا جاتا ہے۔ انگریزی زبان میں آج کے سرمایہ داروں کو Magnet یعنی مقناطیس کہا جاتا ہے جونسی بھی حکومت ہو ان کو یہ گر آتے ہیں جن سے غریبوں اور متوسط طبقوں کی دولت کھنچ کھنچ کر ان کی تجوریوں میں چلی جاتی ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ متوسط طبقہ کے لوگ اور تنخواہ دار ملازمین اور غریب لوگ غریب سے غریب تر ہوتے چلے جاتے ہیں جس سے نہ صرف ملک کا معاشی نظام ابتر ہوتا ہے بلکہ قوم کا اخلاقی نظام بھی رو بہ زوال ہو جاتا ہے اور ملک میں فحاشی اور بے حیائی کا عفریت ناچنے لگتا ہے کیونکہ چند ہاتھوں میں دولت کا ارتکاز بے حیائی اور اخلاقی دیوالیہ پن کا باعث بنتا ہے۔ اس وجہ سے اسلام اس بات پر زور دیتا ہے کہ انسان جائز ذرائع سے حاصل کردہ دولت کو اپنی ذاتی ضروریات خریدنے پر صرف کرے یا کسی جائز کاروبار میں لگائے جس میں لوگوں کو ملازمت ملے یا پھر غرباء اور مساکین اور ضرورت مند حضرات کو دے دے تاکہ وہ اپنی ضروریات پوری کر سکیں۔ چنانچہ مولانا ابوالکلام آزادؒ نے اس بارے میں کہ اسلامی نظام معاش کی بنیاد کائنات انسانی کی رفع حاجات وضروریات اور انفرادی واجتماعی احتیاجات کی تکمیل پر قائم ہے نہ کہ دولت مندوں اور سرمایہ داروں کے درمیان نفع کی دوڑ کا میدان بنانے کے لیے۔ چنانچہ مولانا مرحوم فرماتے ہیں:

> ''(اس نظام معیشت میں) بلاشبہ زیادہ سے زیادہ کمانے والے افراد موجود ہوں گے کیونکہ سعی وکسب کے بغیر کوئی مومن زندہ ہی نہیں رہ سکتا لیکن جو فرد جتنا زیادہ کمائے گا اتنا ہی زیادہ انفاق پر مجبور بھی ہوگا اور اس لیے افراد کی کمائی جتنی بڑھتی جائے گی اتنی ہی زیادہ جماعت بہ حیثیت جماعت کے خوش حال ہوتی جائے گی قابل اور مستعد افراد

زیادہ سے زیادہ کمائیں گے لیکن صرف اپنے ہی لیے نہیں کمائیں گے بلکہ تمام افراد قوم کے لیے کمائیں گے۔ یہ صورت پیدا نہ ہوسکے گی کہ ایک طبقہ کی کمائی دوسرے طبقوں کے لئے محتاجی و مفلسی کا پیام ہو جائے جیسا کہ اب عام طور پر ہو رہا ہے۔''

[ترجمان القرآن: جلد۲ص۱۳۲]

اسلام دولت کو چند ہاتھوں میں منجمد اور مرتکز نہیں ہونے دینا چاہتا بلکہ اس کی خواہش یہ ہے کہ دولت پورے معاشرے میں گردش کرتی رہے اور اس کی گردش میں کوئی موانع نہیں ہونا چاہیے۔ خون اگر سارے بدن میں گردش کرے تو پورا بدن صحت مند رہتا ہے اور اگر جسم کے کسی حصہ میں دوران خون رک جائے تو وہ حصہ سوکھ جاتا ہے بالکل اسی طرح دولت کی گردش پورے معاشرے اور پوری سوسائٹی میں ہونی چاہیے اور اگر سوسائٹی کے کسی حصہ میں دولت کی گردش رک جائے۔ تو وہ حصہ ایک تو سوسائٹی سے کٹ جائے گا اور دوسرے وہ غریب ہوتا جائے گا۔ اس لیے اسلام یہ چاہتا ہے کہ دولت معاشرہ کے ایک طبقہ میں گردش نہ کرے بلکہ معاشرہ کے تمام طبقات اس سے استفادہ کریں۔

علاوہ ازیں اسلام نے اس بات کا انتظام کیا ہے کہ مختلف معاشرتی، ادارتی، قانونی اور اخلاقی تدابیر سے دولت کی تقسیم زیادہ سے زیادہ منصفانہ ہو اور یہ دولت پورے معاشرہ میں گردش کرتی رہے۔

قرآن حکیم نے ارتکاز دولت کے خاتمہ پر جو زور دیا ہے اس کی شدت کا اندازہ قرآن حکیم کے اس انداز بیان سے ہوتا ہے۔

﴿وَالَّذِيْنَ يَكْنِزُوْنَ الذَّهَبَ وَالْفِضَّةَ وَلَا يُنْفِقُوْنَهَا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ يَّوْمَ يُحْمٰى عَلَيْهَا فِيْ نَارِ جَهَنَّمَ فَتُكْوٰى بِهَا جِبَاهُهُمْ وَجُنُوْبُهُمْ وَظُهُوْرُهُمْ هٰذَا مَا كَنَزْتُمْ لِاَنْفُسِكُمْ فَذُوْقُوْا مَا كُنْتُمْ تَكْنِزُوْنَ﴾

[توبہ: ۳۴-۳۵]

''جولوگ سونے اور چاندی کے ذخیرے جوڑ کر رکھتے ہیں اوران کو اللہ کی راہ میں خرچ نہیں کرتے ان کو مژدہ سنا دو دردناک عذاب کا اس روز جب سونے اور چاندی کے ان ذخیروں کو دوزخ کی آگ میں تپایا جائے گا پھران (سرمایہ داروں) کی پیشانیوں، کروٹوں اور پیٹھوں کو داغا جائے گا (اور بتایا جائے گا) یہ وہ ہے جوتم نے خاص اپنے لیے جوڑا تھا اب چکھواس کو جوتم نے جوڑ کر رکھا تھا۔''

ایک اور مقام پر انفاق فی سبیل اللہ کی ترغیب دیتے ہوئے فرمایا:

﴿وَ لا یَحْسَبَنَّ الَّذِیْنَ یَبْخَلُوْنَ بِمَا اٰتٰهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ هُوَ خَیْراً لَّهُمْ بَلْ هُوَ شَرٌّ لَّهُمْ سَیُطَوَّقُوْنَ مَا بَخِلُوْا بِهٖ یَوْمَ الْقِیَامَةِ﴾ [آل عمران: ۱۸۰]

''وہ لوگ جو بخل کرتے ہیں اس (مال) میں جو انہیں اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل سے دیا ہے وہ ہرگز ہرگز نہ سمجھیں کہ ان کا یہ فعل ان کے لیے بھلائی کی بات ہے نہیں نہیں یہ ان کے لیے شر اور برائی کی بات ہے۔عنقریب قیامت کے روز یہ مال ومتاع جس کے لیے وہ بخل کررہے، ان کے گلوں میں (عذاب کا) طوق بنا کر پہنایا جائے گا۔''

قرآن حکیم میں ایک اور مقام پر ارشاد فرمایا:

﴿وَیْلٌ لِّکُلِّ هُمَزَةٍ لُّمَزَةِ نِ الَّذِیْ جَمَعَ مَالاً وَّ عَدَّدَهٗ یَحْسَبُ اَنَّ مَالَهٗ اَخْلَدَهٗ کَلَّا لَیُنْبَذَنَّ فِی الْحُطَمَةِ﴾

[همزه: ۱ - ۴]

''ہر طعنہ دینے والے غیبت کرنے والے کے لیے تباہی ہے جس نے مال جمع کیا اوراس کو گن گن کر رکھا وہ گمان کرتا ہے کہ وہ (مال) اس کو ہمیشہ زندہ رکھے گا ہرگز نہیں وہ چورا چورا کرنے والی میں ضرور

پھینک دیا جائے گا۔"

عام طور پر "ہمزہ" اور "لمزہ" کے معنی طعنہ دینے والے اور غیبت کرنے والے یا پھر چغل خور اور عیب جو کے کیے جاتے ہیں لیکن ان معنوں کی اگلی آیت "الذی جمع مالا وعددہ" سے کوئی مناسبت نظر نہیں آتی۔ "ہمزہ" کے معنی ہوس زر رکھنے والے شخص کے ہیں کیونکہ "ہماز" اس کتے کو کہتے ہیں جسے کچلہ دیا جائے اور قریب الموت حالت میں وہ بار بار اپنی زبان اپنے ہونٹوں پر پھیر پھیر کر اپنی پیاس بجھانے کا مظاہرہ کر رہا ہو۔ اسی طرح جو چوہے سنکھیا (سم الفار) کھا کر پانی کی تلاش میں دوڑتے پھرتے ہیں انہیں بھی "ہماز" کہتے ہیں۔ "ہماز" ایک خطرناک زہریلے سانپ کو بھی کہتے ہیں جو اپنی زبان بار بار باہر نکال کر اپنے ہونٹوں پر پھیرتا ہے۔ (سراج منیر) اور "لمز" کا معنی دھوکہ دے کر مفاد حاصل کرنا (الکوکب الدری) لہٰذا یہ تباہی جس کا ذکر "ویل لکل همزة لمزه" میں ہے ان لوگوں کے لیے ہے جو ہوس زر کے مرض میں مبتلا ہیں اور دھوکہ دہی سے مال حاصل کرتے ہیں۔

مذکورہ بالا تینوں آیات میں جس شدت کے ساتھ "حب زر" کی مذمت کی گئی ہے وہ شدت شاید قتل وزنا کے معاملات میں بھی نظر نہیں آتی کیونکہ ارتکاز زر، بخل اور ہوس زر سب اسی "حب زر" کے شجر خبیثہ کی شاخیں ہیں۔ یہاں یہ بات ذہن میں رہے کہ اسلام "کسب زر" کا مخالف نہیں "حب زر" کا مخالف ہے اور حب زر ہی دولت کی گردش کو روکنے کا سب سے بڑا سبب ہے اسلام دولت کو سرمایہ داروں میں روکنا نہیں چاہتا بلکہ اس کا فرمان ہے:

﴿كَیْ لَا یَكُوْنَ دُوْلَةً بَیْنَ الْاَغْنِیَاءِ مِنْكُمْ﴾ [حشر: ۷]

"(یہ حکم اس لیے دیا گیا) کہ مال تمہارے مال داروں ہی کے درمیان گردش نہ کرتا رہے۔"

اس آیت کی تفسیر میں شیخ الاسلام علامہ شبیر احمد عثمانی نوراللہ مرقدہ فرماتے ہیں:

"یہ مصارف اس لیے بتلائے کہ ہمیشہ یتیموں، محتاجوں، بے کسوں اور عام مسلمانوں کی خبر گیری ہوتی رہے اور عام اسلامی ضروریات

سرانجام پاسکیں۔ یہ اموال محض دولت مندوں کے الٹ پھیر میں پڑ کران کی مخصوص جاگیر بن کر نہ رہ جائیں جس سے سرمایہ دار مزے لوٹیں اور غریب فاقوں مریں۔'' [فوائد عثمانی: ص ۷۲۵]

اسلام طبقاتی امتیاز کا قائل نہیں:

اسلامی نظام معیشت میں ذرائع پیداوار کی تبدیلی سے انسان کی فطرت اور اس کے سوچنے کے طریقے نہیں بدل جاتے۔ اسی لیے اسلامی معاشیات کا مدار طبقاتی تصور پر نہیں رکھا گیا۔ اسلام انسانی سوسائٹی کو ''اعلیٰ بورژروا'' ''ادنی بورژروا'' ''اعلی پرولتاریہ'' اور ''ادنیٰ پرولتاریہ'' ''سرمایہ دار'' اور ''غیر سرمایہ دار'' وغیرہ کے طبقات میں تقسیم نہیں کرتا اس میں لوگوں کی دولت تقسیم کرنے، طبقاتی امتیازات کو ابھارنے، ان کو باہمی تصادم میں مبتلا کرنے، انہیں لڑانے اور حق دلانے کے بجائے آپس میں الفت ومحبت کے جذبات کو فروغ دینے اور خود بخود ''حق بحقدار رسید'' پر عمل پیرا ہونے کے اصول پر زیادہ زور دیا گیا ہے۔ چھوٹی بڑی حیثیتوں کو اسلام ختم نہیں کرتا اس لیے کہ اس کے بغیر ایک دوسرے سے کام لینے کا کوئی راستہ باقی نہیں رہتا۔ جو نظام اس اختلاف مراتب اور فرق مدارج کا نظری طور پر انکار کرتا ہے اس کے اھل بھی عملاً اس کو قائم کرتے ہیں اور اس سے بدتر شکلیں قائم کرتے ہیں جن میں ایک جبری محنت کا بھیانک نظریہ بھی ہے۔

انسان خدا کا نائب اور خلیفہ:

اسلامی نظام میں انسان محض ایک بہترین پیداواری طاقت ہی نہیں ہے بلکہ وہ زمین میں خدا کا نائب اور خلیفہ بھی ہے۔ وہ زمین میں پیداواری قوتوں کو ایک خاص مقصد کی خاطر استعمال کرنے والا ہے۔ چنانچہ اسلام کے اقتصادی نظام پر اس تصور کا اثر یہ پڑتا ہے کہ آدمی اپنے آپ کو بیل، بھینس، گھوڑے یا آئل انجن، موٹر کار یا سائیکل کی طرح محض کرایہ وصول کرنے کی چیز نہیں سمجھتا بلکہ وہ اپنی اعلیٰ صلاحیتوں کی بناء پر اپنے آپ کو ان ادنیٰ چیزوں کے استعمال کا ایک بہتر دنیوی اور اخروی اجر کے لیے حق دار خیال کرتا ہے اور یہی

سمجھتے ہوئے ہر کام کرتا ہے۔

اسلام توازن کا علم بردار:

اسلام کے اقتصادی اصولوں پر ایک سرسری نظر ڈالنے کے بعد یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اسلام ایک بیچ کی راہ پر گامزن ہے وہ نہ تو فرد کو سرمایہ دارانہ نظام کی طرح ہر قسم کی کھلی چھٹی دیتا ہے کہ جس طرح چاہے کمائے اور جس طرح چاہے صرف اور تقسیم کرے۔ اور نہ وہ اشتراکی نظام معیشت کی طرح فرد کو مشین کا ایک پرزہ بنا کر رکھ دیتا ہے۔ وہ نہ تو یہ کہتا ہے کہ تمام جائیداد کا مالک انسان ہے اور ہر فرد جس طرح چاہے اس میں تصرف کر سکتا ہے۔ اور نہ وہ ملک کی تمام جائیداد کا مالک اسٹیٹ کو قرار دے کر انفرادی سرمایہ داری کے بجائے ریاستی چور بازاری اور ریاستی ارتکاز واحتکار کو جنم دیتا ہے۔ اسلام دراصل تمام نظام ہائے زندگی کے محاسن کا ایک مرکب ہے جس سے ہٹ کر آگے اور پیچھے سوائے تباہی اور بربادی کے اور کچھ نہیں۔

آج کل ہر لیڈر اور راہ نما بلکہ سربراہ مسلمانوں کو دھوکہ دینے کے لیے یہ کہتے ہیں کہ ''زندگی کا معیار بلند کرو'' ہر وزیر، ہر لیڈر اور ہر سربراہ ہر جلسہ اور مجلس میں دن رات اسی فقرہ کو دہراتا ہے کہ ہمارے تمام ترقیاتی منصوبوں کا مقصد اور ہماری صبح وشام کی تگ ودو کا مقصد صرف اور صرف یہی ہے کہ عوام کی زندگی کا معیار اونچا اور بلند ہو۔ اس فقرہ کو سن کر عوام الناس کے دل شاداں وفرحاں ہو جاتے ہیں۔ ان کا وقتی طور پر سیروں خون بڑھ جاتا ہے ان کی سوکھی رگوں میں تری آجاتی ہے اور امنگوں اور تمناؤں کی مرجھائی ہوئی کلیوں میں تازگی اور شادابی آجاتی ہے۔ نفسیاتی طور پر اس فقرہ کا عوام پر اثر ضرور پڑتا ہے اور وقتی طور پر انہیں خوشی ومسرت حاصل ہوتی ہے لیکن یہ فقرہ جہاں بھولے بھالے اور سادہ لوح عوام کو خوش کرنے کے لیے بولا جاتا ہے وہاں وزراء عالی مقام اس فقرہ کو بول کر اپنا معیار زندگی لوگوں کی نگاہوں سے اوجھل کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور عوام کے اذہان میں یہ شے بٹھانے کی کوشش کرتے ہیں کہ ہم بھی تمہاری طرح غریب ہیں لیکن ہم پہلے تمہارا معیار

زندگی بلند کریں گے بعد میں اپنا، لیکن معاملہ الٹ ہوتا ہے۔ عوام کا معیار زندگی تو گر جاتا ہے کیونکہ ملک کی مہنگائی ان کے منہ سے وہ نوالہ بھی چھین لیتی ہے جو وہ اس دل آویز فقرہ سننے سے قبل کھا رہے ہوتے ہیں اور وزیر صاحب تو پہلے ہی بلند معیار کے تھے اپنے علاقہ کے جاگیردار اور وڈیرے تھے۔ ملک کے انڈسٹریلسٹ اور سرمایہ دار تھے ان کا معیار زندگی اپنے اس دور وزارت میں اور اونچا ہوگیا۔ دو دفعہ اسمبلی کے اراکین کی تنخواہ بڑھی جس کا فائدہ اراکین سے زیادہ وزراء کو ہوا۔ سفری بھتے بڑھ گئے، الاؤنس بڑھے اور اس کے علاوہ ادھر ادھر سے جو ہاتھ مار کر دولت اکٹھی کی اس کو سوائے اس کے اور کوئی دوسرا نہیں جانتا۔

منسٹر صاحب نے جو دھاندلی کی اور جس طرح سے قومی دولت کو اپنے دور وزارت میں دونوں ہاتھوں سے لوٹا اس سے عوام کا معیار زندگی تو اونچا نہ ہوا البتہ عوام میں لوگوں کو لوٹنے کی عادت پڑ گئی کیونکہ عربی کا محاورہ ہے ''الناس علی دین ملوکھم'' یعنی لوگ اپنے بادشاہوں کے دین پر ہوتے ہیں۔ جو عادات واخلاق بادشاہوں میں ہوتے ہیں وہی ان کی پرجا اور رعایا میں منتقل ہوتے ہیں۔ عوام نے جب دیکھا کہ جن لوگوں کو ہم اپنے ووٹوں سے رکن بنا کر اسمبلی میں بھیجتے ہیں پھر وہ وہاں اپنی سیاسی قلابازیوں سے وزارت کے اعلیٰ عہدہ پر پہنچ جاتے ہیں اور دونوں ہاتھوں سے قومی دولت کو لوٹتے ہیں۔ اسمبلی میں جانے سے قبل وہ یوسف بے کارواں ہوکر بازاروں میں پھرتے تھے۔ رکن اسمبلی ہونے سے قبل تو کوئی انہیں دو سو روپے معاوضہ پر وکیل کرنے کے لیے تیار نہ تھا لیکن اب حالت یہ ہے کہ مرسڈیز کار کے علاوہ وہ کسی اور کار پر بیٹھتے نہیں عوام بھی آخر اسی گوشت پوست کے بنے ہوئے ہیں جس گوشت پوست کے وزیر صاحب بنے ہوئے ہیں تو عوام کے دل بھی للچاتے ہیں لہٰذا وہ بھی وزیر صاحب کی سرپرستی میں لوگوں کو لوٹتے ہیں۔ بڑے بڑے جاگیرداروں اور وڈیروں نے لوٹنے کے لیے ڈاکوؤں کی ایک کھیپ رکھی جو ان کی سرپرستی میں لوگوں کو یرغمال بنا کر تاوان کی شکل میں لوٹتے ہیں، اور وزیر صاحب نے بس ایک ہی فقرہ رٹا ہوا ہے کہ ہم نے اور ہماری حکومت نے عوام کے معیار زندگی کو بلند کرنے کا تہیا کر رکھا ہے۔ سرزمین پاکستان میں یہ فقرہ ہم گزشتہ ساٹھ سال سے سنتے چلے آ رہے

ہیں۔ فقرہ بہت دلآویز ہے۔ وقتی طور پر عوام خوش ہو جاتے ہیں۔ تالیاں بھی پیٹتے ہیں۔ نعرے بھی لگاتے ہیں جس سے وزیر صاحب کا خون خوشی اور مسرت سے جوش بھی مارتا ہے، لیکن اس دلآویز فقرہ کے نتیجہ میں عوام کا معیار زندگی تو گرا ہے البتہ وزیر صاحب کا معیار زندگی بہت اونچا ہو گیا ہے

وہی حالات ہیں فقیروں کے
دن پھرے ہیں فقط وزیروں کے
ہر بلاول ہے ملک کا مقروض
پاؤں ننگے ہیں بے نظیروں کے

یہ نظام اس وقت پاکستان سمیت تمام دنیا میں رائج ہے۔ اس کی کوکھ سے جس تہذیب نے جنم لیا ہے وہ تہذیب ایک مسرفانہ اور مترفانہ تہذیب ہے۔ یہ جب عیاشی کی طرف رخ کرتی ہے تو شراب نوشی اور رقص و سرود اس کا لازمی جزو بن جاتے ہیں۔ اس سوسائٹی میں کسی صاحب حیثیت شخص کا اس وقت تک کوئی وزن نہیں ہوتا جب تک وہ ایک دو داشتہ (Keeps) نہ رکھتا ہو۔ آج کل کی داشتہ اکثر و بیشتر فلم ایکٹرس ہوتی ہیں جن کا ناز و نخرہ صرف وزیر ہی اٹھا سکتے ہیں یا پھر کوئی بہت بڑا سرمایہ دار۔ بڑی بڑی رقمیں ان کی نذر کی جاتی ہیں۔

آج جب اونچے معیار کی زندگی کا لفظ کانوں میں پڑتا ہے تو کوٹھیوں اور بنگلوں کی زندگی نظروں میں گھوم جاتی ہے۔ آراستہ کمرے، قالینوں کے فرش پر شاندار مسہری، صوفہ سیٹ، تخمصی گدوں کی کرسیاں، دیواروں پر بہترین آرٹ کی مورتیاں، تصویر نما پیپر ویٹ، دیواروں پر ریشمی پردے، ملاقات کا کمرہ، اس سے زیادہ شان دار اور پر تکلف کھانے کا کمرہ جس میں ایک لمبی میز کے چاروں طرف کرسیاں لگی ہوں، عمدہ پلیٹیں، خوب صورت کپ، چاندی اور سونے کی پالش کے چمچے، کانٹے، ڈونگے اور بہترین ڈنر سیٹ وغیرہ۔ اس مسرفانہ اور مترفانہ تہذیب کے برگ و بار کو دیکھ کر اٹھارہویں صدی کے فلسفی اسلام حکیم الامت حضرت شاہ ولی اللہ قدس سرہ بہت برہم ہیں کہ فیشن پرست، ٹھاٹھ باٹھ

کے متوالے اور شیدائی، خوش حال لوگ اس رواجی کنبہ پروری پر بے شمار دولت خرچ کرتے ہیں، اور یہ نہیں ہوتا کہ زکوٰۃ جو اللہ نے فرض کی ہے، اس کو ادا کریں۔ اس طرز معاشرت اور اس تہذیب و فیشن کی بنیادیں اس زمانہ میں بھی اتنی گہری ہیں کہ خاندان کے خاندان ختم ہو گئے مگر یہ تہذیب اور فیشن ختم نہ ہوا، اور آج تک اس تہذیب کا تسلسل چلا آ رہا ہے۔

یہاں یہ بات ذہن میں رہے کہ اسلام کو ہماری بدحالی سے انسیت اور فاقہ مستی سے محبت نہیں۔ اسلام کے نزدیک خوش حالی اور دولت مندی کے حصول کے لیے کوشش کرنا قابل اعتراض نہیں ہے، لیکن اس کے لیے ذرائع جائز ہونے چاہیں۔ ناجائز ذرائع اور حرام طریقوں سے کمائی ہوئی دولت کو اسلام ''مال غیر متقوم'' تسلیم کرتا ہے۔ آپ اپنی قابلیت اور صلاحیت کو کام میں لائیں اور خوب محنت کریں جس سے قوم اور ملت کو فائدہ پہنچے اور قوم اور ملک کی دولت میں ترقی اور اضافہ ہو۔ اس کے صلہ میں جتنی بھی دولت آپ کو حاصل ہو وہ باعث مسرت ہے، لیکن انسانی اور انسانی سماج کی کمزوری یہ ہے کہ ایک وہ طبقہ ہوتا ہے جو خواب دیکھتا ہے محلوں، بڑی بڑی بلڈنگوں اور فیکٹریوں کے اور محنت اتنی بھی نہیں کرتا کہ پھونس کی ایک جھونپڑی تیار کر سکے۔ ہم کام سے جان چراتے ہیں اور خواہش یہ رکھتے ہیں کہ دولت انکے گھر کی لونڈی ہو۔ ہم میں سے اکثر و بیشتر کی آمدنی کے جائز ذرائع جب ان کی خواہشات کو پورا نہیں کر سکتے تو پھر وہ ناجائز ذرائع سے بھی دریغ نہیں کرتے۔ وہ لوگوں کی جیبوں پر ہاتھ مارتے ہیں، شریف اور محنت کش شہریوں کے گھروں میں نقب لگا کر یا سر راہ اسلحہ کی نوک پر ان کی گاڑھے پسینے کی کمائی اڑا لیتے ہیں۔ اگر دو چار ہم جنس ساتھی مل جائیں تو سر راہ ڈاکے ڈالتے ہیں۔ اگرچہ قانون کی دھمکی ان کے کانوں میں پڑتی رہتی ہے لیکن برصغیر پاک و ہند میں تو قانون کی دھمکی کوئی اہمیت نہیں رکھتی۔ یہاں تو قانون موم کی ناک ہے۔ دوسرے ان کا تصور یہ ہوتا ہے

ؔ ساقیا امروز می نوشیم فردا کس بدید

وزراء کے یہ اونچے معیار زندگی کی ترغیب ہی کی یہ برکت ہے کہ رشوت لینے والوں اور اسمگلنگ کرنے والوں کے دلوں سے اپنے جرائم کی نفرت نکل گئی ہے اور لوگوں

کے دلوں سے بھی ان کی نفرت کافور ہوگئی ہے بلکہ بسا اوقات ہمدردی ہوتی ہے کیوں کہ زندگی کا معیار جو ہم نے اختیار کرلیا ہے بلکہ بلند معیار زندگی کی ترغیب دے ہمیں اختیار کرایا گیا ہے، اس کو نبھانے کے لیے فاضل آمدنی کو ضروری قرار دیا جاتا ہے اور لینے والے کو معذور سمجھا جاتا ہے۔ جب ہم اونچے معیار کی زندگی کا راگ الاپتے ہیں تو گویا ہم اشارہ کرتے ہیں ۔

نرخ بالا کن کہ ارزانی ہنوز

دیگر شہروں میں بیت العلوم کے اسٹاکسٹ

ملتان	**کراچی**	**راولپنڈی**
بخاری اکیڈمی مہربان کالونی ملتان	ادارۃ الانور بنوری ٹاؤن کراچی	الخلیل پبلشنگ ہاؤس راولپنڈی
کتب خانہ مجیدیہ بیرون بوہڑ گیٹ ملتان	بیت القلم گلشن اقبال کراچی	**اسلام آباد**
بیکن بکس گلگشت کالونی ملتان	کتب خانہ مظہری گلشن اقبال کراچی	مسٹر بکس سپر مارکیٹ اسلام آباد
کتاب نگر حسن آرکیڈ ملتان	دار القرآن اردو بازار کراچی	المسعود بکس F-8 مرکز اسلام آباد
فاروقی کتب خانہ بیرون بوہڑ گیٹ ملتان	مرکز القرآن اردو بازار کراچی	سعید بک بینک F-7 مرکز اسلام آباد
اسلامی کتب خانہ بیرون بوہڑ گیٹ ملتان	عباسی کتب خانہ اردو بازار کراچی	پیپر بک سنٹر آبپارہ مارکیٹ اسلام آباد
دار الحدیث بیرون بوہڑ گیٹ ملتان	ادارۃ الانوار بنوری ٹاؤن کراچی	**پشاور**
ڈیرہ غازی خان	علمی کتاب گھر اردو بازار کراچی	یونیورسٹی بک ڈپو خیبر بازار پشاور
مکتبہ زکریا بلاک نمبر ۱۰ ڈیرہ غازی خان	**کوئٹہ**	مکتبہ سرحد خیبر بازار پشاور
بہاول پور	مکتبہ رشیدیہ سرکی روڈ کوئٹہ	لندن بک کمپنی صدر بازار پشاور
کتابستان شاہی بازار بہاولپور	**سرگودھا**	**سیالکوٹ**
بیت الکتب سرائیکی چوک بہاولپور	اسلامی کتب خانہ پھولوں والی گلی سرگودھا	بنگش بک ڈپو اردو بازار سیالکوٹ
سکھر	**گوجرانوالہ**	**اکوڑہ خٹک**
کتاب مرکز فریئر روڈ سکھر	والی کتاب گھر اردو بازار گوجرانوالہ	مکتبہ علمیہ اکوڑہ خٹک
حیدرآباد	مکتبہ نعمانیہ اردو بازار گوجرانوالہ	مکتبہ رحیمیہ اکوڑہ خٹک
بیت القرآن چھوٹی گٹی حیدرآباد	**راولپنڈی**	**فیصل آباد**
حاجی امداد اللہ اکیڈمی جیل روڈ حیدرآباد	کتب خانہ رشیدیہ راجہ بازار راولپنڈی	مکتبۃ العارفی ستیانہ روڈ فیصل آباد
امداد الغرباء کورٹ روڈ حیدرآباد	فیڈرل لاء ہاؤس چاندنی چوک راولپنڈی	ملک سنز کارخانہ بازار فیصل آباد
بھنائی بک ڈپو کورٹ روڈ حیدرآباد	اسلامی کتاب گھر خیابان سرسید راولپنڈی	مکتبہ اہلحدیث امین پور بازار فیصل آباد
کراچی	بک سنٹر ۳۲ حیدر روڈ راولپنڈی	اقراء بک ڈپو امین پور بازار فیصل آباد
ویلکم بک پورٹ اردو بازار کراچی	علی بک شاپ اقبال روڈ راولپنڈی	مکتبہ قاسمیہ امین پور بازار فیصل آباد